

آپ سے کیا پیردہ

ابن انشاء



صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
9	نالے کو رسا باندھنے والا	1
13	چند سبق آموز کہانیاں	2
13	سیٹھ حاتم طائی سے سیٹھ لٹھا بھائی	3
26	کیسے خیر کی واپسی	4
30	خطبہ صدارت حضرت ابن انشاء	5
34	سوئی میں اونٹ کیسے ڈالا جائے	6
39	رامائن اور مہابھارت	7
42	اتفاق میں برکت ہے	8
45	ڈگریاں بڑی نعمت ہیں	9
49	التمنا مضمن بہ اجازت برائے فیملی پلاننگ	10
51	ذکر کا بلی کا	11
55	داخلے جاری ہیں	12
59	ایک دن ڈاکٹر ہال جہریل کے ہاں	13
54	نسخہ بھونکتے کتے سے بچنے کا	14
67	ہماری باتیں ہی باتیں ہیں	15
71	حکیم جی لندن میں پہنچ گئے	16
76	ہمارا ملک	17
78	ایک خبر دیہ پاپوری	18

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
82	کچھ اعداد و شمار کے بارے میں	19
86	ایک کالم بغیر عنوان	20
69	بحث کی باتیں	21
94	ہونہار طالب علموں کے درمیان	22
99	ترجمہ کرا لیجئے تقریر لکھوا لیجئے سودا منگوا لیجئے	23
104	آنا ہمارا	24
108	جٹ چوری پٹ فیملہ	25
113	کچھ اخباروں کے بارے میں	26
119	ویسے تو ہم خیریت سے ہیں	27
123	ایک دو کہانیاں مکرر ارشاد ہیں	26
126	لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو	29
131	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں	30
135	اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں	31
139	اب ہماری قربانی شرعاً جائز نہیں رہی	32
143	منو بھائی	33
146	ہفتہ ٹریفک کیوں شروع کیا	34
152	ڈاک خانے والے پانی چھوڑ دو	35
155	ہمارا تمہارا خدا بادشاہ	36
157	چند غیر ضروری اعلانات بس مسافروں کے مرثوہ	37
161	نظر ثانی کے بعد	38
166	علاج سے پرہیز بہتر ہے	39

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
172	پرہیز علاج سے بہتر ہے	40
176	بیان پالتوں جانوروں کا	41
179	ایک سپانامہ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے	42
163	آگئے قوم کے بے لوث خدمت کرنے والے	43
163	حکیم بقل بطورا	44
193	ذکر دروازوں کا کرسیوں کا اور بورے کا	46
197	قصہ آب رواں کا اور مچھلیوں کا	46
201	ابھی کل کی بات ہے	47
204	کیا پانی نجی برادر	43
206	واپسی مجھرخان کی	49
213	ہم دعوت نامہ لے کر گئے تھے	60
216	میر صاحب سے آغا صاحب تک	61
224	قصہ ایک بہت بولنے والے کچھوے کا	52
239	کچھ انڈوں کی طرف داری میں	53
234	آج ایک سبق جغرافیہ کا	54
239	اس کوچے میں	65
242	ایک سوالنامہ کا جواب نامہ	56
246	کام نکما کر دیا	57
250	ایک کالم برستے پانی میں	56

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
254	کراچی میں دو عیدیں	59
257	ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں	60
262	پریس کلب میں تقریب رونمائی	61
266	ترقی دھویاں کو آپرٹیو سوسائٹی	62
271	اگر میاں مجنوں یہ جنتی دیکھ لیتے	63
277	ان دلوں ہم ٹیکس دینے میں مصروف ہیں	64
263	طریقہ محفل میں بات کرنے کا	65
292	تبصرے کے لیے سالن کی دو پتیلیاں آنی ضروری ہیں	66
297	ہمارا ریڈیو بج رہا ہے اور بے آواز ہے	67
302	آج کیا کیا جائے..... لکھنے کا مسئلہ کیسے حل ہو	66
307	لاؤڈ اسپیکر کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے	69
310	اہرام بنانے کے لیے قطب مینار سینٹ استعمال کیجیے	70
313	ہمیں نظر کرم کی بھیک ملے	71
319	مصورى میں گھوڑا مار کر پینسل کی اہمیت	72
324	دوسپانے جناب گاؤ کی آمد اور حضرت خرقی رفت کی تقریب	73
327	بکٹ کچے اور کچے کانوں کی	74
332	شعر لکھو ایچی یا پنکچر لکھو ایچی	75
336	اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تو	76
341	جنگ نہیں رہیہرسل تھی	77
343	پہل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب	73

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
79	ہوائی سفر بھی کیا سفر ہے؟	347
80	ہم منگولیا نہیں گئے تھے	350
81	سچ کے پاؤں نہیں ہوتے	300
82	اسے اشتہار نہ سمجھا جائے	385
83	طلاق کے مقدمے میں میاں بیوی کے درمیان راضی نامہ ہو گیا	388
84	شاعری کی کہیں بھی قدر نہیں	370
85	جانا ننھے شہزادے کا بلار عایا کے بادشاہ کی مملکت میں	374
85	ہے ہے مراباغ لے گیا کون؟	382
57	رپورٹ پٹواری مفصل ہے!	357
85	بچ موڑتوں..... ہفتہ ٹرینک شروع ہو گیا	394
89	شہزادی امینہ نے اپنی شادی کے لیے ٹینڈر طلب کر لیا	399
90	ننگ رہا ہے اور بے آواز ہے!	405
91	ڈکرا دنوں اور بلیوں کا	410
92	پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا!	414
93	حساب کتاب روپوں کا لٹا اور فائدے غریبی کے	419
94	ہماری تقریر یوم غنیمت گھڑیا لوی پر!	423
95	پاکستان ناول مینوفیکچرنگ کمپنی	429
98	ایک چھوٹی سی سیر در دیش کی!	433
97	جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا	438
98	دیش مکھ جی کیسے دیش کو مکھ دکھائیں گے	442

نالے کو رسا باندھنے والے

بے شک ہم نے پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ وزیر خزانہ عقیلی صاحب نے عظیم تر کراچی کو پانی کی بہم رسانی کے منصوبے کے لیے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن ہمیں یہ یقین نہ تھا کہ اس منصوبے پر اتنی جلدی عمل ہوگا اور ہماری انقرہ سے واپسی کا انتظار بھی نہ کیا جائے گا۔ عقیلی صاحب کا بیان پڑھنے کے بعد ہم کئی دن کپڑے اتارے نوٹنی کھولے نل کے نیچے بیٹھے رہے۔ آخر مایوس ہو کر چل دیے کہ اچھا بحیرہ روم میں نہالیں گے۔ آبنائے باغورس میں ڈبکی لگالیں گے۔ ہمارے جانے کی دیر تھی کہ پانی کھل گیا اور ایسا آسان کا چھپر پھاڑ کر گھلا کہ لوگوں کے گھروں میں ایک غسل خانے تو ضرور سوکھے رہے۔ باقی ہر جگہ جل تھل ہو گیا۔ ہم یہ خبر پاتے ہی بھاگے بھاگے کراچی واپس آئے اور جلدی ے نل کھولے بالٹی آگے کی۔ اس میں ے ایک سروا ہ ننگی، ایک مصرعہ ٹپکا۔

جو کسی کے کام نہ آ سکے

میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں

اصل میں قصور ہمارا ہے۔ ہم پانی کے لیے کالم پر کالم تو لکھتے رہے لیکن یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ہم پانی نلوں کے راستے چاہتے ہیں۔ براہِ راست نہیں کیونکہ ہم کوئی

گوالے تھوڑا ہی ہیں۔ نہ پانی کے جانور ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ۔ ڈی۔ اے والوں نے عظیم تر کراچی کے لیے پانی کی بہم رسانی کا منصوبہ عقلی صاحب کو پیش کر دیا ہوئے یہ بات صاف کر دی ہوگی، کیونکہ عقلی صاحب کراچی میں نہیں رہتے۔ وہ ان رموز کو کیا جانیں کہ ہمیں پانی کی کتنی ضرورت ہے اور کس طور ضرورت ہے۔ خیر بندہ بشر ہے۔ غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال آئندہ کے لیے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ ہمیں پانی فقط اتنا چاہیے کہ خود پی سکیں۔ اتنا نہیں کہ ہمیں پی جائے۔

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ غلط فہمی خود ہمیں ہوتی ہے۔ پانی کی اس ریل پیل سے جو ہمارے بعد کراچی میں ہوئی۔ عقلی صاحب کا کچھ تعلق نہیں۔ عظیم تر کراچی کے لیے پانی کا عظیم تر منصوبہ تو ابھی تک ان کی ٹرے میں سوکھا پڑا ہے۔ یہ کارگزاری کہیے یا کارستانی، کارکنانِ قضا و قدر کی ہے۔ ان بزرگوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے حکمہ موسمیات پر بات ڈالی کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں ان کی پیشین گوئی سن کر کرتے ہیں۔ اس سے سر مو انحراف کی ہمیں مجال نہیں۔ کے۔ ڈی۔ اے والے اپنا قصور صرف..... اس حد تک مانے کہ ہم نے ابر کرم کا پرنا لہ فقط ابنِ انشا کے گھر پر کھولنے کی استدعا کی تھی کیونکہ یہی بڑھ بڑھ کر کالم لکھتا تھا اور عزم کے دنوں میں جہی پانی کے لیے ہمیں تنگ کرتا تھا۔ باقی مخلوق محض اس کے ہمسائے میں رہنے کی وجہ سے ماری گئی۔ بُری صحبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بھینس کا لونہ کے گوالوں نے اقرار کیا کہ بے شک ہم چاہتے تھے کہ دودھ کی کمی پوری ہونے کی کوئی سبیل نکلے۔ لیکن یہ منشا ہماری بھی نہ تھی۔ کہ اس سبیل کی ٹونٹی پوری کھول کر اس زنانے کا تریڑا دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے ہماری دعا کا پتہ غلط ہو گیا اور یہ عالم بالا پر اس شاعر کو موصول ہو گئی جس نے لکھا تھا۔

رونے پہ باندھ لے جو مری چشم تر کر

کسی زمین؟ فلک پہ ہو پانی کمر کر



چند ماہ ادھر کی بات ہے کہ لاہور میں مینہ برسنا اور چھا جوں برسنا۔ لوگوں کے ٹوکھے دھانوں پر پانی پڑا تو ہر کسی نے یہ جتانے کی کوشش کی کہ ویسے تو من آئم کہ من دانم۔ لیکن یہ بارش بندے نے برسوائی ہے۔ مجھ ہی گنہگار نے اللہ میاں کو اشارہ کیا تھا کہ ہاں اب اجازت ہے۔ ہمارے دوست حیاں انتظار حسین نے طبعی انکسار کی بنا پر اپنا نام تو نہ لیا، ہاں ساری داد اپنے اور ہمارے دوست ناصر کاظمی کی جھوٹی میں ڈال دی کہ انہوں نے ایک غزل لکھی تھی وہ ہم نے ٹیلی ویژن پر ان سے گوائی اور صاحبو۔۔۔ بادلوں کو اُنڈ گھمڈ کراتے ہی بنی۔ اسی تقریب سے ہم نے بخاری صاحب سے عرض کیا تھا کہ کراچی میں ٹیلی ویژن کے خداوند آپ ہیں۔ یہاں بھی تان سینوں اور نیچو بادروں کی کمی نہیں۔ آپ بھی کسی کو پکڑیے ٹیلی ویژن کا اسٹوڈیو تو ابھی نہیں بنا۔ لیکن کھبے تو گڑ گئے ہیں۔ ایک کھبے پر اسے چڑھا کر حکم دیجیے کہ مہارگا۔ تجھے معقول پیسے دیں گے۔ لیکن پہلے چھتری تان لے ورنہ بھیگ جائے گا۔ کیا عجب بخاری صاحب نے ہماری یہ فرمائش ریڈیو کے فرمائش پر دگرام کو بھیج دی ہو جواب تک ان کی بات مانتے ہیں کیونکہ انقرہ میں جمعرات ۲۷ جولائی کو ہم نے بارش کی تباہی کا سن کر فکر مندی سے ریڈیو کھولا تو یہاں گیارہ بجے دن کی خبریں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا قیامت برپا ہے جوئی خبریں ختم ہوئیں۔ پہلار یکار ڈیہی سنائی دیا۔

جھوم جھوم کر برسو بادل جھوم جھوم کر برسو۔



خیر ہمیں شاعری اور نغے کی تاثیر سے انکار نہیں اور یہ بھی تسلیم کہ ہمارے ہاں ایسے باکمال شاعر اور نغمہ سرا گزرے ہیں کہ گلیوں کو چوں میں صدا لگاتے پھرتے تھے۔ بارش برسوا لو بارش۔ آپ کو اپنے لان میں پانی دینا ہے، تو آداز دی کہ میاں ذرا آدھ انچ بارش چاہیے۔ کتنے پیسے لو گے؟ معاملہ پٹا تو اس نے فوراً برساتی آدھ کان پر ہاتھ رکھ کر ایک تان لگائی۔ آدھ انچ بارش برس چکی تو خود بہ خود دھوپ نکل آئی۔ پرانے زمانے

میں ایک بات یہ اچھی تھی کہ بارش زیادہ ہو جائے، جیسی کراچی میں ہونے لگی ہے تو نالے کو رسا باندھنے والے بھی مل جاتے تھے۔ اب کسی ناصر کاظمی یا بڑے بارش علی خان سے کہیے تو کہ میاں ذرا اورنگی نالے کو رسا باندھ اور روک۔ جھونپڑیاں بھی جارہی ہیں۔ آج کل یہ فن شریف ناپید ہو گیا ہے۔ جس طرح آتش بازی پر پابندی لگنے کے بعد سے دپک راگ گانے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔



چند سبق آموز کہانیاں

ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانا۔ چڑا لایا چاول کا دانا۔ اس سے کھجری پکائی۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی۔ آپس میں اتفاق ہو تو ایک ایک دانے کی کھجری بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑا بیٹھا دنگھ رہا تھا کہ اس کے دل میں دوسرے آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے۔ دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔ پس دوسرے روز کھجری پکی تو چڑے نے کہا اس میں سے چھپن حصے مجھے دے۔ چوالیس حصے تولے۔ انے بھاگوان۔ پسند کر یا نا پسند کر۔ اتفاق سے آنکھیں مت بند کر۔ چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نکات بھی نکالے اور اس بی بی کے آگے ڈالے۔ بی بی حیران ہوئی بلکہ رد و کر ہا کان ہوئی کہ اس کے ساتھ تو میرا جنم کا ساتھ تھا لیکن کیا کر سکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانا لائی اور چڑا چاول کا دانا لایا۔ دوسرے دن الگ الگ ہنڈیا چڑھائی۔ کھجری پکائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دوسری دانے ہیں۔ چڑے نے چاول کا دانا کھایا۔ چڑیا نے دال کا دانا اٹھایا۔ چڑے کو خالی چاول سے پیش ہو گئی۔ چڑیا کو خالی دال سے قیض ہو گئی۔ دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بلا تھا۔ اس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا۔

ع دیکھا تو تھے دو مشت پر

یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔ آج کل تو چاول ایکسپورٹ ہو جاتا ہے۔ اور وال مہنگی ہے۔ اتنی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی اسماعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں آج کل فقط شخی بگھارتی ہیں۔

☆☆☆

ایک تھا گورو، بڑا نیک دھرماتما۔ دواس کے چیلے تھے۔ وفادار، جاں نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کاٹھن نام پور بول تھا۔ دوسرے کا بچھی چند۔ گورو جی جب لوگوں کو اپدیش دینے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیتے تو چیلہ پور بول ان کی دھنی ٹانگ دباتا اور بچھی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چابی کرتے۔ تیل چڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیاں اور گھنگر و باندھ کر اسے سجاتے۔ اس پر کبھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پر ماتما کا ایسا ہوا کہ گورو جی ایک کروٹ لیٹ گئے اور ان کی بائیں ٹانگ دھنی ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پور بول کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ پر رسید کر دیا۔ گورو جی نے پلہلا کر دھنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب بچھی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور دھنی ٹانگ کی خوب مرست کی۔ گورو جی بہت چلائے کہ ظالمو! کیوں مارے ڈالتے ہو۔ ہائے! لیکن چیلے کب مانتے تھے۔ گورو جی کی ٹانگیں سوچ کر ٹپٹا ہو گئیں۔ مدتوں ہلدی پچو ناگنا پڑا۔

اب آگے چلیے۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ لالہ بچھی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونہار اور ہوشیار۔ پشاور، مل، سندھورام، لاہوری مل اور بلوچ رائے۔ لالہ جی کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گورو جی کی ٹانگ دباتے تھے لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈی پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست

جھگڑا ہوا۔ اور طے ہوا کہ ہم اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پوکھل نے کہا۔ ہاں۔ ہاں، ٹھیک کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کر لے جا رہا ہوں۔ اب ان برخورداروں نے گنڈاسہ منگوایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی تیسرے نے گھٹنا اٹھایا۔ چوتھے نے باقی کو سمیٹا اور گھر کی راہ لی اور اس کے بعد سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

گورو جی کا کیا ہوا؟ مرے یا جیے۔ جیے تو کتنے دن تک جیے۔ اس کا کہانی میں ذکر نہیں۔

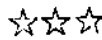


ایک تھا کچھو۔ ایک تھا خرگوش۔ دونوں نے آپس میں دوڑ کی شرط لگائی۔ کوئی کچھو سے پوچھے کہ تو نے کیوں لگائی؟ کیا سوچ کر لگائی۔ دیا میں احمقوں کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو نیم کے ٹیلے تک پہلے پہنچے، وہ میری سمجھا جائے۔ اسے اختیار ہے کہ ہارنے والے کے کان کاٹ لے۔ دوڑ شروع ہوئی۔ خرگوش تو یہ جاوہ جاپلک چھپکنے میں خاصی دور نکل گیا۔ میاں کچھو سے وضع داری کی چال چلتے منزل کی طرف رواں ہوئے۔ تھوڑی دور پہنچے تو موچا بہت چل لیے..... اب آرام بھی کرنا چاہیے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے شان دار ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔ جب اس دنیا میں کچھو سے راج کیا کرتے تھے۔ سائنس اور فنون لطیفہ میں بھی ان کا بڑا نام تھا۔ یونہی سوچتے میں آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خود تو تخت شاہی پر بیٹھے ہیں۔ باقی زمین مخلوق شیر، چیتے، خرگوش، آدھی وغیرہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں یا فرشی سلام کر رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو ابھی سستی باقی تھی۔ بولے ابھی کیا جلدی ہے۔ اس خرگوش کے بچے کی کیا اوقات ہے۔ میں بھی کتنے عظیم ورثے کا مالک ہوں۔ وا بھئی واہ میرے کیا کہنے۔

جانے کتنا زمانہ سوئے رہے تھے جب جی بھر کے سستا لیے تو پھر ٹیلے کی طرف رواں ہوئے۔ وہاں پہنچے تو خرگوش کو نہ پایا۔ بہت خوش ہوئے اپنے کو داووی کہ وہ رے مستعدی میں پہلے پہنچ گیا۔ بھلا کوئی میرا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اتنے میں ان کی نظر خرگوش کے ایک پلے پر پڑی جو ٹیلے کے دامن میں کھیل رہا تھا۔ کچھوے نے کہا۔ ”اے برخور دار تو خرگوش خان کو جانتا ہے؟“

خرگوش کے بچے نے کہا۔ ”جی ہاں جانتا ہوں۔ میرے ابا حضور تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ وہ کچھوے میاں ہیں جنہوں نے باوا جان سے شرط لگائی تھی۔ وہ تو پانچ منٹ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد مدتوں آپ کا انتظار کرتے رہے آخر انتقال کر گئے۔ جاتے ہوئے وصیت کر گئے تھے کہ کچھوے میاں آئیں تو ان کے کان کاٹ لینا۔ اب لائیے ادھر کان۔“

کچھوے نے اپنے کان اور سری خول کے اندر کر لی۔ آج تک چھپائے پھرتا ہے۔



ایک کواروٹی کا کلڑا لیے ہوئے ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا گزر اودھر سے ہوا۔ منہ میں پانی بھر آیا (لومڑی کے) سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ اپنی چوچ کھول دے اور یہ روٹی کا کلڑا میں جھپٹ لوں۔

پس اس نے مسکین صورت بنا کر اور منہ باز پر اٹھا کر کہا۔ کوئے میاں سلام! تیرے حسن کی کیا تعریف کروں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ زاہد ادا، چوچ بھی کالی، بر بھی کالے، آج کل تو دنیا کا مستقبل کانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ افریقہ میں بھی بیداری کی لہر ویز گئی ہے۔ لیکن خیر، یہ سیاست کی باتیں ہیں۔ آدم برسر مطلب میں نے تیرے گانے کی تعریف سنی۔ بہت اتنا خوب سمجھتا ہے تو گاتا بھی اچھا ہوگا۔ مجھے گانا سننے کا شوق یہاں کبھی نہ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ ٹھہری ہو جائے۔“

کو اٹھولانہ سما یا لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر پنجے میں
تھاما اور لگا کائیں کائیں کرنے۔ بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی۔
”ہت تیرے کی۔ بے سُر ا بھانڈ معلوم ہوتا ہے۔ ٹو نے بھی حکایا سے لقمان پڑھ رکھی
ہیں۔“



ایک پیاسے کوئے کو ایک جگہ پانی کا منکا پڑا نظر آیا۔ بہت خوش ہوا لیکن یہ دیکھ کر
ماپوسی ہوئی کہ پانی بہت نیچے ہے۔ فقط مکے کی تہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی
کو کیسے اوپر لائے اور اپنی چونچ تر کرے۔
اتفاق سے اس نے حکایات لقمان پڑھ رکھی تھیں۔ پاس ہی بہت سے کنکر پڑے
تھے۔ اس نے اٹھا کر ایک ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح
سے شام ہو گئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال ہو گیا۔ مکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ
کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔
ہت تیرے کی لقمان۔“ پھر بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا اور مر گیا۔
اگر وہ کوئ اکہیں سے ایک ٹکلی لے آتا تو مکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی کو چوس لیتا۔
اپنے دل کی سُر او پاتا۔ ہر گز جان سے نہ جاتا۔



سیٹھ حاتم طائی سے سیٹھ

لٹھا بھائی ململ بھائی تک!

کل ہم نے ایک صاحب کو اپنے دروازے پر منڈلاتے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی عبا زیب تن۔ سر پر عقال باندھے۔ کمر پر ہاتھ رکھے کراہتے۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے۔

ہم نے کہا۔ ”کون ہو بھئی! سچ کچ کوئی چوٹ آئی ہے یا بھیک مانگنے کی صورت بنائی ہے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں کسی کو فضول دینے کے لیے۔ آ جاتے ہیں لوگ عربوں کی سی وضع بنا کر۔“

بولے ”میرا نام حاتم ہے۔ شاید آپ نے سنا ہو۔“

ہم نے کہا ”ہاں ہاں سنا ہے بلکہ تمہیں دیکھا بھی ہے۔ اگر تم وہی آدمی ہو جس نے فلم حاتم میں صبیحہ کے ساتھ کام کیا ہے۔ اچھا کام تھا تمہارا۔ اک ذرا مونے نظر آتے تھے۔“

کہنے لگے ”بخدا میں وہ نہیں ہوں۔ نہیں معلوم وہ مونا مسٹنڈ اکون ہے۔ میں تو ساتم طائی ہوں۔ قصے کہانیوں والا۔“

ہم نے کہا..... ”اچھا وہ شخص جس کی وجہ شہرت فضول خرچی ہے۔ حاتم سینھ تم اتنی سخاوت نہ دکھاتے تو یہ حال کیوں ہوتا۔ آج تمہاری ایک حاتم کاٹن مل ہوتی۔ ایک حاتم سلک مل ہوتی۔ حاتم جوت مل ہوتی۔ حاتم فرٹیلائر فیکٹری ہوتی اور ایک..... خیر اب کیا ہوا ہے تمہیں۔ منہ سے پھوٹو تو۔“

بولے ”کچھ لوگ رات بھر میری قبر پر لاتیں مارتے رہے۔ قبر کے ساتھ ہڈیاں بھی چکنا چور ہو گئیں۔ ہائے مر گیا۔“

”کون ظالم تھے وہ؟“ ہم نے کہا ”ذرا نام پتہ بتاؤ۔ تھانے میں ان کی رپورٹ کریں۔“

بولے ”آپ کے ملک کے کپڑا ملوں والے سینھ تھے۔ میری قبر پر لاتیں مارتے جارہے تھے اور اعلان کر رہے تھے۔“ ہو گیا۔ ہو گیا خلق خدا کا بھلا ہو گیا۔ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فی صد کمی۔ اٹھو ورنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیاحت کی چل گیا۔“

ہم نے کہا ”یہ ڈھائی روپیہ کا ڈھائی فی صد کیا ہوا؟“

بولے۔ ”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ لیکن بہت ہوگا۔“

ہم نے کہا ”ہاں ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا کسی سے پوچھیں گے۔ کسی سے کیا خود سینھ صاحبان سے بات کریں گے۔ اتنے میں تو یہ چونی لے۔ کسی سے ہلدی چونا لے کر اپنی ہڈیوں پر لگا اور باقی پیسوں کی روٹی کھا۔ دیکھنا بھوکا مت رہنا۔“

حاتم نے وعادی۔ ”سخی و اما کی خیر۔ اللہ زیادہ دے۔“ اس کے بعد ہائے ہائے کرتا، لنگڑاتا ایک طرف کو پٹلا گیا۔

(۲)

”سینھ لٹھا بھائی ملل بھائی دفتر میں تشریف رکھتے ہیں؟“ ہم نے ان کے منیم

صاحب سے پوچھا۔

”کیا مانگتا ہے؟“ منیم صاحب نے روکھے پن سے کہا۔ ”نو کری مانگتا ہے تو سیٹھ صاحب کے پاس کوئی نو کری نہیں۔ ہم نے پھٹا لکھ کر بھی لگا دیا ہے۔ یتیم خانے کے لیے چند مانگتا ہے۔ تو بھی معاف کر۔ سیٹھ صاحب آج کل خود یتیم ہو رہے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم یہ کچھ نہیں مانگتا بابا۔ انڈویو مانگتا ہے اخبار کے لیے۔“

بوللا۔ ”ہمارے سیٹھ کا فوٹو بھی چھاپے گا؟“

ہم نے کہا ”خیر اور چھاپے گا۔ اس کا بھی چھاپے گا۔ تم کہو تو تمہارا بھی چھاپے گا۔“

بوللا۔ ”ٹھیک ہے۔ اعلیٰ ملائے دیتا ہوں۔“

سیٹھ صاحب ہمارے ملک کی مایہ ناز ہستی ہیں۔ ان کا نام اندرون ملک اور بیرون ملک مشہور ہے۔ انٹرپول والے تک ان کو جانتے ہیں۔

ان کے کئی ال ہیں۔ بنک ہے۔ بیمہ کمپنی ہے۔ کپڑا بھی بیچتے ہیں۔ لوہا بھی بیچتے ہیں۔۔۔۔۔ گھی بھی بیچتے ہیں۔ تیل بھی بیچتے ہیں۔ کھاد بھی بیچتے ہیں۔ ایمان بھی بیچتے ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ بیچتے ہوں۔ کوئلے کی دلائی اس پر مستزاد۔ خوش اخلاق بھی بہت ہیں۔ اٹھ کر مصافحہ کیا۔ شیشی بھی نکالی۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمارے ساتھ فوٹو گرافر نہیں ہے، جلدی سے سمیٹ لی۔

ہم نے کہا۔ ”سیٹھ جی، ہم ایک بات پوچھنے آئے تھے۔ یہ رہا ہمارا کارڈ۔“

بولے۔ ”ہاں ہاں پوچھو بھائی۔۔۔۔۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کمال کرتے ہیں (کارڈ پر نام پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کیا نام ہے آپ کا؟ ابن عیسیٰ۔ عیسیٰ صاحب میں تو ہر روج پڑھوا کر سنتا ہوں۔“

ہم نے کہا ”شکریہ یہ بتائیے کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے ڈھائی روپے تک کے کپڑے پڑھائی فیصد دام کم کر دیے ہیں؟“

فرمایا ”ہاں ہاں۔ سارے اخباروں میں مسرت سے اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ یوں سمجھو ہم نے یہ قربانی کی ہے۔ گریب آدمیوں کے لیے۔“

ہم نے کہا ”ڈھائی روپے پر ڈھائی فیصد کیا بنا؟“

بولے۔ ”خود حساب کر لو۔ ایک روپے پر ڈھائی پیسے۔ ڈھائی روپے پر ایک آنہ یعنی جو کپڑا ڈھائی روپے کا تھا۔ اب دو روپے سات آنے کا ہوگا۔ جتنا جی چاہے لے لو۔ بابا۔ ہماری ٹیپ ٹاپ پر مت جاؤ۔ ہمارا دل گریب ہے۔ گریبوں کے ساتھ ہے پچھلے الیکشن میں بھی ہم نے یہی بات کہی تھی بلکہ کئی کئی ہزار روپے غریب و دُوروں میں بانٹ دیے تھے۔“

ہم نے کہا۔ ”اس میں کیا شک ہے لیکن سیٹھ صاحب ہم نے تو کوئی کپڑا بازار میں ڈھائی روپے سے کم دام کا نہیں دیکھا۔ آپ کون سا کپڑا ڈھائی سے کم کا بناتے ہیں؟“ انہوں نے پکار کہا ”منیم جی..... عیسیٰ صاحب کو بتاؤ ہم کون کون سا کپڑا ڈھائی روپے سے کم دام کا بناتے ہیں۔“

منیم صاحب نے کہا ”سیٹھ صاحب۔ آج کل کوئی ایسا کپڑا نہیں۔ ایک کھڑ رہوا کرتا تھا سواد و روپے گڑکا۔ دو بھی کوئی چھ مہینے ہوئے پونے تین روپے گڑ کر دیا گیا۔“ بولے ”پونے تین روپے تو اس پر تو ہم کچھ گھٹا نہیں سکتے۔ مجبوری ہے۔ منیم جی اس سے کم کا کچھ نہ کچھ تو بنتا ہوگا۔ ہماری ڈھا کے والی فیکٹری میں کیا بنتا ہے؟“ وہ تو ناٹ ہے حو را“ منیم صاحب نے کہا۔

”دو بھی تو کپڑا ہی ہوا۔“ سیٹھ صاحب بولے ”گریبوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔“

ہم نے کہا ”جی ہاں۔ ہم اس سے بوریا بناتے ہیں۔ ہو خیر گرم ان کے آنے کی تو اس کو بچھاتے ہیں۔“

”ان سے کیا مطلب آپ کا؟ مارشل لا والے تو نہیں؟“ سینھ جی نے سہم کر کہا۔
 ”نیم جی وہ اپنا زرمبادلہ تو چھپا دیا۔“

”جی ہاں۔ چنانہ کیجیے۔“ نیم جی نے کہا ”آپ کی جانماز کے نیچے چھپا دیا ہے۔“
 ”آپ بھی لاتوں کے بھوت ہیں سیٹھ۔“ ہم نے آہستہ سے کہا۔
 ”کیا کہا عیسیٰ صاحب!“ سینھ صاحب بولے۔

”کچھ نہیں۔ لیکن سیٹھ جی ایک گز پر ایک آٹہ؟ یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔ آپ
 بڑھاتے دس فیصدی، پچیس فیصدی، پچاس فیصدی کے حساب سے ہیں۔ گھٹاتے ہیں
 تو ڈھائی فیصدی۔ ہم پر یہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔“
 ”دیکھیے عیسیٰ صاحب۔“ سینھ صاحب سنجیدہ ہو کر بولے۔

”آپ کو یہ تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ حساب لگائیے۔ اگر کوئی گریب آدمی پانچ روپے
 کا کپڑا پاجامے کے لیے لیتا ہے تو اسے دو آنے بچیں گے۔ پورے دو آنے۔ اگر وہ
 سو روپے کا خریدے تو ڈھائی روپے کا سیدھا سیدھا فائدہ ہے۔ جہاں روپے کا خریدے
 تو پچیس روپے کا۔ پچیس روپے تھوڑی رقم نہیں ہوتی۔ کسی گریب آدمی سے بات کیجیے
 بہت کھس ہو گا وہ یہ سن کر۔“

ہم نے کہا ”بے شک۔ اب بات ہماری عقل میں آئی۔“
 ”اور یہ دیکھو۔ ہم نے قوم کی رکھد مت کے لیے اپنے آپ اعلان کیا ہے۔ جب
 ہم خود ہی غریبوں کے لیے اتنا کچھ کرنے کو تیار ہیں تو لوگ موٹلزم کی بات کیوں کرتے
 ہیں عیسیٰ صاحب۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ ہماری بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“
 ”اور پھر موٹلزم احلام کے خلاف بھی تو ہے۔“ سینھ صاحب نے زور وے کر کہا۔
 ”ہاں سیٹھ۔“ ہم نے تائید کی ”جو چیز تیرے مفاد کے خلاف ہے وہ اسلام کے

خلاف ہو جاتی ہے۔ تو اور احلام ایک چیز ہوئے نا؟“

”کیا کہا عیسیٰ صاحب؟“

”کچھ نہیں۔ ہم اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ اچھا خدا حافظ سیٹھ صاحب۔“

”ارے نیم جی۔“ سیٹھ صاحب پکارے۔ ”عیسیٰ صاحب کے لیے چائے لاؤ اور

کہار ا بسکٹ بھی۔ اور ہاں عیسیٰ صاحب۔ یہ فوٹو ہمارا اچھا پیسے گا۔ ہمارے انٹرویو کے

ساتھ۔ ذرا بڑا سا کر کے۔ ابھی کل ہی کھوایا ہے۔“

(۳)

یہ ایک شخص تھا میلہ ساتھ باندھے۔ پھٹی ہوئی بھیان پہنے واڑھی بڑھی ہوئی۔ پاؤں سے ننگا۔

”ابے تو کون ہے؟“ ہم نے لاکار کر کہا۔

”جی میں ہوں غریب آ جی۔“ وہ مسکینی سے بولا۔

”کیا ثبوت ہے؟“ ہم نے پوچھا ”جیب کی تلاشی دو ہمیں۔“

”میری جیب ہی نہیں ہے حضور!“

”پھر ٹھیک ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”اچھا انٹرویو ہے۔“

بولا ”حضور! میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو ضرور دیتا۔“

”ابے انٹرویو کا مطلب نہیں جانتا؟“ ہم نے دھول جما کر کہا۔

”ہم سوال کریں گے۔ تو جواب دیتا۔“

کچھ اس کا ضعف۔ کچھ ہمارا رعب۔ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

”جی اچھا۔“

”تو پاکستانی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”ڈو پلمنٹ کا نام سنا ہے؟ G.N.P. کا مطلب جانتا ہے؟“
 ”جی نہیں۔“

”تو اپنا معیار زندگی کیوں نہیں بلند کرتا؟“

”حضور غلطی ہوئی۔ آئندہ کروں گا۔ آپ طریقہ بتا دیجیے۔“

”بچت کیا کر۔ بہت پیسے ہو سائیں گے تیرے پاس۔ بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا۔ انہیں پھل اور انڈے التزام سے کھلائیں۔ یو یو ڈی ویڈیو دیکھا کر۔ آرٹ کونسل جایا کر تیرا ذہنی پس منظر وسیع ہوگا۔ تیری شخصیت میں گہرائی آئے گی۔“
 کچھ نہیں بولا۔ بھونچکا بیٹھا نگر نگر دیکھتا رہا۔

ہم نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ نے کپڑا سیٹھوں کا اعلان سن لیا کہ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پڑھائی فیصدی دام کم کر دیے گئے۔ اب تو تو خوش ہے نا تیرے سارے ولد روھوئے گئے۔“

”کیا مطلب ہے جی اس کا؟“

ہم نے کہا ”ارے گھامڑ۔ اگر تو سو روپے کا کپڑا خریدے تو ڈھائی روپے کی بچت۔“

”اگر ہزار روپے کا خریدے تو پچیس روپے کا فائدہ۔ لاکھ روپے کا خریدے تو.....“

”لیکن جی میں یہ سو روپے اور ہزار روپے اور لاکھ روپے کہاں سے لاؤں گا؟“

”یہ سوچنا تیرا کام ہے۔“ ہم نے کہا ”ہم تو صرف یہ بتانے آئے تھے کہ ہمارے معاشرے کے ایک محب وطن طبقے نے تری ہمدردی میں کتنا بڑا قدم اٹھایا ہے اور یہ شان دار رعایتی اعلان رضا کارانہ طور پر کیا ہے۔ اپنے آپ کیا ہے۔“

بولا۔ ”اپنے آپ کیا ہے جی؟“

ہم نے کہا ”ہاں۔ اور وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔“
 ”ایک کہانی سناؤں آپ کو؟“ گریب آدمی کہنے لگا۔
 ”ابے تو بھی کہانی سنانے لگا۔ بابا بابا۔“ ہم نے کہا۔

بولا۔ ”بی کہانی نہیں، لطیفہ ہے چھوٹا سا۔ ایک غرض مند کسی سیٹھ کے پاس گیا اور مدد کا سوال کیا۔ سیٹھ صاحب نے اپنی نورانی داڑھی پر ایک بار ہاتھ پھیرا اور کہا ”بابا۔ جا تیری قسمت میں کچھ نہیں۔“

سائل نے کہا۔ ”کیا مطلب سیٹھ بی؟“

بولے۔ ”ہمارا دستور ہے کہ کوئی سائل سوال کرے تو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ جتنے بال ٹوٹ کر ہاتھ میں آئیں اتنے روپے سائل کو عنایت کرتے ہیں۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بال ہمارے ہاتھ میں نہیں آیا۔“

سائل بولا۔ ”اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔“

سیٹھ صاحب نے بڑی مہربانی سے کہا۔ ”ہاں ہاں کہو۔“

بولا۔ ”حضور! انصاف یہ ہے کہ داڑھی آپ کی ہو اور ہاتھ میرا پھر کوئی بال ہاتھ میں نہ آئے تو البتہ.....“

ہم نے طیش میں آ کر کہا۔ ”ابے ناشکرے۔ کنگھے۔ کوئی تیرے لیے اپنا گھر لٹا دے ڈھائی فیصد تھوڑا ہوتا ہے۔ آخر سیٹھوں کی اپنی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ کوٹھیاں، گاریں، کلب۔ سُنئے۔“

وہ کچھ کہنے کو تھا کہ ہم نے ایک لات کس کر جمائی۔ ”چل بھاگ تو اپنا معیار زندگی کبھی بلند نہیں کرے گا۔ تیری وجہ سے ہمارا سارا مین الا تو امی رعب خارت ہو گیا۔“

(۶۹ء میں لکھا گیا)



کیسینجر کی واپسی

ہمارے دوست مرزا جمیل الدین عالی میں خدا نے کام کرنے کی قوت و صلاحیت بے پناہ رکھی ہے اتنی کہ ایک آدھ مصروفیت یا فقط کارِ منصبی سے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف وہ بینک کے اعلیٰ عہدے دار ہیں۔ دوسری طرف انجمن ترقی اردو کے اعزازی سیکرٹری۔ ایک مدت تک یہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل رہے۔ ہاں اردو کالج کی زمام کار بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں معلوم ہوا کہ انجمن باشندگان لوہار دکن کے بھی وہ نائب صدر ہیں۔ ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے خازن بھی تھے۔ ان تمام اداروں کے معاملے ان کے پاس آتے تھے۔ ایک ہی میز پر آتے تھے اور وہ بحسن و جہ ان سے عہدہ و برآ ہوتے تھے لیکن بندہ بشر ہے۔ ایک بار ہم نے دیکھا کہ رائٹرز گلڈ کی فائل پر سفارش لکھی آئی ہے کہ چار سو گز کے سارے پلاٹوں کی الاٹمنٹ منسوخ کر دینی جائے۔ ہم حیران ہو رہے تھے کہ یہ کام کیسے کریں کہ ہاؤسنگ سوسائٹی کا کارندہ فائل لے آیا۔ کہا صاحب آپ نے کیا لکھ دیا ہے کہ اردو کے ادیبوں کی نگارشات کے ترجمے دوسرے ملکوں میں شائع کیے جائیں گے۔ آخر اس فائل کا نوٹ اس فائل پر اور اس فائل کا اس پر منتقل کیا گیا۔ ایک بار انجمن کی فائل پر انہوں نے لکھ دیا تھا کہ ملتان میں بینک کی دو برانچیں اور کھول دی جائیں اور بینک کی فائل پر لکھا تھا کہ مشنری کہ م راؤ پدم راؤ کی اشاعت کا جلد بندہ بست کیا جائے۔

کل اخبار میں ایک اور جیل الدین عالی کا ذکر پڑھا جس کا نام ہنری کیسنجر ہے اور سن کے پاؤں کی گردش کا آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں کہ آج کہیں۔ کل کہیں، صبح کہیں شام کہیں۔ بے شک سفر کرنے میں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ جاپان میں ہانگ کانگ کے سکتے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہانگ کانگ میں بنگاک والے، ہوٹل کے کمرے کی چابی مانگتے ہیں۔ اور کوریا میں شکر یہ جاپانی زبان میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن کیسنجر کی کہانی زیادہ دلچسپ ہے۔ کیسنجر کی کہانی آرٹ بخوالڈ کی زبانی۔



جب ہنری کیسنجر مختلف ملکوں کے دورے ختم کر کے واشنگٹن میں صدر فورڈ کے پاس گئے تو انہوں نے پوچھا۔

”میاں کیسنجر! کیسا ہاتھ مارا دورہ؟“

”بہت اچھا رہا، مسٹر پریذیڈنٹ!“ کیسنجر نے کہا۔ ”میں جہاں گیا لوگوں کو اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اپنی بات منوا کر اٹھا۔ مثلاً میں نے اندرا گاندھی کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے تیل کی قیمت دس ڈالر فی بیرل کم کر دیں۔“

”لیکن ہنری! ہندوستان تو تیل برآمد کرتا ہی نہیں۔“

اس کے ہاں تو تیل ہوتا ہی نہیں۔“

”اچھا؟ یہ بات ہے تبھی میں کہوں کہ مسز گاندھی نے اتنی جلدی کیسے میری درخواست پر صا د کر دیا۔“

”اچھا تو دس میں بات چیت کیسی رہی؟“

”بہت اچھی رہی۔ ہم مسٹر برزنیف کو ایک اناک انرجی پلانٹ دے رہے ہیں۔“

”ہیں؟ دس کو ایک انرجی پلانٹ؟ آپ کو تو ان سے یہ کہنا تھا کہ اپنے جوہری ہتھیاروں میں کمی کریں۔“

”لیکن یہ بات تو میں نے بنگلہ دیش سے منوالی ہے۔ مسٹر پریذیڈنٹ کہ جوہری

تھیاری بنانا کم کر دیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ امریکہ کی خواہش کے احترام میں اس سال ایٹم بموں کی تیاری روک دیں گے۔“

”بنگلہ دیش تھیاری بنائے نہ بنائے، اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ اور بات بتاؤ ہنری؟“

”مسٹر پریذیڈنٹ کیا عرض کروں۔ صبح کہیں ہوتا تھا شام کہیں۔ ایک ٹانگ یہاں دوسری ٹانگ وہاں۔ اس میں گرڑ بڑ ہوگئی۔ وہ اٹانک انرجی پلانٹ مجھے کس کو دینا تھا بھلا؟“

”مصر کے صدر سادات کو۔“

”بے شک اب یاد آیا۔ میں نے اس کے بجائے سادات سے یہ دریافت کیا کہ کیا ہم اسرائیل کو فوجی رسد بھیجنے کے لیے آپ کے ہوائی اڈے استعمال کر سکتے ہیں۔“

”یہ بات تو ہنری تمہیں پرنگال سے کہنی تھی۔“

”بے شک، میں بھی کتنا بدھو ہوں۔“

”تم نے پرنگال سے کیا کہا؟“

”پرنگال سے میں نے یہ فرمائش کی کہ وہ صحرائے سینائی کو خالی کر دے اور دریائے اردن کے مغربی کنارے سے بھی فوجیں واپس بلا لے۔“

”پرنگال نے کیا جواب دیا ہنری؟“

”انہوں نے کہا بسروچشم۔“

”ہنری! میں تمہیں کیسے یاد دلاؤں کہ پُرنگال نے سینائی پر قبضہ نہیں کر رکھا۔ وہ تو موزمبیق پر قابض ہے۔“

”عجیب بات ہے میں نے موزمبیق کو خالی کرنے کی فرمائش اسرائیل سے کر ڈالی۔“

”اس کا رد عمل اس پر کیا تھا؟“

”انہوں نے بھی یہی کہا۔ ہاں ہاں ضرور ضرور۔“

”ہنری! معلوم ہوتا ہے تم تھک گئے ہو تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔“
 ”جی ہاں، تھک تو واقعی گیا ہوں۔ لیکن دورہ کامیاب تھا۔ ہم نے شاہ ایران کو بیس کروڑ بشل گیہوں دینے کی پیش کش کر دی ہے۔“
 ”ایران کو بیس کروڑ بشل گیہوں۔“
 ”جی ہاں ہمارے امدادی پروگرام کے تحت۔“
 ”لیکن ہنری یہ سوچو کہ ایران کی کمائی تیل سے اتنی ہے کہ اس کے پاس ہم سے زیادہ ڈالر ہیں۔“

”میں سمجھا، دائروں کی یہ بہتات اٹلی کے ہاں ہے۔“
 ”پاگل ہو گئے ہو؟ اٹلی تو بالکل نکال ہے۔ ہنری! تمہیں یہ گیہوں کا وعدہ اٹلی سے کرنا تھا۔“

”بڑی چوک ہو گئی۔ دراصل اٹلی اور ایران کے نام ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ میں گڑ بڑا جاتا ہوں۔“
 ”اصل میں غلطی سیری ہے۔ ہنری! مجھے تم کو ایک ساتھ اتنے سارے ملکوں میں ہمیں بھیجنا چاہیے تھا۔ آدی واقعی بوکھلا جاتا ہے۔ تم پاپائے روم سے بھی ملے؟“
 ”جی ہاں، ملا۔ انہوں نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ میں نے انہیں آپ کا پیغام بھی دے دیا۔“

”کون سا پیغام بھلا؟“
 ”یہی کہ وہ امریکا سے نئے لڑاکے ہوائی جہازوں کے بارہ سکویڈرن خریدیں۔“
 ”خوب! اچھا میں تم سے آخری سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے پوپ سے لڑاکا جہازوں کے سکویڈرن خریدنے کی فرمائش کی ہے تو ہمارے لیے دھا کرنے کو کس سے کہا؟“
 ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ شاہ فیصل سے۔“

(یہ کالم انشا، جی نے جنوری ۱۹۷۷ء میں لکھا تھا)۔

خطبہ صدارت حضرت ابنِ انشاء

پچھلے دنوں ایک کتاب چھپی ہے۔ ”چلتے ہو تو چین کو چلیے“ اس کے فاضل مصنف کا کیا عمدہ قول ہے کہ انسان کی صحیح قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفر وسیلۃ الظفر کا مطلب بھی شاید یہی ہے۔ ان صاحب کا جب چین میں تعارف کرایا گیا کہ یہ اپنے ملک کے نامی گرامی ناول نویس ہیں اور فسانہ آزاد، گنودان، آگ کا دریا، خدا کی بستی اور آنگن وغیرہ انہی کی تصانیف ہیں تو یہ ہر چند کہ ناول لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔ فرط عجز و انکسار سے دہرے ہو گئے۔ کسی بات کی تردید کرنا خلافِ آداب جانا۔ ایک اور صاحب کسی کارِ دبار کے سلسلے میں کسی باہر کے ملک میں گئے اور ملک الشعراء ہو کر واپس آئے۔ آقائے حامی بابا اصفہانی بھی اصفہانِ آنا خلافِ مصلحت جانتے تھے۔ استنبول میں تو یہ ایک رئیس کے داماد ہو کر ٹھاٹ دکھاتے تھے۔ لیکن وطن آتے تھے تو پرانے گاہک بجائے مر آنکھوں پر بٹھانے کے یہی فرمائش کرتے تھے کہ خلیفہ ذرا میرا مر تو مونڈ دیجو اور ہاں ڈارہی بھی تراش دیجو۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کا سا خط بنانے والا اب سارے اصفہان میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استنبول کی آب و ہوا کی تعریف کیا کرتے تھے اور جب تک

زندور ہے وہیں قیام کرنا پسند کیا۔

مقصود اس قصے کا یہ ہے کہ ہمارا اپنے ہی شہر اور اپنے ہی پرانے کالج میں مہمان خصوصی بن کر آنا ایک طرح کی سنگین غلطی بلکہ غلط کاری ثابت ہوتا۔ لیکن ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ ہمارے زمانے کے اساتذہ میں سے کوئی کالج میں بچا ہے تو مرقت کے مارے ہماری کسی بات پر یہ نہ کہے گا کہ ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں۔

صاحبو! ویسے تو ہم آہیں بھر بھر کر اپنے ماضی کی عظمت کی جو داستانیں چاہیں بیان کریں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس درس گاہ کے برآمدوں میں دو برس جو تیاں چٹختے ہوئے ہم نے نہ کچھ کھویا، سوائے عزت سادات کے۔ اور نہ کچھ پایا سوائے ڈگری کے۔ ہماری کلاسیں ایک طرح سے تعلیم بالغاں کی کلاسیں تھیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمارا عیب و ثواب اور نفع نقصان ہم ہی پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ ہمارے ہم سبقوں میں ایک دو تو شاید صاحبِ اولاد بھی تھے۔

ان اساتذہ کے علم و فضل میں کلام نہیں۔ لیکن ان کا فیضِ صحبت ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ ہم جیسے چھلے چھلائے اور دھلے دھلائے آئے تھے ویسے ہی واپس آ گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم قطب بنے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور ہمارا ستارہ گردش میں رہا کرتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم خود گردش میں رہنے لگے اور ہمارے ستارے نے کراپی میں بیٹھے بیٹھے آب و تاب سے چمکنا شروع کر دیا۔ پھر اخبار جنگ میں ”آج کا شاعر“ کے عنوان سے ہماری تصویر اور سالات چھپے۔ چونکہ حالات ہمارے کم تھے لہذا ان لوگوں کو تصویر بڑی کرا کے چھاپنی پڑی اور قبول صورت سلیقہ شعراءِ پابند صوم و صلوة اولادوں کے والدین نے ہماری نوکری، تنخواہ اور چال چلن کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ یوں عیب بینیوں اور نکتہ چینیوں سے بھی دنیا خالی نہیں۔ کسی نے کھایا یہ شاعر تو ہیں لیکن آج کے نہیں۔ کوئی بے درد بولا۔ یہ آج کے تو

ہیں لیکن شاعر نہیں۔ ہم بدول ہو کر اپنے عزیز دوست جمیل الدین عالی کے پاس گئے انہوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا دل میل امت کرو۔ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں۔ ہم تو نہ تمہیں شاعر جانتے ہیں نہ آج کا مانتے ہیں۔ ہم نے کسمسا کر کہا۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بولے میں جھوٹ نہیں کہتا اور یہ رائے میری تھوڑی ہے سبھی سمجھ دار لوگوں کی ہے۔



ابن انشاء یہ نام ہم نے نہ جانے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا کی توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ سید انشاء اللہ خاں انشا کی رعایت سے ہمیں بھی سید لکھنے لگے۔ یعنی گھر بیٹھے ہماری ترقی ہو گئی۔ اسی نسبت سے دتی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان پر کم اعتراض کیے اور دتی سر کنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے ایک پُر فضا پلاٹ کی ہمیں پیش کش کی۔ لکھنؤ والوں نے الہتہ ہماری زبان کے نقائص کے لیے اسی کو بہانہ بنالیا کہ ہاں وئی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے آکر ہمارا ہاتھ ادب سے چومنا اور کہا۔ واللہ آپ تو مجھے رستم نکلے۔ آپ کا کلام پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ہم نے انکسار برتا کہ ہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لیتے ہیں۔ آپ نے کون سی غزل دیکھی ہماری۔ حافظے پر زور ڈال کر بولے۔ ”کچھ اس قسم کی ہے، مگر باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔“ ہم نے کہا۔ ”کہاں پڑھی ہے۔؟“ بولے۔ ”مولوی محمد حسین آزاد کی آب سیات میں منقول ہے۔“



بنگ میں ”آج کا شاعر“ کے ضمن میں خواتین کے بھیجے ہوئے پسندیدہ اشعار بھی چھپا کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے ہمیں فون کیا کہ ذرا چیک کر کے بتائیے۔ یہ سارے

اشعار آپ کے ہیں؟ بعض اوقات یہاں مختلف شاعروں کے اشعار کو خلط ملط بھی کر دیتی ہیں۔ ہم نے کہا سنائیے۔ ان میں بھی پہلا شعر جو کوئی دس خواتین کی پسند تھا۔ یہی تھا۔ ع۔ کربان دھے ہوئے.... یہ غزل ہمیں ہمیشہ سے پسند رہی ہے۔ لہذا ہم نے ایڈیٹر صاحبہ سے کہا کہ کسی کا دل توڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کو ہمارا یہی شعر پسند ہے تو خیر چھاپ دیجیے۔ دوسرا شعر بھی اسی غزل کا تھا۔

بھلا گروش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیست ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں
ہم نے کھکار کر کہا۔ خیر یہ بھی ٹھیک ہے آگے چلیے اسے اگلا شعر تھا۔
یاد آتا ہے دو حرفوں کا اٹھانا اب تک
جیم کے پیٹ میں اک لفظ ہے موخالی ہے
ہم نے کہا۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ یہ شعر ہمارا ہو۔ مشتبہ بات ہے اسے کاٹ دیجیے
اس کے بعد نوبت ان شعروں پر پہنچی۔

کہیں بچھڑا ہوا دیکھا جو اک سُرخاب کا جوڑا
تو ڈھاریں مار کر رویا بٹ گرداب کا جوڑا
لگی غلیل سے اُڑو کی ، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسی ہے کہ لگے تڑے جیسے زاغ کو چوٹ

☆☆☆

شوق سے تو ہاتھ کو میرے سروڑ
میں ترا پنچہ سروڑوں کس طرح

☆☆☆

سوئی میں اونٹ کیسے ڈالا جائے

ہم قارئین کرام کے اصرار پر خانہ داری کے کچھ چٹکلے درج کرتے ہیں۔ امید ہے قارئین انہیں مفید پائیں گی اور ہمیں دعائے خیر سے یاد کریں گی۔

سوئی میں وھا گاؤ الننا

یہ کام بہ ظاہر مشکل معلوم ہوگا لیکن اگر ذرا توجہ سے اس کی ترکیب کو ذہن نشین کر لیا جائے تو کوئی وقت پیش نہ آئے گی۔ سب سے پہلے ایک سوئی لیجیے۔ لے لی، اب وھا گا لیجیے، اور اب وہ وھا گا اس میں ڈال دیجیے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ احتیاط صرف اتنی لازم ہے کہ سوئی کے دوسرے ہوتے ہیں ایک نوک دوسرا ناکا۔ بعض لوگ نوک کی طرف سے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی اس میں کامیابی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ غلط ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ناکے میں وھا گا ڈالا جائے۔

پرانی کتابوں میں آیا ہے کہ اونٹ کو سوئی کے ناکے میں سے گزارنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کنجوس آدمی جنت میں جائے۔ اس آخر الذکر کی بات کی ہم نے کبھی کوشش نہیں کی، حالانکہ یہ لوگ کسی صورت جنت میں چلے جاتے تو وہاں جہاں لوگوں کے گمان کے مطابق ہمارا قیام ہوگا۔ قدرے سن رہتا۔ اب رہا اونٹ کو سوئی کے ناکے

میں سے گزرا نا جسے آسان بتایا جاتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ابھی تک ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ ابھی تک ایسا اونٹ ہمیں کوئی نہیں ملا جو اس بات پر آمادہ ہو۔ جب کہ ایسے کنجوس بے شمار مل جائیں گے جو جنت میں جانے کے لیے تیار بلکہ بے تاب ہوں گے۔ ہماری ناکامی کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مایوس ہو گئے۔ ایک طرف ہم اپنے مطلب کے اونٹ کی تلاش میں ہیں۔ دوسری طرف ایسی سوئی کی جستجو جاری ہے جس کا ناکا اتنا بڑا ہو جس میں سے یہ حیوان شریف ہنستا کھیلتا گزر سکے۔ ہمارے قارئین میں سے کسی صاحب یا صاحبہ کے پاس ایسی سوئی ہو تو عاریتاً دے کر ممنون فرمائیں تجربے کے بعد واپس کر دی جائے گی۔

ہٹن ٹانگنا

ہٹن کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کرتے کا ہٹن، پتلون کا ہٹن، سیپ کا ہٹن، ہاتھی دانت کا ہٹن، بجلی کا ہٹن وغیرہ۔ بعض خاص قسم کی آنکھوں کو بھی جن کے بنانے میں کارکنانِ قضا و قدرت نے فیاضی سے مسالا استعمال نہ کیا ہو، ہٹن کا نام دے دیتے ہیں لیکن یہاں ہمیں اس قسم کے ہٹنوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا لگانا صرف قضا و قدرت کے درزیوں کو آتا ہے۔ بجلی کے ہٹن لگانے کے لیے بھی الیکٹریشن کے لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہماری غرض عام قسم کے ہٹنوں سے ہے جنہیں آپ بھی تھوڑی کوشش کر کے لگا سکتی ہیں۔ کوئی لائسنس وغیرہ کا جھنجٹ بھی اس میں نہیں۔

اس کے لیے سامان بھی معمولی درکار ہے۔ سوئی، وھا گا ہٹن اور دانت۔ ان کے علاوہ کپڑا بھی کیونکہ ہٹن بالعموم کپڑے پر ٹانگے جاتے ہیں لکڑی یا لوہے پر یا خلا میں نہیں۔ سوئی میں وھا گا ڈالنے کی ترکیب ہم لکھ ہی چکے ہیں۔ اب سوئی کو ہٹن کے

سوراخ میں سے گزارنا رہ جاتا ہے جو آپ کسی سے بھی سیکھ سکتی ہیں۔ اب بٹن لگ گیا تو فالتو دھاگا دانتوں سے کاٹ ڈالیے۔ یاد رہے کہ اس کے لیے اصلی دانت درکار ہیں۔ مصنوعی دانتوں سے کوشش کرنے میں ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی دانت وھاگے کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔

بٹن لگانے سے زیادہ مشکل کام بٹن توڑنا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے دھویوں کا کاروباری راز ہے۔ ہم نے گھر پر کپڑے دھلوا کر اور پٹخا کر دیکھا لیکن کبھی اس میں کامیابی نہ ہوئی جب کہ ہمارا دھوئی انہی پیسوں میں جو ہم دھلائی کے دیتے ہیں پورے بٹن بھی صاف کر لاتا ہے، اس کے لیے الگ کچھ چارج نہیں کرتا۔ ایک اور آسانی جو اس نے اپنے سر پرستوں کے لیے فراہم کی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو اپنی لائڈری کے ایک حصے میں بٹنوں کی دکان کھلوا دی ہے جہاں ہر طرح کے بٹن بارعایت نرخوں پر دستیاب ہیں۔

داغ و ہبے مٹانا

اس کے لیے پہلی ضروری شرط داغ و ہبے ڈالنا ہے کیونکہ دھبے نہیں ہوں گے تو آپ مٹائیں گے کیا۔ پہلے فیصلہ کیجیے کہ آپ کس قسم کے دھبے مٹانا چاہتے ہیں۔ سیاہی کے؟ اس کے لیے فوٹن پین کو تھیمس پر ایک دوبار چھڑکنا کافی ہے۔ آج کل آدموں کا موسم ہے۔ ان کا رس بھی پتلون پر گرایا جاسکتا ہے۔ پان کے داغ زیادہ پائیدار ہوتے ہیں ان کے لیے کسی اسپتال یا سینما کی سیڑھیوں میں چند منٹ کھڑے ہونا کافی ہے۔ تارکول کے داغ بھی آج کل مفت ہیں کیونکہ کے ڈی اے نے جو رفاہ عامہ کا ایک محکمہ ہے جا بجا تارکول کے ڈرم کھڑے کر رکھے ہیں اور کڑھاؤ چڑھا رکھے ہیں۔

ان داغوں کے مٹانے پر زیادہ خرچ بھی نہیں اٹھتا فقط تین روپے۔ یہ ہماری تالیف

کردہ کتاب ”داغ ہائے معنی“ کی قیمت ہے بلکہ اس کی پانچ جلدیں اکٹھی منگائی جائیں تو لنڈا بازار اور بوتل والی گلی کے دکاندار جو ہمارے سول ایجنٹ ہیں تول کر بھی ڈیڑھ روپے فی سیر کے حساب سے دے دیتے ہیں۔ داغ ہائے معنی“ عجیب سا نام ہوگا لیکن یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۸۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ آج کل ۱۳۸۶ھ چل رہا ہے اس کو ہماری کتاب کا آئندہ ایڈیشن سمجھا جائے۔

خالی وقت کیسے گزارا جائے

ایک مشہور مثل ہے کہ اچھی بات جہاں سے بھی ملے اخذ کر لینی چاہئے۔ سو اس باب میں ہم اپنے ایک انگریزی ہفتہ وار معاصر کے صفحہ خواتین سے بھی مدد لے رہے ہیں۔ فاضل مصنف یا مصنفہ نے دفع الوقتی کے لیے کوئی بے کار قسم کا مشغلہ تجویز نہیں کیا جیسا کہ بعض لوگ قصہ خوانی، کشیدہ کاری یا بچوں کو آمونختہ یاد کرانے وغیرہ کا مشورہ دیتے ہیں جس میں قطعاً کوئی فائدہ یا یافت کا پہلو نہیں بلکہ لکھا ہے کہ برج ری یا ماہ جوگ وغیرہ کھیلنے کی عادت ڈال لے۔ پرانے خیال کے لوگ رشک و حسد کے مارے ان کھیلوں پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور ممکن ہے اس کو جو وغیرہ بھی قرار دیں۔ لیکن ان کی پروا نہ کرنی چاہئے۔ فاضل مصنف یا مصنفہ نے لکھا ہے کہ تاش کی بازی پر پیسے ضرور لگا کے کھیلے لیکن زیادہ نہیں تھوڑے اس سے واضح ہوگا کہ جو صرف وہ ہوتا ہے بس میں زیادہ پیسے لگا کر کھیلا جائے۔ اس مضمون میں ایک اور احتیاط کی تلقین کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ ایسا بھی نہ ہو کہ ادھر میاں نے دفتر جانے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا اور ادھر بیگم صاحبہ ری کھیلنے پڑوں کے ہاں چلی گئیں اور پھر میاں کی واپسی کے بعد گھر تشریف لائیں۔ گویا صرف آٹھ سات گھنٹے کھیلنا کافی ہے۔ میاں کے دفتر سے آنے کے وقت کا اندازہ کر لیا جائے اور جو دس بیس روپے جیتے ہوں اس پر اکتفا کر کے اس

وقت تک ضرور واپس آ جانا چاہیے۔

جو خواتین زیادہ بڑی بازی لگاتی ہیں یا میاں کی واپسی کے بعد گھر آتی ہیں ان کے متعلق بھی اس مضمون میں لکھا ہے کہ وہ نکتہ چینی سے زیادہ ہمدردی کی مستحق ہیں کیا عجب ان کے جی کو کیا روگ لگا ہے جس کے فرار کے طور پر وہ شرطیں باندھ کے اور یوں جم کے ری یا برج کھیلتی ہیں۔

ایک صاحبہ نے دفع الوقتی کے لیے ایک جانور پالنے کا شغل اختیار کیا ہے۔ انہوں نے دد خرگوش پانچ چوہے، دو بلیاں ایک کتا، دس تیتھر اور دو طوطے پالے تھے جن میں سے ایک بولتا بھی ہے۔ اب ان میں سے صرف چڑیاں اور دونوں طوطے رہ گئے ہیں کیونکہ چوہوں کو بلیاں پہلے ہی روزنوش جان کر گئی تھیں اور کتے کو ناشتا دینے میں ویر ہوئی تو اس نے پچھلے منگل کو خرگوش کا صفایا کر دیا۔ یہ منیال بھی نہ کیا کہ اس روز گوشت کا ناغہ ہوتا ہے۔ بلی کو گھر سے بھگانے میں بھی اس ذات شریف کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس امر پر بحث فضول ہے کیونکہ کمیٹی والے اسے پکڑ کر لے جا چکے ہیں۔ ہم نے موصوفہ کو کئی بار تیتھر کے گوشت کے فضائل پر لیکچر دیئے ہیں کہ مزیدار ہوتا ہے اور خون صاف پیدا کرتا ہے۔ ان کے بادرچی نے بھی ہماری بات کی بار بار تائید کی ہے لیکن وہ ابھی تک متاثر ہیں۔ اس وقت ان کی توجہ طوطے کو پڑھانے پر ہے۔ وہ تو حیوان کا حیوان ہی رہا لیکن موصوفہ کو بولتا سنتے ہیں تو کئی بار شبہ ہوتا ہے کہ میاں مٹھو بول رہا ہے۔



رامائن اور مہا بھارت

رامائن رام چندر جی کی کہانی ہے۔ یہ راجہ و سرتھ کے پرنس آف ویلز تھے۔ لیکن ان کی سوتیلی ماں کیکئی اپنے بیٹے بھرت کو راجا بنانا چاہتی تھی۔ اس کے بہکانے پر راجا و سرتھ نے رام چندر جی کو چودہ برس کے لیے گھر سے نکال دیا۔ ان کی رانی سیتا کو بھی۔ ان کے بھائی بھمن بھی ساتھ ہو لیے۔ بن باس کے لیے نکلتے وقت رام چندر جی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ بس ایک کھڑاؤں تھی۔ وہ بھی بھرت نے رکھوائی کہ آپ کی نشانی ہمارے پاس رہنی چاہیے۔ اس کھڑاؤں کو بھرت تخت کے پاس بلکہ اوپر رکھتا تھا تاکہ رام چندر جی کا کوئی آدمی چڑا کے نہ لے جائے۔

منگل میں رہنے کی وجہ سے ان کو گزارے میں چنداں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ رام جی تو آخر رام جی تھے زیادہ کام ان کا دشمن یعنی برادر خور و کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ گن گن کروں گزار رہے تھے کہ کب بارہ برس پورے ہوں اور کب یہ واپس جا کر راج پاٹ سنبھالیں اور رعایا کی بے لوث خدمت کریں۔ ایک روز سب کہ رام اور بھمن دونوں شکار کو گئے ہوئے تھے نہکا کارا راجا راون آیا اور سیتا جی کو اٹھا لے گیا۔ اس پر ام چندر جی اور راون میں لڑائی ہوئی۔ گھمسان کارن پڑا جیسا کہ دسہرے کے تہوار میں پڑتا آپ نے دیکھا ہوگا۔

ہنومان جی اور ان کے بندروں نے رام چندر جی کا ساتھ دیا اور وہ راوان اور اس سے راکششوں کو مار کر جیت گئے۔ پرانے خیال کے ہندو اس لیے بندروں کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ ان کو انسانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

مہا بھارت

مہا بھارت کو روں اور پانڈوؤں کی لڑائی کی داستان ہے۔ کورو تو جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے بڑے کورچشم لوگ تھے۔ ہاں پانڈو اچھے تھے۔ اتنا ضرور ہے کبھی کبھی جو اکیلے لیتے تھے۔ اور تعدد از دواج کا رواج بھی ان میں تھا، یعنی ایک عورت کے پانچ شوہر ہو سکتے تھے۔ یکے بعد دیگرے نہیں۔ وہ تو آج کل بھی ہوتے ہیں بلکہ یک وقت درویدی پانچوں پانڈوؤں کی بلا شرکت غیرے بیوی تھی۔ چونکہ اس کا سلوک پانچوں سے یکساں تھا اس لیے ہم اس معاملے پر زیادہ اعتراض نہیں کرتے۔

مہا بھارت کے زمانے میں شادی میں ایسی مشکلات ہوتی تھیں جیسی آج کل ہوتی ہیں کہ لڑکے کا حسب نسب، جائداد اور تعلیم وغیرہ پوچھتے ہیں حتیٰ کہ ذریعہ روزگار بھی پنجابی یوپی کا سوال بھی اٹھتا ہے اور شیعہ سنی کی دیکھ پرکھ بھی ہوتی ہے۔ مہا بھارت کے سنہری زمانے میں سوکمر چاتے تھے۔ جو شخص بھی نیچے تیل کے کند میں عکاس پر نظر جمائے اور گھومتی مچھلی کی آنکھ میں تیر کا نشانہ لگاتا تھا اس کے سراپنی لڑکی منڈھ دیتے تھے۔ درویدی کے سوکمر میں ارجن نے تیر مارا جو گھومتی مچھلی کی آنکھ میں سیدھا جا لگا۔ یہ حسن اتفاق تھا ورنہ تو ایسے کرتب کے لیے آدھی کا ماہر بازی گریانت ہونا ضروری ہے ہم آپ نہیں لگا سکتے۔

کورو پانڈوؤں میں لڑائی کیوں ہوئی تھی؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ہر لڑائی کے لیے وجہ کا ہونا ضروری بھی نہیں۔ اب کچھ آنکھوں دیکھا حال اس لڑائی کا سنئے۔

خواتین و حضرات یہ کوروکشتیر کا میدان ہے جو تحصیل کیتھل ضلع کرناٹ میں واقع ہے۔ لڑائی اب شروع ہونے ہی والی ہے۔ کورو ایک طرف ہیں پانڈو دوسری طرف ہیں۔ یہ ہونا بھی چاہیے۔ دونوں ایک طرف ہوں تو لڑائی کا کچھ مزد نہ آئے۔ لڑنے والوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ میدان میں نظر آ رہے ہیں۔ بیورو ناچار یہ ہیں۔ دونوں فریقوں کے بزرگ ہیں۔ اپنا لشکر کوروؤں کو دے رکھا ہے۔ آشیر داو پانڈوؤں کو دے رکھی ہے۔ پانڈوؤں کا مطالبہ تھا کہ آپ آشیر داو کوروؤں کو دے دیں۔ لشکر ہمیں دے دیں لیکن اچار یہ جی نہیں مانے۔ یہ کون ہیں؟ یہ کرشن جی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار کرشن نہیں نہ مہاشہ کرشن بلکہ اور صاحب ہیں۔ کرشن کتھیا کہلاتے ہیں۔ ابھی ابھی گویوں کے پاس سے آئے ہیں۔ مکھن ابھی تک ہونٹوں پر لگا ہے۔ بیٹھے گیتا لکھ رہے ہیں ارجن کو اپدیش دے رہے ہیں کہ مارو، مارو، اپنوں کو مارو، جھجکونہیں۔ تاج و تخت کا معاملہ ہے مذاق کی بات نہیں، یاوے کہ کورو اور پانڈو ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اے لو کھانڈے سے کھانڈا بجنے لگا اور تھ سے تھ ٹکرا رہا ہے۔ یہ لڑائی تو لمبی چلتی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا اب ہم واپس اسٹوڈیو چلتے ہیں۔



اتفاق میں برکت ہے

ایک بڑے میاں جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کمایا بنایا تھا آخر بیمار ہوئے مرض الموت میں گرفتار ہوئے۔ ان کو اور تو کچھ نہیں۔ کوئی فکر تھی تو یہ کہ ان کے پانچوں بیٹوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ گاڑھی کیا پتلی بھی نہیں چھنتی تھی۔ لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ آخر انہوں نے بیٹوں پر اتحاد اور اتفاق کی خوبیاں واضح کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ ان کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ”دیکھو اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ سب جا کر ایک ایک لکڑی لاؤ۔“

ایک نے کہا ”لکڑی؟ آپ لکڑیوں کا کیا کریں گے؟“

دوسرے کہا ”بڑے میاں کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔“

لکڑی نہیں۔ شاید لکڑی کہہ رہے ہیں۔ لکڑی کھانے کو جی چاہتا ہوگا۔“ تیسرے نے کہا۔ ”نہیں کچھ سردی ہے۔ شاید آگ جلانے کو لکڑیاں منگاتے ہوں گے۔“ چوتھے کہا۔ ”بابو جی، کوئلے لائیں؟“

پانچویں نے کہا ”نہیں، اُپلے لاتا ہوں۔ وہ زیادہ اچھے ہیں گے۔“

باپ نے کراہتے ہوئے کہا ”ارے نالائقو! میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ کہیں سے

لکڑیاں لاؤ جنگل سے۔“

ایک بیٹے نے کہا ”یہ بھی اچھی رہی۔ جنگل یہاں کہاں؟ اور محکمہ جنگلات والے لکڑی کہاں کاٹنے دیتے ہیں؟“

دوسرے نے کہا ”اپنے آپے میں نہیں باپو جی۔ بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ۔“

تیسرے نے کہا۔ ”بھئی لکڑیوں والی بات تو اپن کی سمجھ میں نہیں آئی۔“

چوتھے نے کہا ”بڑے میاں نے عمر بھر میں ایک ہی تو خواہش کی ہے۔ اسے پورا کرنے میں کیا حرج ہے؟“

پانچویں نے کہا ”اچھا، میں جاتا ہوں۔ ٹال پر سے لکڑیاں لاتا ہوں۔“

چنانچہ دو ٹال پر گیا۔ ٹال والے سے کہا ”خان صاحب ذرا پانچ لکڑیاں تو دینا۔ اچھی مضبوط ہوں۔“

ٹال والے نے لکڑیاں دیں۔ ہر ایک خاصی موٹی اور مضبوط، باپ نے دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ بتانا بھی خلاف مصلحت تھا کہ لکڑیاں کیوں منگائی ہیں اور اس سے کیا اخلاقی نتیجہ نکالنا مقصود ہے۔ آخر بیٹوں سے کہا ”اب ان لکڑیوں کا گٹھا باندھ دو۔“

اب بیٹوں میں پھر چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ”گٹھا دو کیوں؟“

”اب رہی کہاں سے لائیں۔ بھئی بہت تنگ کیا ہے اس بڑھے نے۔“ آخر ایک نے اپنے پا جا مے میں سے ازار بند نکالا اور گٹھا باندھا۔

بڑے میاں نے کہا۔ ”اب اس گٹھے کو توڑو۔“

بیٹوں نے کہا۔ ”لو بھئی، یہ بھی اچھی رہی۔ کیسے توڑیں؟“

کلہاڑ کہاں سے لائیں؟

باپ نے کہا ”کلہاڑ سے نہیں، ہاتھوں سے توڑو، گٹھنے سے توڑو۔“

حکم والد مرگِ مفاعیات۔ پہلے ایک نے کوشش کی، پھر دوسرے نے، پھر تیسرے نے، پھر چوتھے نے، پھر پانچویں نے۔ لکڑیوں کا بال بیکانہ ہوا۔ سب نے کہا۔ ”باؤ جی! ہم سے نیس ٹوٹا یہ لکڑیوں کا گٹھا۔“

باپ نے کہا۔ ”اچھا۔ اب ان لکڑیوں کو الگ الگ کرو۔ ان کی رتی کھول دو۔“ ایک نے جل کہا ”رتی کہاں ہے، میرا ازار بند ہے۔ اگر آپ کو کھلوانا تھا تو گٹھا بندھوایا ہی کیوں تھا؟ لاؤ بھی کوئی پیئسل وینا۔ ازار بند ڈال لوں پا جاے میں۔“ باپ نے بزرگانہ شفقت سے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”اچھا، اب ان لکڑیوں کو توڑ دو۔ ایک ایک کر کے توڑو۔“

لکڑیاں چونکہ موٹی موٹی اور مضبوط تھیں، بہت کوشش کی۔ کسی سے نہ ٹوٹیں۔ آخر میں بڑے بھائی کی باری تھی۔ اس نے ایک لکڑی پر گھٹنے کا پورا زور ڈالا اور تراق کی آواز آئی۔

باپ نے نصیحت کرنے کے لیے آنکھیں یک دم کھول دیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑا بیٹا بے ہوش پڑا ہے۔ لکڑی سلامت پڑی ہے۔ آواز بیٹے کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ”یہ بڑھا بہت جاہل ہے۔“

دوسرے نے آواز دی ”نُدی۔“

تیسرے نے کہا۔ ”کھوسٹ۔ نکلی، عقل سے پیدل، گھامڑ۔“

چوتھے نے کہا ”سارے بڈھے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کجنت مرتا بھی نہیں۔“

بڈھے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بیٹوں میں کم از کم ایک بات پر تو اتفاق رائے ہوا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کیں اور نہایت سکون سے جان وے دی۔

ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاسب کے متعلق یہ خبر مشہور ہوئی ہے کہ کوئی ظالم ان کا سرمایہ علم و فضل اور دولتِ صبر و قرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے۔ تفصیل مالبہ مسروقہ کی یہ ہے ایک ڈگری بی۔ اے کی۔ ایک ایل ایل بی کی۔ ایک کیریئر سرٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا کبھی جیل نہیں گیا۔ اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے۔ لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا۔ الماری کا تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا یہ سہواً خود ان کے پاس چلے گئے ہوں۔ وہ براہ کرم واپس کر دیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی اور صاسب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچہ آمد و رفت بھی پیش کیا جائے گا۔ حلیہ یہ ہے۔ چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے۔ گلشن علی سمرقندی، سابق سواگر شکر قندی۔ مقیم گوالمنڈی۔ بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے۔ وکیل صاسب۔ شوق سے کاروبار جاری رکھیں۔ وکالت علم و عقل بلکہ زبان سے کی جاتی ہے۔ ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا۔ فصاحت کے بتائے گھولنے لگا۔ لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں۔ بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔ آناں را کہ ایں وہند۔ آں نہ وہند۔ آپ نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ادب اور آرٹ کے

اس روزموز پر ایسی مدبرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ وانا اندر آں حیراں بماند۔ جتنا بڑا عہدہ وار ہوگا۔ اتنی ہی اونچی بات کرے گا۔ نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا۔ ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سر چڑھ کر بولتے دیکھا۔ ایک ہمارے مہربان ہیں۔ اردو زبان و ادب کے پروفیسر۔ ایک روز دست نگر کو دست نگر پڑھ رہے تھے۔ اور ”استفادہ حاصل کرنا“ بول رہے تھے۔ ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا۔ لیکن وہ بکھر گئے اور پوچھنے لگے۔ کتنا پڑھے لکھے ہوتم؟ ہم نے کہا کچھ بھی نہیں بس حرف شناس ہیں۔ الف بے آتی ہے۔ بیس تک گن بھی لیتے ہیں۔ اس پر وہ اندر سے دوفریم شدہ چوکھٹے اٹھالائے..... ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی۔ دوسری پی ایچ ڈی کی۔ بولے اب کہو تمہارا کہا سند ہے یا ہمارا فرمایا ہوا۔ اُس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دست نگر، چشم دید، دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہی بولنے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفیکٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ اس زمانے کے لوگ بیمار لاجی سرٹیفیکٹ کے بغیر ہو جایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات تو شدتِ مرض سے سر بھی جایا کرتے تھے۔ اب کسی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو، بلا سرٹیفیکٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سرٹیفیکٹ کے شائستہ ہوا کرتے تھے۔ اب جس کے پاس کیریئر سرٹیفیکٹ نہیں سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں۔ اس کی نیک چلنی مشتبہ اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفیکٹ پر ہے۔ سانس کی آمد و شد پر نہیں۔ آپ نے اُس شخص کا قصہ سنا ہوگا جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا۔ جون کی پنشن تو اُسے مل گئی کیونکہ اُس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقید سیات ہونے کا سرٹیفیکٹ تھا۔ لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفیکٹ لاؤ گے تب ادا کی جائے گی۔ اصول اصول ہے۔ اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جاسکتا ہے کہ جو شخص جون میں زندہ ہے، اس کے مئی

میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے۔ باقاعدہ سرفیکٹ ہونا چاہیے۔

عشق کا ریت کہ بے آ و وفاں نیز کند۔ وکیلوں کے لیے بے شک ڈگری کی پابندی ہے۔ اسی لیے وہ ڈگریاں چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تری قدرت کا تماشا دیکھے۔ آپ نے اُن میر صاحب کا ذکر سنا ہے جو ہاتھ میں چھری لئے پھندے دار ٹوپی پہنے، بغل میں بستہ مارے کچھری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی اُن کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی.....

مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔ ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جانداد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مدعی کا وکیل تیار نہ تھا۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہوگی۔ گواہ پیش کیے جائیں۔ ورنہ یک طرفہ ڈگری دیتا ہوں۔ وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ فوراً انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا تو وقت ہی نہ تھا۔ بس اتنی بھٹک کان میں پڑی کہ کوئی سان بہادر رضاعلی مر گئے ہیں۔ ان کی جانداد کا قصہ ہے یہ کون تھے..... کیا تھے؟ جھگڑا کیا ہے۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ..... یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ ابھی ان کے قدم اُکھاڑ دوں گا۔ جرح..... شروع کر دی۔

”میر صاحب۔ آپ خان بہادر رضاعلی مرحوم کو جانتے تھے؟“

میر صاحب نے فرمایا۔ ”اجی جاننا کیا معنی..... دانت کاٹی روٹی تھی۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے بھرتی ہے۔“

”کیا عمر تھی ان کی۔؟“

”بس چالیس اور اسی کے درمیان ہوں گے۔ بدن چور تھے اسی لیے صحیح اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ وہ لائے تھے یا نالے۔“

میر صاحب نے کہا۔ ”منوب لانا قد تھا۔ لیکن ازراہ خاکساری جھک کر چلتے

تھے۔ اس لیے نالے معلوم ہوتے تھے۔“

دکیل نے دوسرا سوال داغنا..... ”ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں۔ گورے تھے یا کالے۔“

میر صاحب نے کہا۔ ”خوب سُرخ و سفید رنگت تھی۔ لیکن بیماری کے باعث جلد

سنولا جاتی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔“

دکیل نے ایک اور وار کیا..... ”یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھ رکھتے تھے یا صفا چٹ

تھے۔“ میر صاحب ہنسے اور کہا۔ ”مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی۔ کبھی جی میں آیا تو

مونچھیں رکھ لیں۔ وہ بھی کبھی پتلی۔ کبھی سمجھے دار۔ داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے شخصی کبھی

یک مشت۔ کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آتی تو سب کچھ منڈا صفا چٹ ہو جاتے

تھے۔“ ”اچھا داڑھی آپ نے ان کی دیکھی ہوگی۔ سفید ہوتی تھی یا کالی۔“

میر صاحب نے کہا۔ ”ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو

بالکل کالی نظر آتی تھی۔ ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی۔ دکیل صاحب کہہ دیا نا کہ

باغ و بہار آدمی تھے۔“

دکیل صاحب نے کہا..... ”اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔“

میر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا..... ”رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ

ہوئی۔ ڈاکٹر کچھ کہتے تھے۔ حکیم کچھ۔ مرگ چو آید طبیب ابلہ شود ام تو یہی کہیں گے کہ

ان کو مرض الموت تھا۔ ہائے کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی۔ ان

کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ ”اچھا۔ اب دوسرے مقدمے کی باری ہے۔ اگلی بدھ کو دوسرے

گواہان پیش ہوں۔“

☆☆☆

التماس متضمن بہ اجازت برائے فیملی پلاننگ

حضور انور!

ہم دیار پاکستان کے کھٹنڈ و پلٹ خاندانی اور اکیسری حکیم اور عطائی درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں شہریوں کے جان و مال سے کھیلنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔
جناب والا! اس ملک میں آبادی بہت بڑھ رہی ہے۔ اور فیملی پلاننگ کا محکمہ چنداں کامیاب نہیں رہا۔ چونکہ ہماری قوم کے لیے اس سرے سے فیملی پلاننگ کرنا مشکل ہے اور شاید خلاف شرع بھی ہے لہذا دوسرے سرے سے کوشش کرنی چاہیے۔ حضور والا! آپ پر روشن ہے کہ ہم نے خاندانوں کے خاندانوں کا صفایا کر دیا ہے۔ مشک آنست کہ خود بویہ کراچی اور لاہور کے وسیع قبرستان ہمارے دعوے کا زندہ ثبوت ہیں۔
جناب والا! قبرستان کے ساتھ زندہ کا لفظ ہم لطف زبان کے لیے لائے ہیں کیونکہ ہماری سرکار و دولت مند کو زبان سے یعنی زبانوں کے مسائل سے بھی گہری اور فیملی و لچپی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ ہم زندہ آدمی کو قبرستان میں گاڑ دیتے ہیں۔

جناب والا! ایک دیرینہ مطالبہ ہمارا یہ ہے کہ ہمیں اپنے مطلب کے اندر ہی لٹھے

مٹک کا فوز اگر بتیوں اور سنگ مرمر کے اسٹور کھولنے کی اجازت دی جائے تاکہ ہمارے مریضوں کے لواحقین کو دور نہ جانا پڑے، تکلیف نہ ہو۔

اجازت دی جائے شہر کا امن تباہ کرنے کی

حضور والا!

ہم شہر ہڈا کے شہر پسند شہر کا امن تباہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں جو ہمیں امید ہے ضرور عطا کی جائے گی۔

جناب والا! حکیم الامت نے فرمایا ہے کہ۔

پلٹ کر جھپٹنا، چھٹ کر پلٹنا ☆ لبو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ
آپ تسلیم کریں گے کہ جس قوم کے لوگ آپس میں نہیں لڑ سکتے، وہ باہر والوں سے
کیا لڑیں گے۔

جناب والا! امن کو دور ہم بڑھ کرنا ہمارا کاروبار ہے اور روز افزوں گرائی نے ہماری
کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ چاقو اور خنجر منگے ہو گئے ہیں اور لائٹھیاں تک کیونکہ بانس مشرقی
پاکستان سے آتا تھا۔ اگر سرکار ہمیں ڈنڈے چاقو اور ناجائز اسلحہ رعایتی نرخوں پر مہیا
کرے تو غریب نوازی یعنی شہرینوازی ہوگی۔

☆☆☆

ذکر کاہلی کا

ہمارا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا ذکر پطرس نے اپنے مضمون ”موریے جوکل آنکھ صیری کھلی“ میں کیا ہے۔ اگر یہ مضمون ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے کا نہ ہوتا، اگر پطرس مرحوم کے نیاز بھی حاصل رہے ہوتے۔ تو یہی سمجھتے کہ انہوں نے یہ ہمارے بارے میں لکھا ہے۔ اٹھنا نمبر ایک اور اٹھنا نمبر دو ہمیشہ سے ہماری زندگی کا معمول رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم نے پطرس کے ہیرو کی طرح سورج کو کبھی طلوع ہوتے دیکھا ہی نہیں۔ کئی بار دیکھا ہے۔ فلموں میں بڑا اچھا لگتا ہے۔

جوش اور جگر دونوں بڑے شاعر ہیں۔ لیکن ہمارا ذاتی رجحان ہمیشہ جگر کی طرف رہا ہے۔ شاعر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ ہماری ہی طرح کے تھے۔ چرند پرند اور جوش طبع آبادی کی طرح علی الصباح نہیں اٹھ بیٹھتے تھے۔ ارے بھئی وہی تو وقت چڑیوں کے چچھانے کا ہوتا ہے۔ جو لوگ نور کے تڑکے چھڑی لیے باغ میں جا پہنچتے ہیں۔ وہ ان... بے زبانوں کے معمولات میں غل ہوتے ہیں۔ جگر صاحب سے بھی ہم کبھی نہیں ملے لیکن ایک بار ان کے قلم سے یا کسی اور کے قلم سے ہم نے پڑھا ہے کہ بھوپال میں ان لوگوں نے یہی جگر صاحب اور ان کے دوستوں نے ایک انجمن الکبلا قائم کی تھی۔ گھلا، کاہل کی جمع ہے۔ جو ہمتا بڑا مندی اور خدائی خوار ہوتا تھا، اتنا ہی اس انجمن میں یا

کلب میں ذی مرتبت سمجھا جاتا تھا۔ کہ انجمن کے دفتر میں ایک قالین بچا تھا۔ یہ لوگ وہاں پہنچ کر کھڑے کھڑے گر پڑتے تھے۔ کیونکہ کھڑے سے بیٹھنا اور بیٹھنے کے بعد لیٹنا ایک محنت طلب امر ہے۔ ناحق کا تکلف ہے اور آداب کا ہلی کے خلاف ہے۔ دن بھر یہ لوگ وہاں اپنی کاہلی کے نشے میں غین پڑے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی شخص آ کر ان کے منہ میں پانی ڈال جاتا تھا۔

سچ یہ ہے کہ کاہلی میں جو مزہ ہے وہ کابل ہی جانتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے والے اور صبح سویرے اٹھنے والے اور ورزش پسند اس مزے کو کیا جانیں۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں دیکھیے ہمارے قبیلے میں کیسا کیسا آدمی ہوا ہے۔ غائب بھی ”بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے“ کے قائل تھے۔ میر صاحب یعنی میر تقی میر بھی اپنے حجرے میں قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی اپنے حجرے کی کھڑکی بھی نہ کھولی۔ کیونکہ کھولنا بھی ایک طرح کا کام ہے بلکہ یہاں تک سنا ہے۔ اور کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔ ”میر صاحب یہ کھڑکی کھول لیا کیجیے۔ باہر کی ہوا آیا کرے گی۔ اور اس طرف بانٹ بھی ہے۔“ حیران ہو کر بولے۔ ”اتھا میرے کمرے میں کوئی کھڑکی بھی ہے۔“ میر اور غالب تو خیر پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ ہمارے حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال کے متعلق بھی ہم نے کبھی نہیں پڑھا کہ چاق و دھبہ بند آدمی تھے۔ یہی معلوم ہوا کہ تہہ باندھے چارپائی پر لیٹے رازی کے نکتہ ہائے دقیق پر غور کرتے رہتے تھے اور جھ پیتے رہتے تھے اس صبح خیز طبقے نے کوئی اتھا بڑا شاعر پیدا کیا ہو تو ہمیں اس کا نام بتائیے۔ تعارف کرائیے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا نے جو دلی کے چوروں پر مثنوی لکھی ہے اس میں صبح اٹھنے والوں کو کچھ اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا۔ ملا مسجد کا صبح خیز یا ہے۔ ایسا ہی کوئی مصرعہ ارشاد کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ان کا یعنی ایسی مثنوی کے ممدوحوں کا ساتھی ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اہل مغرب میں سارے لوگ موجد اور سائنس داں ہی نہیں

ہیں بلکہ بہت سے ہمارے قبیلے کے ہیں۔ بلکہ ایسے کہ ہمارے قبیلے کے لیے باعث نازش۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ وہاں کابلوں کے باقاعدہ کلب ہیں جن میں کابل لوگ بوجہ کابلی کبھی نہیں جاتے۔ جو شخص چلا جائے اُسے مستعد جان کر اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے۔ ہم نے جوش ملیح آبادی صاحب کا وہ نظام اوقات پڑھا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ باغ میں ملے گا۔ اور فلاں وقت اُسے سے خانہ میں تلاش کیجیے۔ اور فلاں وقت نہ جانے کہاں۔ اس کلب والوں نے جن کا نام

BORN-TIRED-ASSOCIATION

یعنی پیدائشی تھکے ماندوں کی انجمن ہے۔ ”مثالی زندگی کا نظام اوقات یہ مقرر کیا ہے کہ چوبیس سے دس گھنٹے تو سونا ہی چاہیے۔ باقی رہے چودہ گھنٹے ان میں آٹھ گھنٹے آرام کے لیے وقف رہنے چاہئیں یعنی آدمی لیٹا اکڑتا رہے۔ کچھ کام نہ کرے۔ باقی رہے چھ گھنٹے اس میں سے چار گھنٹے کھانے کے لیے وقف رہنے چاہئیں۔ کھانا اور جگالی کرنا بھی تو ایک زندگی کی مشرتوں میں سے ہے۔ نوالے زہر مار کر نا تو کھانے کی تعریف میں نہیں آتا۔ باقی رہے دو گھنٹے یہ انجمن تو ان میں بھی کسی قسم کے کام کا منہا پسند نہیں کرتی لیکن خیر کوئی ان میں کام کرنا چاہے تو اعتراض بھی نہیں کرتی۔ ہمارے خیال میں تو اس میں سے بھی کچھ وقت نہانے شیو کرنے اور حاجات ضروریہ اور غیر ضروریہ کی مد میں نکل جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ مغرب کے کابل لوگ ان تکلفات کو ضروری سمجھیں۔ یاد رہے کہ اس کلب کے ۳۵ ہزار ممبر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو انجمن سازی بھی تکلف اور کابلی کے اصولوں کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ فارم بھرنا فیس دینا، دستخط کرنا وغیرہ۔ ایک بار تین کابلوں میں مقابلہ ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی کابلی کا کوئی قصہ سنائے جو سب سے زیادہ کابل ہو وہ انعام پائے۔ ایک نے اپنا قصہ بیان کیا کہ بیر کو اٹھا کر منہ میں ڈالنے کے لیے یعنی کسی راہ گیر کی خدمات حاصل کیں۔ دوسرے نے اس سے زیادہ دُوں کی لی..... تیسرے کے سامنے شمع پہنچی تو بولا یار! قصے تو کئی ایک

ہیں۔ لیکن کون سنائے؟ پس انعام کا حق دار یہی تیسرا ٹھہرا۔
☆☆☆

ہمارے ہاں کلب کا مطلب صرف نائٹ کلب سمجھا جاتا ہے۔ یا شراب نوشی اور رقص و تفریح کا اڈہ۔ یہ بات نہیں مغرب کے ملکوں میں شام کو گھر میں گھسے بیٹھے رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایران اور ترکی تک میں لوگ شام اترتے ہی سیر و تفریح کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اور شام کا چوگا بھی باہر ہی کھاتے ہیں۔ جو کلبوں کے ممبر ہیں، وہ وہاں جا کر کچھ کھیتے ہیں۔ کچھ پڑھتے ہیں۔ کچھ گپ کرتے ہیں۔ مغرب میں چینا پلانا بھی آداب زندگی میں داخل ہے۔ لہذا پی بھی لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھار زیادہ بھی پی لیتے ہیں۔ بعض تو اپنے پاؤں چل کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ بعض کو ڈنڈا ڈوٹی کر کے لانا پڑتا ہے۔
☆☆☆

آپ میں سے بہت سوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی کہانی ”خوشی کا کلب“ پڑھی ہوگی۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اسی نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کلب کے ممبر بننے والے اپنی جان سے بیزار بے شک ہوتے تھے لیکن اپنی جان آپ لیتے ڈرتے تھے۔

خوشی کے لیے ہمت چاہیے۔ اس کلب کا کام ان کی بے ضرر موت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اخبار میں آتا تھا کہ فلاں شخص کار کے نیچے آیا اور سر گیا۔ فلاں دریا میں ڈوبا پایا گیا۔ شاید مخموری میں ٹپل سے گزر رہا تھا۔ پاؤں ریٹ گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی اور حادثہ گزرا۔ لیکن اصل میں یہ سارے اس کلب کے کارنامے ہوتے تھے۔ خیر وہ تو ایک قصہ تھا۔ ہمیں معلوم نہیں خود کشی کے کلب سچ بچ ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے لیکن اسی طرح ایک کہانی سر آرتھر کانن وائل کی بھی ہے جس میں شرلاک ہومز صاحب اپنا کارنامہ دکھاتے ہیں۔ اس کا نام ہے ”لال سروالوں کی انجمن“ صرف سُرخ بالوں والے اس کی خدمات سے متع ہو سکتے تھے۔ شرلاک ہومز کے تفتیش کرنے پر یہ سارا کارخانہ فراڈ ثابت ہوا۔ لیکن گنجوں کے کلب ~~قصہ~~ ہیں۔

داخلے جاری ہیں

پرسوں ایک صاحب تشریف لائے۔

بے رند سے زاہد کی ملاقات بُرائی

پہلے بریلی کو بانس بھیجا کرتے تھے۔ یہ کاروبار کسی وجہ سے نہ چلا تو کوٹلوں کی ولالی کرنے لگے۔ چونکہ صورت ان کی محاورے کے عین مصداق تھی ہمارا خیال تھا اس کاروبار میں سرخ رو ہوں گے۔ لیکن آخری بار ملے تو معلوم ہوا زسری کھول رکھی ہے۔ پووے اور کھاو بیچتے ہیں۔ پھوٹوں کے علاوہ سبزیوں کے بیج بھی ان کے ہاں سے با رعایت مل سکتے ہیں۔

آتے ہی کہنے لگے ”دس روپے ہوں گے؟“

ہم نے نہ دینے کے بہانے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

”کیا ضرورت آن پڑی ہے؟“

فرمایا۔ ”اپن ادبی ذوق کے آوی ہیں، اپن سے اب گھاس نہیں کھودی جاتی۔ کھاد اور پود نہیں بچی جاتی۔ اب ہم ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس سے قوم کی خدمت بھی ہو۔“

ہم نے کہا۔ ”دس روپے میں اسکول کھولے گا؟“

بہت ہنسے اور بولے ”آچھی رہی۔ بھلا دس روپے میں بھی اسکول کھولا جاسکتا ہے۔ دس روپے سیرے اپنے پاس بھی تو ہیں۔ دیکھیے سیدھا سیدھا حساب ہے۔ ایک دس

روپے کا تو بورڈ لکھوایا جائے گا۔ بورڈ کیا کپڑے پہ نام لکھوانا ہی کافی ہوگا اور دوسرے دس روپے سے جو آپ مجھے دیں گے میں شہر کی دیواروں، پلیوں، بس اسٹینڈوں وغیرہ کے چہرے پر کالک پھیروں گا۔ یعنی اپنا اشتہار لکھواؤں گا کہ اے عقل کے اندھو۔ گانٹھ کے پور آؤ کہ داخلے جاری ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ جو تم لوگوں کے لیے پتے گھروں کی دیواروں کو کالی کوچی پھیر کر خراب کر دے گا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تمہیں۔ کارپوریشن نہیں ردکتی، پولیس نہیں ٹوکتی؟“

بولے ”پہلے یہ لوگ ملاوٹ کو تو ردک لیں۔ عطائیوں اور گدا گردوں کو تو ٹوک لیں۔ شہر سے گندگی کے ڈھیر تو اٹھوا لیں۔ کتے تو پکڑا لیں اور چھبرد ملکیوں کے منہ تو آ لیں۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ بھی سچے ہیں۔ ان لوگوں کی مصروفیت کا ہمیں خیال ہی نہ رہا تھا۔ اچھا اگر یونین کمیٹیوں کو خیال آ گیا کہ ان کا محلہ اُجلا ہونا چاہیے۔“

ٹھٹھا مار کر بولے ”یونین کمیٹیاں؟ یہ کون لوگ ہوتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں؟“

ہم نے کھسیانے ہو کر پوچھا۔ ”آپ کے پاس اسکول کے لیے عمارت بھی ہے۔ خاصی جگہ درکار ہوتی ہے۔ آپ کا گھر تو جہاں تک ہمیں معلوم ہے ۱۳۳ گز پر ہے۔“

فرمایا ”دہ ساتھ دالا پاٹ خالی ہے نا؟ جس میں ایک زمانے میں بھینسیں بندھا کرتی تھیں۔ بچوں سے تین تین ماہ کی پیشگی فیس لے کر اس پرائیمن کی چادریں ڈلوالیں گے۔ فی الحال تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ اوپن ایر ٹھیک رہے گا۔ سنارے شانتی ٹکیتن میں بھی کھلے میں کلاسیں لگتی تھیں۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ کی بات کچھ ہمارے جی نہیں لگتی۔ بارشیں آنے والی ہیں۔ ان میں اسکول بہ گیا تو؟“

سوچ کر بولے۔ ”ہاں یہ تو ہے۔ جگہ تو اپنی نرسری کے سامان میں بھی ہے بلکہ اسکول کھولنے کا خیال ہی اس لیے آیا کہ کئی والدین نرسری کا بورڈ دیکھ کر آئے اور کہنے

لگے۔ ہمارے بچوں کو اپنی نرسری میں داخل کرلو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ وہ نرسری نہیں بلکہ پھولوں پودوں والی نرسری ہے۔ لیکن وہ یہی زور دیتے رہے کہ اسکولوں میں تو داخلہ ملتا نہیں، یہیں داخل کرلو ہمارے بچوں کو کم از کم ہالی کا کام سیکھ جائیں گے۔“ ہم نے کہا ”کس درجے تک تعلیم ہوگی؟“

فرمایا ”میٹرک تک تو ہونی ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ کے۔ جی اور منگمری اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”مائیسوری سے مطلب ہے غالباً۔“

فرمایا ”ہاں ہاں... مائیسوری۔ میرے منہ سے ہمیشہ منگمری ہی نکلتا ہے۔“

”پڑھائے گا کون؟“ ہم نے دریافت کیا۔

بولے۔ ”میں جبر ہوں اور کون پڑھائے گا۔ اب مشق چھٹی..... ہوئی ہے درنہ بدل تو بندے نے بعض اچھے نمبروں میں پاس کر رکھا ہے۔ اے۔ بی سی تو اب بعض پوری آتی ہے۔ سناؤں آپ کو؟“

”اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ای۔“

ہم نے کہا۔ ”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کی اہلیت میں کسے شک ہے۔ لیکن آپ تو پرنسپل ہوں گے پھر آپ کی دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ یہ پھول پودے کا کاروبار بھی خا خا نفع بخش ہے۔ یہ بھی جاری رہنا چاہیے۔“

”بولے۔“ ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ خیر ساٹھ ستر روپے میں کوئی بی اے۔ ایم اے۔ پاس ماسٹر یا ماسٹری رکھ لیں گے۔ جب تک چاہا کام لیا۔ چھٹیاں آئیں نکال باہر کیا۔ بلکہ ہمارے اسکول میں تو تین کے بجائے چھ ماہ کی چھٹیاں ہوا کریں گی تاکہ بچوں کی صحت پر پڑھائی کا کوئی برا اثر نہ پڑے۔“

”نام کیا رکھا ہے اسکول کا؟“ ہم نے پوچھا۔ ”مدرسہ تعلیم الاسلام اقبال ہائی اسکول وغیرہ؟“

بولے۔ ”جی نہیں۔ نام تو انگریزی چاہیے۔ فرسٹ کلاس کا ہو بس سے معلوم ہو کہ

ابھی ابھی انگریزوں نے آ کر کھولا ہے۔ کسی سینٹ کا نام تو اب خالی نہیں سینٹ جوزف سینٹ پیٹرک سینٹ یہ سینٹ وہ... سب ختم ہوئے۔“

ہم نے کہا۔ ”سینٹ سائنس ٹیچر ہو سکتا ہے۔“

غور کر کے کہنے لگے۔ ”نہیں ہمارے اسکول میں جاسوسی کی تعلیم نہیں دی جائے“ پھر آکسفورڈ کیمبرج وغیرہ کے نام پر رکھیے۔“

فرمایا۔ ”یہ بھی بہت ہو گئے بلکہ لٹل فوکس اور چلڈرن ہوم اور گرین وڈ وغیرہ بھی کئی ایک ہیں۔ میرا ارادہ ”ہمپٹی انگلش اسکول“ نام رکھنے کا تھا۔ لیکن وہ بھی کسی نے رکھ لیا۔ آج سارے ناظم آباد کی پلیوں پر یہی لکھا دیکھا۔“ اس پر ہمارے ذہن میں ایک نکتہ آیا۔ ہم نے کہا۔ ”ہمپٹی ڈمپٹی دو بھائی تھے۔ بھائی نہیں تھے تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تو تھے ہی۔ آپ نہلے پہر بلا مارے۔“ ”ڈمپٹی انگلش اسکول“ نام رکھیے۔ اس میں بچت بھی ہے۔ نیا اشتہار لکھوانے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔“

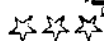
”وہ کیسے؟“ ازراہ اشتیاق پوچھنے لگے۔

ہم نے کہا۔ ”پینٹر سے کہیے کہ رات کو کوچی لے کر نکلے۔ ہمپٹی کی ”ڈ“ پر کوچی پھیرتا جائے اور اسے ”ڈ“ بناتا جائے۔ سفیدی برائے نام خرچ ہوگی۔ دو تین روپے سے زیادہ نہ ویتجیے گا پینٹر کو۔“

بولے ”بات تو آپ بھی کبھی کبھی ایسی کر جاتے ہیں۔“

دانا اندر آں حیراں بمائد
مفت اور مفید مشورے کا شکریہ۔ لیکن وہ وکس روپے تو دلوائیے اور ایک پان کھلوائیے۔ ”ڈبل کتھے چوڑے کا۔“

یوں اسکول کھل گیا اور یوں اسکول کھل رہے ہیں۔ جس کا لکڑیوں کا ٹال نہ چلا اس نے اسکول کھول لیا اور جس کی فرسری کے پودے نہ کہے اس نے بھی اسکول کھول لیا۔ اسکول بڑھتے جاتے ہیں تعلیم گھنتی جاتی ہے۔ خیر اس میں نقصان بھی کچھ نہیں۔ آج تک کسی کا تعلیم سے کچھ بنا بھی ہے؟



ایک دن ڈاکٹر بال جبریل کے ہاں

پرانے زمانے میں آج سے تیس چالیس برس پہلے اگر کوئی آدمی بیمار ہوتا تھا تو ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا۔ ڈاکٹر اسے دیکھتا تھا اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ اسے دوا دیتا تھا اور ہدایت کرتا تھا کہ جا کر بستر میں لیٹ جاؤ آرام کرو۔ مریض بستر میں جا کر لیٹتا تھا۔ آرام کرتا تھا۔ دوا پیتا تھا اور یا تو صحت یاب ہو جاتا تھا یا پھر صحت یاب نہیں ہوتا تھا۔

لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ سائنس اور طب کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال نہیں رہی۔ اب یہ ہوتا ہے کہ پہلے مریض ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے جو کنسلٹنگ ڈاکٹر کہلاتا ہے۔ ماہر یا مشیر کہہ لیجیے۔ وہ اسے دیکھ کر ہوں ہاں کرتا ہے اور اسے دل کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر امراض قلب کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں سے دلپسی پر خون کا معائنہ کرنے کے لیے خون کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔ پیشاب کا معائنہ کے لیے پیشاب کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔

مریض اتنے میں جھنجھلا جائے تو اس کے دماغ کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر دماغ یا ماہر نفسیات کی طرف ہانک دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے آپریشن کی ضرورت ہو تو ایک ماہر اسے انجکشن دے کر یا کلوروفام سنگھا کر بے ہوش کرتا ہے اور اس کے بعد زیادہ

تر یہ ہوتا ہے کہ مریض صور اسرافیل کی آواز سن کر اٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ فرشتے اس کا حساب کتاب لینے کے لیے رجسٹر لیے کھڑے ہیں۔

یہ سب تو ہوا۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے پیشوں میں بھی یہی خصوصی ماہرین کی ریل پیل ہوگئی تو کیا ہوگا۔ یہ لیجیے۔ یہ اللہ و تہ صاحب ہیں۔ یہ دو گھنٹے سے ”ڈاکٹر بال جبریل“ ماہر مویات یعنی بالوں کے اسپیشلسٹ کے کلینک میں بیٹھے باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ آخر ایک چوب دار آواز لگاتا ہے۔ ”مسٹر آلوشور بہ!“

اللہ و تہ صاحب احتجاج کرتے اٹھتے ہیں اور چوب دار کو بتاتے ہیں کہ میرا نام آلو شور نہیں ہے اللہ و تہ جنجوش ہے۔

اب مریض یا جو کچھ لہجی اسے آپ کہیں ڈاکٹر بال جبریل کی حضوری میں پیش ہوتا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ کاغذ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈگریاں ختم نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر ایک نظر مریض کے چہرے پر ڈالتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کچھ بال مریض کے چہرے پر نکل آئے ہیں۔ کچھ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم وہ اس سے سوال کرتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں اس کے والدین کے بارے میں اس کی اولاد کے بارے میں کہ بچے کہاں کہاں پڑھتے ہیں۔ اس کے پیشے کے بارے میں پسند کے بارے میں۔ پھر ایک محدب شیشہ لے کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے سمجھ گیا سمجھ گیا آپ نے کب سے شیدائیں کی۔

مریض بتاتا ہے کہ ”دودن سے نہیں کی۔“

ڈاکٹر کہتا ہے۔ ”میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آپ کو شیو کرانے کی ضرورت ہے۔“

مریض کا چہرہ لٹک جاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا فرض اس کے مرض سے آگاہ کرنا ہے۔ خواہ وہ حقیقت کتنی ہی خوف ناک کیوں نہ ہو۔ اسے خود بھی اپنے

بار۔ میں یہی شبہ یا گمان تھا۔ بیوی نے بھی یہی بتایا تھا لیکن وہ تو عورت ذات ہے۔ دل میں دبدبا تھی کہ شاید ڈاکٹر کچھ اور بتائے۔ چھ اور تشخیص کر دے۔ شاید اسے مہلت دے اور اسے حقیقت کا سامنا فوراً نہ کرنا پڑے۔ مریض میمانا ہے اور ڈاکٹر تلپوچھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کیا اسے ایک دو دن کے لیے ملتی کر سکتا ہوں۔ آج کل دفتر میں کام زیادہ ہے۔ فرصت نہیں۔ اسپیشلسٹ سختی سے کہتا ہے۔ میں نے کہا۔ یادنا کہ تمہیں شیو کی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اسے ملتی کر دو۔ لیکن پھر نتائج کا فائدہ وار میں نہ ہوں گا۔“

مریض نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ ”اچھا اگر یہی بات ہے تو میں تیار ہوں۔ کرو بیجی میری شیو۔“

ڈاکٹر بال جبریل ماہر مونیات مسکرایا۔ اس نے کہا۔ ”جناب میں شیو نہیں کرتا میں تو صرف بالوں کا ماہر ہوں۔ میں تو تشخیص کرتا ہوں۔ اب آپ کو ماہر ریش و برت ڈاکٹر سلمانی کے پاس بھیجتا ہوں۔“ اس نے گھنٹی بجائی، اس کی سیکرٹری دوڑی دوڑی آئی۔ ”مس زلف وراز۔ ان صاحب کے نام کا کارڈ بنا دو شیونگ روم کے لیے۔ اگر ڈاکٹر سلمانی ہوں تو ان سے کہو ان کے چہرے پر سوریائی کا عمل بذریعہ مقررہ وسیع کریں اور حفاظتی کے لیے شائد صد وندانہ کا استعمال کریں۔“

مسٹر اللہ ونا اور تو کچھ نہ سمجھے تیغ کے نام پر گھبرائے، انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ استرے کا اصطلاحی نام ہے۔ تاہم چپ رہے کہ اب جو ہو سو ہو۔ اتنا ضرور پوچھا کہ ”کیا اس کے لیے مجھے بے ہوش کیا جائے گا۔ کلوروفام سنگھایا جائے گا؟“

ڈاکٹر صاحب نے پھر تبسم کیا اور کہا۔ ”میری دانست میں اس کی ضرورت نہیں لیکن زیادہ صحیح ڈاکٹر سلمانی ہی بتا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مس زلف وراز۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجنے سے پہلے انہیں ماہر صاحبیات کے پاس لے جاؤ وہ ان کے

چہرے پر صابن لگائیں۔ ماہر تولیات ان کے گلے میں تولیہ باندھیں۔“
 سیکریٹری نے کچھ ڈاکٹر صاحب کے کان میں کہا۔ انہوں نے فکر مند ہو کر کہا۔ ”یہ تو
 افسوس کی بات ہے کہ ماہر صانیات گھٹنے بھر بعد ملیں گے۔ دونوں ایک مریض کے
 ساتھ مصروف ہیں۔ بڑا سنگین کیس ہے۔ پوری داڑھی صاف کرنی ہے۔ اور ہاں مس
 زلف وراز۔ ڈاکٹر سلمانی تو داڑھی مونڈیں گے۔ کان کے اوپر کے بال صاف کرنے
 کے ماہر ڈاکٹر وراز گوش بھی ہیں یا آج نہیں آئے۔“

مریض نے کہا۔ ”کیا اس کے لیے علیحدہ اسپیشلسٹ ہے داڑھی مونڈنے والا
 کانوں کے آس پاس کے بال صاف نہیں کر سکتا۔“
 ڈاکٹر بال جبریل نے کہا۔ ”بعض لوگ کر لیتے ہیں لیکن خطرہ رہتا ہے کہ قینچی سے
 کان کی لونڈ کٹ جائے۔ تم جانو آج کل جحامت کی سائنس بھی کافی ترقی کر گئی ہے۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ مریض نے راضی بہ رضا ہو کر کہا۔

”اس کے بعد ان کو ماہر شموپیات کے پاس جانا ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے امراض
 قلب کے ماہر کے پاس ہو آئیں۔ یا شاید اس کی ضرورت نہ ہو۔ آپ بٹے کئے معلوم
 ہوتے ہیں۔ بعض لوگ دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کا شمو کیا جائے تو بے ہوش
 ہو جاتے ہیں اور چپ کی جائے تو بعض اوقات جاں بر نہیں ہوتے۔ اور اس سارے
 عمل کے بعد میرے خیال میں جلانے پا پوش کی ضرورت بھی پڑے گی۔“
 مریض کے کان کھڑے ہوئے لیکن سیکریٹری صاحبہ نے دلاسا دیا کہ مطلب بوٹ
 پالش سے ہے۔

اب مریض نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب فیس۔ مشورے کی فیس۔“
 ڈاکٹر نے میر چشتی سے کہا۔ ”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ سیکریٹری صاحبہ وصول کر کے
 ہی آپ کو جانے دیں گی۔ ایمر جنسی کے لیے وردازے پروو پہلوان بھی آپ نے

دیکھے ہوں گے۔ اچھا خدا حافظ۔ اگلے آدمی کو آواز دو۔“

اور جب بے چارے اللہ و تاح صاحب ان سارے مراحل سے فارغ ہو گئے۔ واڑھی گھٹوا چکے اور چپی کراچٹے تو ”جلائے پاوش“ کے شعبے میں آئے۔ وہاں ایک لڑکا بوٹ پالش اور برش اور صافیا وغیرہ لیے بیٹھا تھا۔ مسٹر اللہ و تاح نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک کام تو ایسا ہے۔ مس میں ماہرین کی ضرورت نہیں۔ پرانی چال پر چل رہا ہے۔

”کون سے پاؤں پر پالش کروں صاحب“ لڑکے نے پوچھا۔

”جہی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھا دابنے پاؤں سے شروع کر دو۔“

وہ بولا۔ ”جناب اس کے لیے آپ کو دوسرے کمرے میں جانا پڑے گا۔ میں صرف بائیں پاؤں کے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔“ وہ بھی صرف بوٹ پر۔ چیل اور سینڈل کی پالش کے ماہرین دوسرے ہیں۔“

(بہ شکریہ لی کاک)



نسخہ بھونکتے کتے بچنے کا!

ایک اخبار میں بھونکتے کتے سے بچنے کا نسخہ شائع ہوا ہے لکھا ہے۔
 ”اگر آدمی ساکت کھڑا ہو جائے۔ بازو اور ہاتھ نیچے کی طرف سیدھے کر لے اور
 دوسری طرف دیکھنے لگے تو بھونکتا ہوا کتا کچھ دیر کے بعد خاموش ہو جائے گا اور پھر
 وہاں سے چلا جائے گا۔“

اخبار نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نسخہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اوپر فقط ”جدید طبی تحقیق“ کا
 عنوان دیا گیا ہے۔ یہ بھی مذکور نہیں آیا کتوں کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے کہ ان پر اس
 ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری ہے۔ یہ اعتراض بھی کچھ لوگ کریں گے کہ اگر انسان
 حسب ہدایت بھگلی ملی بن کر منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جائے اور کتا اس کی ٹانگ
 لے لے تو ایڈیٹر اخبار ہذا کس حد تک ذمہ دار ہوگا۔ ہمارے نزدیک تو یہ اعتراض بے
 محل اور ناوابجہ ہے۔ بھونکتا ایک فعل ہے اور کتا ٹانگ۔ کتا کاٹ لے تو سیدھا سیدھا
 اسپتال جا کر چودہ انجکشن پیٹ میں لگوا لیجیے اور مزے کیجیے۔ اصل کوفت تو کتے کی عاف
 عاف سے ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ نسخہ مجرب ہے۔

ان امور میں اصل مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کہ کتے کو معلوم نہ ہو کہ اسے
 اخبار میں چھپی ہوئی ہدایت کی پابندی کرنی ہے یعنی کوئی شخص بازو لٹکا کر دوسری طرف

منہ کرے تو اسے دم دبا کر کھسک جانا چاہیے۔ یا تو بعض کتے ناخواندہ ہوتے ہیں یا اخبار نہیں پڑھتے یا جان بوجھ کر بات ٹال جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مشہور ہوٹل کے لاونچ میں ایک کتے کو استراحت کرتے پایا گیا۔ میجر صاحب بہت خفا ہوئے۔ اسے کان سے پکڑ کر دروازے پر لے گئے جہاں موٹے موٹے لفظوں میں صاف لکھا ہوا تھا ”جن کتوں کے ساتھ ان کا مالک نہ ہو ان کا ہوٹل میں آنا منع ہے۔“

بہ نظر احتیاط ہم لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اخبار کا شمارہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں جس میں یہ ترکیب درج ہے۔ اگر کوئی کتا بھونکنے سے باز نہ آئے بلکہ کانٹے پر اتر آئے تو جدید طبی تحقیق والا صفحہ اس کے سامنے کرویں پھر بھی باز نہ آئے تو ڈنڈے سے اس کی خبر لیں۔

یہ ڈنڈے سے خبر لینے کی ہدایت ہماری طرف سے ہے۔ احباب مذکور کی ذمہ داری نہیں۔ ہماری طبی تحقیق اتنی جدید نہ سہی تاہم مجرب ضرور ہے۔ ڈنڈا بڑی کارآمد چیز ہے اور بہت سے نسخوں میں پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں اسے تنبیہ الغافلین کہتے تھے۔ اور... شاگرد اسی کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کچھ مدت ہوئی ہم نے ایک کارٹون دیکھا کہ ایک استاد اپنے شاگرد رشید کو ایک موٹی سی کتاب سے دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ کتاب کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ ”وی چائلڈ سائیکالوجی۔“ یعنی بچوں کی نفسیات۔“

ایک زمانے میں اخباروں سے صرف خبروں کا کام لیا جاتا تھا۔ یا پھر لوگ سیاسی رہنمائی کے لیے انہیں پڑھتے تھے۔ آج تو انبار زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ سینٹھ اس میں منڈیوں کے بھاؤ پڑھتا ہے۔ بڑے حیاں ضرورت رشتہ کے اشتہارات ملاحظہ کرتے ہیں اور آ رہے ہیں۔ عزیز طالب علم فلم کے صفحات پر نظر لگاتا ہے اور علم کی دولت نایاب پاتا ہے۔ بی بی اس میں ہنڈیا بھوننے کے نسخے ڈھونڈتی ہے اور بعض لوگوں نے تو اخباری نسخے دیکھ دیکھ کر مطلب کھول لیے ہیں۔ پچھلے دنوں عورتوں کے

ایک اخبار میں ایک بی بی نے لکھ دیا تھا کہ پریشر مگر تو مہنگا ہوتا ہے اسے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہ خوبی ڈالدا کے خالی ڈبے سے لیا جاسکتا ہے۔ کفایت شعار بیویوں نے یہ نسخہ آزمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی زخمی ہوئیں اور ایک آدمی بی بی تو مرتے مرتے بجی۔ ایسے نسخوں پر عمل کرتے ہوئے وہ حکایت نہ بھولنی چاہیے کہ ایک صاحب کی بھینس کو اچھارہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ بزرگ کے پاس دوڑے دوڑے گئے کہ ”پارسا! آپ کی بھینس کو بھی تو اچھارہ ہوا تھا۔ آپ نے کیا دوا دی تھی؟“

ان بزرگ نے کہا۔ ”سیر بھر سوڈا کا سنک پانی میں گھول کر پلا دیا تھا۔“ وہ شخص گیا اور یہ نسخہ آزمایا۔ بھینس اسے نوش جاں کرتے ہی مر گئی۔ وہ شخص پھر ان بزرگ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ حضور میری بھینس تو یہ نسخہ استعمال کرتے ہی مر گئی۔

”بھئی! تو میری بھینس بھی گئی تھی۔“ ان بزرگ نے نہایت حلم اور متانت سے فرمایا۔ ہم دس بارہ روز فلو میں مبتلا رہے اور بستر سے نہ اٹھ سکے۔ اس میں بھی کچھ دخل جدید طبی تحقیق کو ہے۔ ایک صاحب روحانی اور نفسیاتی علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اپنے دل میں یہ سمجھ لو کہ تمہیں فلو و کچھ بھی نہیں ہے۔ حب وہم ہے۔ ہم نے اس نسخے پر عمل کیا۔ بلکہ اگر کوئی کہتا تھا ”میاں دوا کرو تمہاری کھانسی تو خطرناک معلوم ہوتی ہے۔“ تو ہم یہی جواب دیتے تھے کہ میاں ہوش کی دوا کرو۔ کون سی کھانسی کیسی کھانسی۔ ان کا علاج ختم ہوا تو دوسرے کرم فرمانے ایک اخبار میں سے دیکھ کے بتایا کہ دو دن کا مکمل فاقہ کرو اور پیاز کی گٹھی سونگھتے رہو۔ اب ہم نے یہ عمل کیا۔ اتفاق سے نقوی کلینک والے ڈاکٹر نقوی صاحب نے دیکھ لیا اور کہا ”میاں کیوں پاگل ہو رہے ہو۔ اخبار والے ہو کر بھی اخبار کی باتوں پر یقین کرتے ہو۔“ یہ لو کپسول اور یہ رہا کچر۔“ خیر اللہ نے صحت دی۔ ہم نے ان نفسیاتی معالج کو کچل لیا کہ حضرت ہم تو ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہوئے۔ آپ کو پچھلے دنوں فلو ہوا تھا آپ کیسے نفسیاتی علاج سے ٹھیک ہو گئے؟“ ہنس کے بولے ”میاں میں بھی ڈاکٹر ہی کی دوا سے ٹھیک ہوا تھا۔“

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں

ایک بی بی نے کہ مشہور صحافن ہیں ایک اخبار میں مضمون لکھا ہے جس میں کاملی کی خوبیاں گنائی ہیں۔ کامل ہم بھی ہیں لیکن یہ کبھی خیال نہ آیا تھا کہ ہمارا تصور جاناں کیے ہوئے لیٹے رہنا بھی ایک کمال ہے اور جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے۔ یہ بی بی بھی ہماری عادت کی ہیں۔ دن کے بارہ بجے ناشتا کرتی ہیں وہ بھی اس لیے کر لیتی ہیں کہ ان کے میاں ان کو ساڑھے گیارہ بجے کان سے پکڑ کر اٹھا دیتے ہیں۔ وہ اپنی بیگم کے برعکس بہت مستعد آدمی ہیں۔ گیارہ بجے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ان کا ایک بھائی تو ان سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یعنی اور سویرے جاگ جاتا ہے۔ ترکیب یہ کی ہے کہ رات ہی کو صبح دس بجے کا الارم لگالیتا ہے۔ ادھر دس بجے ادھر اس نے آنکھ کھولی۔ بستر میں چند پلٹے کھائے۔ دو ایک بار آنکھیں بند کیں۔ ذرا سا اونگھا۔ بہر حال ساڑھے دس بجے تک ضرور وہ اپنا جھبر جھالا پہن اخبار سمیٹ غسل خانے میں چلا جاتا ہے۔

ان بی بی نے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں جتنے کام کیے کاہلوں نے کیے۔ یہ بھاگ دوڑ کرنے والے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم مشرقیوں کے ہاتھ میں آ کر تو خیر ہر اچھی چیز خراب ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاملی بھی۔ لوگوں نے افونیوں کے لطیفے گھڑ لیے ہیں کہ ایک شخص بیچ رستے میں پاؤں پھیلانے پڑا تھا۔ ایک گاڑی بان اس

راستے آیا تو اس نے آواز دی۔ ”اے پوتی اٹھ ورنہ ابھی تیری.... ٹانگیں کچلی جائیں گی۔“ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا وہاں اسے جوتا نظر نہ آیا جو گھر سے پہن کر چلا تھا کیونکہ سوتے میں کسی نے اتار لیا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے گاڑی بان سے کہا ”گزاروے گاڑی! یہ میری ٹانگیں نہیں ہیں۔“

ملاحظہ فرمائیے! کتنا فضول لطیفہ ہے۔ جو سنے گا کابلوں کے متعلق ہرگز اچھی رائے قائم نہ کرے گا۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب نے اس سے جو شان دار فائدے اٹھائے ہیں ان کا ذکر سنئے۔ ان بی بی بی بی نے مثال وی ہے کہ اگر نیوٹن کابل نہ ہوتا بیچ پر اپنے آپ میں مگن بیٹھا نہ رہتا تو آج کشش ثقل کا راز کیسے معلوم ہوتا؟ ہوا یوں کہ ورخت سے سیب گرا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے جیب میں ڈال لبا ہوتا۔ کھانے کے بعد کھاتا اور ڈاکٹر کو بھگاتا۔ یہ اپنی جگہ سے مارے کابلی کے اٹھے ہی نہیں۔ بس سوچتے رہے کہ یہ سیب کیوں گرا۔ سوچتے سوچتے کشش ثقل دریافت کرنی۔ یہی جیمز واٹ نے کیا۔ کیتلی کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بھاپ سے ڈھکن جو ہلنے لگا تو ببائے اس کے کہ کوئی بوجھ اس پر رکھ کر اچھی طرح دبا دیتا کیونکہ ایسا واقعہ کیتلی کا سرپوش ہلنے کا دنیا میں پہلی بار نہ ہوا تھا تو آج ہم یونہی چنگے بیٹھے ہوتے۔ یہ ریل ویل یہ انجن و انجن کچھ بھی نہ ہوتے۔ عورتیں آٹا تک ہاتھ کی چکی سے پیستیں۔ ان کو کابلی یا دیگر موضوعات پر لکھنے کی فرحت ہی نہ ملتی۔

باوجود ان مضبوط ولائیل اور شواہد کے جو ان بی بی نے اپنے مضمون میں دیے ہیں ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ موجد بننے کے لیے شاید کابلی کے حلاوہ کچھ اور صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہو۔ بی بی جی نے خود لکھا ہے کہ میں باوجود سست الوجوہ ہونے اور کٹی کٹی گھٹنے بستر میں لیٹنے کے کوئی اچھوتا خیال نہیں پیش کر سکی۔ اب عالیہ نہیں تخلیق کر سکی۔ ہم سوچتے ہیں کہ نیوٹن کے بجائے ہم باغ میں بیٹھے ہوتے اور سیب ہمارے سانسے گرتا تو

سی کرتے، بس اٹھا کے کھا لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کشش ثقل کا کھڑاگ ہماری سمجھ میں
 اب بھی نہ آیا۔ سیب پک گیا تھا۔ ڈنڈی کمزور ہو گئی تھی ذرا سی سوا چلی اور وہ ٹوٹ کے
 آن گرا۔ نیوٹن کو تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ ون ہوئے ہیں۔ سیب تو کشش ثقل دریافت
 ہونے سے بہت پہلے گرا کرتے تھے۔ اچھا ایک اور بات سنئے۔ دنیا میں اور بہت سے
 کاہل ہیں۔ ہمارے جیسے اور بی بی جیسے بن کے آس پاس چیزیں گرتی رہتی ہیں اگر
 سب کے سب کشش ثقل دریافت کرنے بیٹھ جائیں تو دنیا کا اور کوئی کام نہ کر سکیں۔
 اب یہی دیکھیے اس مضمون کے لکھنے کے دوران ہی چھت سے پلا مٹر کا ایک ٹکڑا عین
 ہمارے سامنے گرا۔ ہم نے کوشش کی کہ اس میں کشش ثقل دریافت کریں۔ نوکر کو بلا
 کر وجہ پوچھی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ جی پلستر پر انا ہو رہا ہے۔ اس لیے گر جاتا ہے۔
 کشش ثقل کی طرف اس کا بھی دھیان نہ گیا۔ اب لیجیے بھاپ کی بات ہم صبح ناشتا
 چولھے کے پاس ہی بیٹھ کر کرتے ہیں۔ آج ہم نے بہت کوشش کی کہ کیتلی کی بھاپ کو
 دیکھ کر ریل کا نہ سہی کوئی اور چھوٹا موٹا انجن بھا ايجاد کر لیں۔ لیکن نہ ہوا۔ اگر کبھی کاہل
 موجد ہو باتے تو کیا کہنے۔ جسے دیکھو بستر میں لیٹا ریل کا انجن ايجاد کر رہا ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم عاشا وکلا کاہلی کی خوبیوں کے منکر ہیں۔ جوڑا بھلا ہم کر لیتے
 ہیں کاہلی کی بدولت ہے۔ کاہل نہ ہوتے تو کوئی سڑک بنا رہے ہوتے۔ مشین چلا
 رہے ہوتے۔ یہ جو ہم نے شاعری میں نازک نازک مضمون باندھے ہیں اور غیب سے
 مضامین کو خیال میں لاتے ہیں کچھ بھی نہ ہوتا۔ اگر کاہل نہ ہوتے تو شاید زندہ بھی نہ
 ہوتے۔ ہمارے لواحقین اب تک بیسے کی رقم خرو برد کر چکے ہوتے۔ ہمارے پڑوس
 میں حکیم عمر وراز رہتے تھے۔ نہایت چاق و چوبند ہر روز صبح چار بجے اٹھ کر ورزش کرتے
 تھے۔ پھر ٹھنڈی ہوا کھانے کو میر کو نکل جاتے تھے۔ ہمیں بہت ترغیب دی۔ ہم کبھی ان
 کی باتوں میں نہ آئے بلکہ لحاف کو سر کی طرف کچھ اور کھینچ لیا۔ نتیجہ ان کے لالچ کرنے

کا یہ ہوا کہ ایک روز سڑک پر مع اپنی چھڑی کے اور صحت کے ایک ٹرک کے نیچے آ گئے۔ یہ بات تو ہر کوئی مانے گا کہ ٹرک سڑکوں پر چلنے والوں پر زیادہ چڑھتے ہیں، بہ نسبت چارپائی پر لیٹنے والوں کے۔

کاہلی کی قدر کا بل ہی کر سکتا ہے۔ بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے۔ وہ بد نصیب جسے محنت نارسا نہ ملا۔ اقبال کا بل تھے چارپائی پر دھستا اوڑھے لیٹے رہتے تھے کسی کمال کی شاعری کر گئے۔ وہ ایک مرد تن آسان تھا۔ تن آسانوں کے کام آیا۔ خالب بھی تصور جاناں کیے پڑے رہتے تھے۔ آج ان کی عظمت کو یوم خالب منانے والے تک تسلیم کرتے ہیں۔ جو بڑے چلتے پڑے اور چاق و چوبند آدی ہیں۔ بد اچھا بد نام بُرا کے ذیل میں ایک اور مثال لیجیے۔ ہمارے معاشرے میں ان پڑھ کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے پرائیگنڈے میں آ کر لوگ تعلیم کو اچھا جانتے ہیں۔ اس کی تعریف کرتے نہیں جھکتے۔ کل ایسے ہی ایک صاحب کو ہم نے ایک سوال کر کے خاشوش کر دیا۔ وہ یہ کہ اکبر بڑا آدی تھا یا بہادر شاہ ظفر؟

اکبر بالکل ان پڑھ تھا۔ نہ ظفر کی طرح دل گداز غزلیں کہہ سکتا تھا نہ استاد ذوق کا صحبت یافتہ تھا نہ طغہ نویسی میں خوش خطی دکھا سکتا تھا۔ بایں ہمہ کوہ ہمالہ تار اس کماری حکومت کر گیا۔ اس نے مرتے وقت اتنی بڑی سلطنت مغلیہ چھوڑی اور عالم فاضل بہادر شاہ ظفر نے نہ کمی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کمی کے دل کا قرار ہوں۔

(باتیں انشائی کی)

حکیم جی لندن میں پہنچ گئے

دلایت والوں کو اپنے ملک کو دلایت بنانے میں جانے کتنی صدیاں لگیں۔ ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی بھائی اسے چند ہی سال میں اپنے ڈھب پر لے آئے ہیں۔ لندن اور برمنگھم کے اردو اخباروں پر نظر ڈالئے آپ کا جی نہال ہو جائے گا۔ بہت کچھ جو انگریزی زبان میں چھپے تو شاید گرفت میں آجائے۔ اردو میں بہ خوبی چل رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے معاملے میں ایسی سختی ہے کہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی فارغ التحصیل ڈاکٹریوں کو بھی فی الحال پریکٹس کرنے کا اذن نہیں لیکن ہمارے عطائی بھائیوں کی راہ انگریز نہیں روک سکا۔ چنانچہ جہاں اور لوگ پہنچے وہاں زمانہ اور مردانہ پوشیدہ اور پیچیدہ بیماریوں کا مجرب اور حکیمی علاج کرنے والے بھی پہنچ گئے۔ کل یہاں کے ایک اردو اخبار میں اشتہار دیکھا کہ جین ہیلتھ سینٹر آرام باغ روڈ کے ممتاز ماہر جنسیات نے جن کے پاس آر۔ ایم۔ پی کی پڑاسرا ڈگری ہے یہاں کے علاوہ لوگوں کے پُر زور اصرار پر لندن میں بھی اپنا مستقل دواخانہ کھول دیا ہے جس میں خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے اشتہار کے ساتھ اپنی تصویر بھی دی ہے۔ ادھر نکلز پر ہندوستان کے حکیم ایس ایل بٹ ناگر صاحب بھی جو اٹھارہ میڈیکل کتابوں کے مصنف ہیں جس میں ہوم ڈاکٹر بھی شامل ہے، لوگوں کے پُر زور اصرار کی تاب نہ لا کر

تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے اشتہار کے بہ موجب لاکھوں آدمی گزشتہ تین سال میں ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دلالت میں یہ دیکھیم کہ انہیں تھے لہذا حکیم صاحب عبدالرحمن معالج خاص مردانہ کو بھی مانچسٹرن میں مطب کھولنا پڑا ہے یہ اپنے کو نیچر دینتھ اور ہریٹ لکھتے ہیں۔ یعنی قدرتی طریقوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے ان کا دعویٰ حذالقت بے بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ اشتہار کہتا ہے۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا ایک صاحب اپنے ایک انیس سالہ بھتیجے اور اس کی سولہ سالہ دلہن کو لے کر مانچسٹر آئے اور حکیم صاحب سے بیان کیا کہ اس لڑکے کی شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں لیکن اس نے خود کشی کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کا کچھ علاج کیجیے حکیم صاحب نے تسلی وی اور دوائی بھی وی لڑکے نے تین ماہ دوائی استعمال کی۔ چند ہفتے ہوئے۔ وہ حکیم صاحب کے لیے ایک قیص اور ٹائی اور دس پونڈ لڈو بطور تحفہ لائے۔ اور خوشخبری سنائی کہ جی بابے کی کرپا اور آپ کے علاج سے سب کچھ ٹھیک ہے سیرے بھتیجے کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اور ہم نے ڈھائی من لڈو تقسیم کیے ہیں۔ لڈو کھاتے ایک اور ہندوستانی ماہر کی طرف آئیے۔ یہ لندن میں ہیں۔ ایشیا کے مشہور و معروف معالج۔ ماہر جنسیات حکیم کے ترویدی۔ ان کی ڈگریاں اور زیادہ لمبی چوڑی ہیں۔

”این۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ پی۔ اے۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایچ۔“

حیرت ہے کہ انہوں نے باقی کے حروف تہجی کیوں چھوڑ دیے۔ اے سے زائد تک استعمال کرنے میں کیا امر مانع تھا۔ یہ کھوئی ہوئی طاقت مردی کے علاوہ کھانسی زکام، نزلہ، گھٹیا اور پیٹ کے درد کا بھی حکیمی علاج کرتے ہیں۔ البتہ ملاقات کے لیے فون پر وقت مقرر کرنا پڑتا ہے۔ بہ قول خود طاقت کی دوائیوں کے بادشاہ اور انٹرنیشنل شہرت کے مالک، حکیم ہری کشن لال صاحب ماہر امراض پوشیدہ۔ خود تو مصروفیات کے باعث تشریف نہیں لاسکے لیکن اپنا اشتہار لندن میں چھپوا دیا ہے۔ حکیم صاحب کو جھانسی

یونیورسٹی نے کئی اعزاز کی ڈگریاں دے رکھی ہیں۔ مثلاً ایم، ایس سی، اے اور ڈی ایس ای، ای، اے۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ ڈگری کا مطلب نہیں پوچھا جاتا۔ لمبائی دیکھی جاتی ہے۔ دلالت دالوں کی آسانی کے لیے انہوں نے اپنے ریٹ پونڈوں میں دیے ہیں۔ شاہانہ علاج ۵۲ پونڈ، درمیانی علاج ۳۲ پونڈ عام علاج ۱۸ پونڈ اور غریبانہ علاج ۱۲ پونڈ۔ حکیم صاحب نے خدمت خلق کے جذبے سے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ لاکھ روپے کی قیمتی کتاب پیغام جوانی مفت حاصل کریں۔ اس میں لاکھ روپے کے پیغام جوانی کے علاوہ کئی لاکھ روپے کے حکیم صاحب کی دوائیوں کے اشتہار بھی ضرور ہوں گے۔ سب مریضوں کے لیے مفت۔

پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کے لیے تازہ ترین خوش خبری یہ ہے کہ حکیم جے ایم کوشل بھی جو کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ صرف پانچ روز کے لیے بریڈ فورڈ میں ورود فرما ہوئے ہیں۔ آپ کی ڈگریوں کا بھی شمار نہیں۔ بی۔ اے (پنجاب) اے۔ بی۔ ایچ۔ ایس (جارس یونیورسٹی) وینارس یونیورسٹی بی۔ اے (پی۔ یو) اے۔ بی۔ ایم۔ ایس (بی۔ ایچ۔ یو) ڈگری ڈاکٹری کی نہ بھی ہوتی بھی لیاقت کی دلیل تو ہے۔



حکیموں کے علاوہ سب سے زیادہ اشتہار ہمارے ان پاکستانی ہندوستانی بھائیوں کے ہیں جو وطن واپس آنے والوں کو ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر، ٹیپ ریکارڈر، ٹائپ رائٹر، سلائی کی مشین وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔

ایک صاحب ۶۰ فیصدی ڈسکاؤنٹ پر دوسرے ۶۵ فیصدی پر اور تیسرے ستر فیصدی ڈسکاؤنٹ پر ہم نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے۔ بعض فرمیں سو فیصدی ڈسکاؤنٹ پر بھی یہ سامان فراہم کرتی ہیں۔



آپ سوچتے ہوں گے کہ ان بزرگ نے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، ڈھائی من لڈو کہاں سے لیے ہوں گے۔ یاد رہے کہ ایشیائی مٹھائیوں کا عظیم الشان مرکز سویٹ سینٹر، جو جہلم والے مشہور و معروف پہلوان صاحب کی دکان ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے لیے بہ کفایت خالص گھی کی مٹھائیاں فراہم کرتا ہے۔ یہاں سے آپ گلاب جامن، رس ملائی، رس گلہ جلیبی برنی لڈو، پیڑا، بالوشائی، مہیدیاں وغیرہ وغیرہ وغیرہ ہی نہیں دہی بھلے آلو چھولے، سمو سے، نمکین والیس اور سویاں وغیرہ بھی خرید سکتے ہیں۔

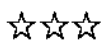
مٹھائی سے رغبت نہ ہو تو شہر دز محل ریسٹورنٹ میں تشریف لائیے اور تندوری سرخ، تندروی روٹی، چکن اور مٹن سٹکے، قورسہ، کوفتہ وغیرہ کھائیے۔ یہ چیزیں حلال گوشت سے تیار ہوتی ہیں۔ جس سے آپ کا پیٹ بھر جائے اور خمار آنے لگے تو بھی مضائقہ نہیں۔ رضائی سینٹر سے آپ کو ہر قسم کی آرام دہ رضائیاں مل سکتی ہیں۔ شینل کی ڈبل رضائی ۱۲/۵ پونڈ ساٹن ڈبل ۱۲/۳ پونڈ چینٹ ڈبل بھی ساڑھے تین پونڈ، میں لیجیے اور پاؤں پسا کر سویئے۔

اگر آپ کا سونے کو می نہیں چاہتا تو سینما دیکھیے۔ بھتی فلمیں یہاں لگی ہوئی ہیں۔ پورے ہندوستان اور پاکستان میں نہ لگی ہوں گی۔ پلسیم ایسولڈو (لنڈن) میں عندلیب (پاکستانی) ڈاکو منگل سنگھ ہے۔ میلا جٹ ہے۔ جس میں چاچا سنت رام جی کام کر رہے ہیں۔ یہ پیغام نصیحت، ہم جولی، سینری، تیسری منزل۔ دیو داس ان پڑھ وغیرہ۔ کلاسک سینما جس سادہ آیا جھوم کے، پتھر کے صنم وغیرہ اور ڈین میں دیور بھابی اور زرقا۔ لکسر سینما مرنگھم میں، ”جن بلی، تیرے عشق نچایا وغیرہ۔

الائٹ سینما میں (ڈو) سٹری میں میرے حضور، اور جی چاہتا ہے۔ مارلبرڈ، بریڈ فورڈ

میں سپنوں کا سودا گر کیسے۔ کیمبر لندن میں، آشیر داو، بمبئی کا بابوناز سینما لندن میں استادوں کے استاد، کلاسک میں میرے محبوب۔ ایک لمبی لسٹ کوئی کہاں تک گنوائے زندہ پروگرام چاہیے تو اس کا بھی انتظام ہے۔ سردار آسا سنگھ مستانہ بھی یہاں ہیں۔ سریندر کور بھی اور پرکاش کور بھی آسا سنگھ مستانہ جی پنجابی گیتوں کے شہنشاہ ہیں، ہیر وارث شاہ گاتے ہیں۔ اور یہ دونوں یہاں ہیر کے علاوہ مپے گاتی ہیں۔ اور پنجابی لوگ گیت سناتی ہیں۔ کبھی کبھی قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ آج کل کوئی قوال تو آئے ہوئے نہیں ہیں۔

البتہ ایک مشہور درگاہ کے گلدی نشین صاحب کا اشتہار چھپا ہے کہ عرس سبارک جس تشریف لائیں نہ لائیں تو گھر بیٹھے اپنی نیک کمائی کا پیسہ حسب توفیق نذر دنیا، فاتحہ، چادر، پھول شیرینی ختم وغیرہ کے لیے بہ طور دنیا بہ ذریعہ، منی آرڈر، برٹش پوسٹل آرڈر، چیک وڈرافٹ کو کراس کر کے حقیر فقیر کے نام پتہ ذیل پر روانہ کریں۔



ہمارا ملک

ایران میں کون رہتا ہے؟ ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔ انگلستان میں کون رہتا ہے؟ انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔ فرانس میں کون رہتا ہے؟ فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔ یہ کون سا ملک ہے؟ یہ پاکستان ہے۔ اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟ نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔ اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔ اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔ اس میں یہ قوم رہتی ہے۔ اس میں وہ قوم رہتی ہے۔ لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟

غلطی ہوئی۔ معاف کر دیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اُسے بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اُس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خودنوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جہاں، کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور انبار

آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کر ڈپتی ہو گئے۔ حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک بلکہ بعض اوقات بیردن ملک بھی چلے جاتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جا رہے ہو۔

رہسانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اُسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اُس کی کامرانی کے لیے چلے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں غفودرگز رکامادہ از حد تھا۔ اگر کوئی آ کر شکایت کرتا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیالی ہے، یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے، تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمال میرچشمی سے اُسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لے کر تارک الدنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



ایک خبر دیپالپور کی

دیپالپور کی خبر ہے کہ وہاں حسن اخلاق اور شائستگی کے موضوع پر ہونے والی ایک مجلس مذاکرہ لپاؤ کی اور گالی گلوچ پر ختم ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک مقرر نے عجز و اخلاق کی خوبیوں پر تقریر کرتے ہوئے کہیں دعویٰ کر دیا کہ ”عجز و اخلاق میں اس خاکسار کا پہلا نمبر ہے۔ دوسرے لوگ جو عجز و اخلاق کے دعوے دار ہیں بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔“ اس پر ایک صائب کوا اعتراض ہوا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

”حضرت آپ کیا کھا کر انکساری میں میرا مقابلہ کریں گے۔ میں تو خطوں میں بھی اپنے نام کے ساتھ بندہ عاجز اور خاکسار لکھتا ہوں۔“

پہلے مقرر نے کہا۔ ”آپ تو صرف لکھتے ہیں بندہ عاجز اور خاکسار جماعت میں شامل بھی رہا ہے اور بیلچے لے کر پریڈ بھی کرتا رہا ہے۔“ اس پر دوسرے فریق کے حامیوں کو طیش آ گیا۔ ایک نے کہا ”ہمت تیری خاکساری کی۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”ہمت تری عاجزی کی۔“ ایک نے کہا۔ ”تیرے باپ میں بھی انکسار نہیں تھا۔ چھاتی تان کر اکڑا کر چلتے“ اسے ہم نے دیکھا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تیرا دادا تو طرے والی پگڑی پہنتا تھا، تو کدھر سے فدوی بن رہا ہے۔“ لوگوں نے بڑی مشکل سے بچ بچاؤ کرایا اور کہا۔ تم بھی عاجز اور تم بھی خاکسار۔ صلح کر لو۔ غصہ تھوک دو۔

دیپالپور تو چھوٹی جگہ ہے اور اس کی محض مثال ہے۔ بڑی جگہوں پر بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں جمہوریت کا ولدادہ ہوں۔ میری جماعت جمہوری ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہم جمہوری ہیں۔ ہم آزادی رائے کے حامی ہیں اس پر پہلا فریق کہتا ہے۔ اچھا تو یہ بات ہے ہماری جمہوریت پسندی کو نہیں مانتا۔ چل تھانے کھا چنے کی وال چھ ماہ کے لیے نظر بند۔ ورنہ مان ہمیں جمہوریت پسند۔ اس پر دوسرا فریق ضمانتیں کرانے کے لیے بھاگ جاتا ہے کہ ٹھہر تو سہی ہماری حکومت آنے دے۔ ہم بھی تجھے جمہوریت کا لٹخنہ سلگھائیں گے۔ تیرا زن بچہ کولہو میں پلوائیں گے۔ ہم تو خیر کس شمار قطار میں ہیں۔ بڑی طاقتوں میں اکثر جنگیں اس بحث سے شروع ہوتی ہیں کہ کون امن کا زیادہ حامی ہے۔ الف کہتا ہے میں ہوں تب کہتا ہے میں ہوں۔ الف کہتا ہے کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے۔ یوں نہیں مانے گا۔ یہ لے گولہ بچا اپنا سر۔ تب اس کے جواب میں توپ سر کرتا ہے۔ دھائیں دھائیں ہوتی ہے اور آخر میں پانچ چھ سال کی جنگ کے بعد واقعی امن قائم ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مختلف ملکوں میں اس بات پر جنگ ہوتی تھی کہ فلاں ملک کو کون محکوم بنائے۔ ہندوستان میں پہلے انگریزوں اور پرتگیزیوں کے مضر کے ہوئے۔ پھر فرانسیزیوں اور انگریزوں میں لڑائی ہوئی۔ اب بڑی طاقتیں اس بات پر لڑتی ہیں کہ فلاں کو کون آزادی دلائے۔ افریقہ میں اور انگولامیں آج کل یہی ہو رہا ہے۔

روس کہتا ہے میں اس ملک کو آزاد کرادوں گا۔ امریکہ کہتا ہے میں کرادوں گا۔ میرے ہاتھوں آزاد ہوئے تو نفع میں رہو گے۔ سڑ کر کوئی نہیں دیکھتا کہ غلام بنانے والے تو کبھی کے پرتگال واپس پہلے بھی گئے۔ اگر آزاد کرانے والے اپنے لاڈ لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ وہاں نہ پہنچ جاتے اور اصرار نہ کرتے کہ۔

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

تو ہمیں یقین ہے کہ انگولا والے واقعی کبھی کے آزاد ہو چکے ہوتے۔ رائنڈ میں تو جیتے ہیں رنڈوے جینے بھی دیں۔

آج کل بڑی طاقتوں کے درمیان ویٹان کا بڑا شہرہ ہے یعنی صلح۔ تم اپنا منہ ادھر کرنا ہم اپنا منہ ادھر کر لیں۔ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر صاحب کے تو اس بھاگم دوڑ میں جوتے کے تلے گھس جاتے ہیں۔ ماضی کھائیں سپاٹو میں تو لندن میں ٹفن۔ غسل کریں ماسکو میں ناشتا پکنگ میں واشنگٹن میں کم ہی کسی نے ان کی صورت دیکھی ہے۔ آرٹ نگو والد نے ایک بار نقشہ کھینچا بھی تھا کہ ایک بار پرچہ لگا ہنری کسنجر واشنگٹن اپنے دفتر آ رہے ہیں۔ چنانچہ فارن آفس کو جھنڈیوں وغیرہ سے سجایا گیا۔ چہرہ اسی وغیرہ نئی وردیاں پہن کر آئے۔ ان کے کمرے کو جھاڑا پونچھا گیا۔ وزارت خارجہ کے افسروں کا ان سے تعارف کرایا گیا اور امید ظاہر کی گئی کہ موصوف پھر بھی کبھی وزارت خارجہ میں قدم رنجہ فرمائیں گے۔ لیکن جس قسم کی وہ صلح کراتے ہیں وہ لپا پوتی ہوتی ہے۔ دلوں کے میل اس سے صاف نہیں ہو سکتے۔ دونوں فریق ایک دہرے سے ہاتھ ملا کر اور مزاج شریف پوچھ کر یا ایک آدھ معاہدے پر دستخط کر کے پھر اپنے اپنے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور نائٹروجن بم اور آکسیجن بم بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار بیانات سے اس خیر سگالی کی توثیق ہوتی رہتی ہے مثلاً روس اور امریکہ میں آج کل ویٹان یعنی صلاح نامہ ہے امریکہ بیان دیتا ہے کہ روس ہمارا دوست ہے اور ہمیں یقین ہے احسن پسند ہے البتہ اگر جنوب مشرقی ایشیا میں اس نے اپنے اڈے قائم کرنے کی کوشش کی تو ہم اس کا مر توڑ دیں گے۔ جواباً روس کو جواب دینا پڑتا ہے کہ ہمارے دل میں امریکہ کی امن پسندی کی بڑی قدر ہے اور اس سے ہمارا دوستی کا معاہدہ پکا ہے تاہم اس نے یہیں چیز کی تو اس کا بھر کس نکال دیں گے وغیرہ۔

دیکھیے دیپالپور سے چل کر ہم کتنی دور پہنچ گئے۔ ویسے حسن اخلاق کے موضوع پر

بحث اور ایک دوسرے سے عجز و انکسار میں بازی لے جانے کی کوشش اور اس کے نتیجے میں لپاؤ کی کی کوئی واحد مثال نہیں۔ کئی سال ہوئے انسداد رشوت ستانی کے موضوع پر سرکاری اہل کاروں کا ایک مذاکرہ ہوا تھا۔ اسے وقت کے وقت ملتوی کرنا پڑا کیونکہ مذاکرے کے سیکریٹری یا کنوینر اسی روز ایک مکان کا نقشہ پاس کرنے کے سلسلے میں رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ملاوٹ کے انسداد کے بارے میں پارسل جو مذاکرہ ہوا تھا، اس میں ایک مشہور سیٹھ صاحب بڑی فصاحت سے اپنا خطبہ ارشاد کر رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ اس پر انہوں نے گھبرا کر خطبہ ختم کر دیا اور حاضرین کو سلام علیکم کہہ کر رخصت ہو گئے۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ ان کے خالص پنجاب کے گھی کے کارخانے پر چھاپہ مار کر پولیس نے آلو کی بوریاں اور چربی کے ڈرم قبضے میں لے لیے ہیں۔ ہمارے ایک صوبے کے ایک وزیر کے متعلق مشہور ہے کہ بات بات پر گالی دیتے ہیں۔ ان کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو بہت خفا ہوئے اور کہا یہ بالکل جھوٹ ہے۔ کون... زرا وہ یہ بات کہتا ہے اسے میرے سامنے لاؤ۔ اس کی یہ اس کی وہ۔

(دُخل ورمعقولات، روزنامہ جنگ مورخہ ۷-۱-۶۷)



کچھ اعداد و شمار کے بارے میں

ہمارا مساب ہمیشہ سے کمزور رہا ہے یوں تو اور بھی کئی چیزیں کمزور رہی ہیں۔ مثلاً مالی حالت ایمان۔

لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ اوھر آج کی دنیا اعداد و شمار اور مساب کتاب کی دنیا ہے حتیٰ کہ ہمارے دوست طارق عزیز بھی جو ہماری طرح نرے شاعر ہوا کرتے تھے مساب کتاب لگانے اور او سطیں نکلوانے لگے ہیں۔ نیلام گھر کے گزشتہ پر د گرام میں انہوں نے پوچھا کہ وہ کون سا مہینہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔ کسی نے بتایا کسی نے نہ بتایا۔ طارق عزیز کی طرف سے جواب آیا کہ فردری میں کیونکہ اس مہینے میں فقط ۲۸ دن ہیں۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ کوئی آدی ایک ہی جھوٹ ایسا بول سکتا ہے کہ کسی دوسرے کے عمر بھر کے جھوٹوں پر بھاری پڑے۔ لیکن اعداد و شمار میں چیزوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے۔ بہر حال خوشی کی بات ہے کہ جھوٹ ناپنے کا پیمانہ دریافت ہو گیا ہے اور طارق عزیز کے ہاتھ آ گیا ہے جو ہماری طرح سوشلسٹ خیالات رکھتے ہیں۔ ہم یہ مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ اس کا راشن مقرر کر دیا جائے۔ اسے نیشلا نر کر کے سب کو حصہ رسد تھوڑا تھوڑا حق جھوٹ بولنے کا دیا جائے۔ یہ بات ہمیں قرین انصاف معلوم نہیں ہوتی کہ بڑے لوگ تو جھوٹ بولیں

پیسے والے تو جھوٹ کا طومار باندھیں۔ سیاست دان تو پولیس کا نفرینس تک کریں لیکن عوام سے کہا جائے کہ صرف سچ بولو۔ مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف غریب غرباء کو بھی جھوٹ بولنے کا حق دیا جائے۔ دوسری طرف بڑے لوگوں کو بھی سچ کے استعمال پر راغب کیا جائے۔ بسے یہ لوگ کڑوا ہونے کی وجہ سے بالعموم تھوک دیتے ہیں۔

کسی رانا یا نادان کا مقولہ ہے کہ جھوٹ کے تین درجے ہیں۔ جھوٹ، سفید جھوٹ اور اعداد و شمار، لیکن ہم یہ نہیں مانتے۔ اعداد و شمار بڑی اچھی چیز ہیں۔ اعداد و شمار کی برکت سے اب ہم یہ جانتے ہیں کہ سورج کتنے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور چاند کی روشنی کتنے سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ بے شک اس سے سورج کی روشنی پر چنداں اثر نہیں پڑا نہ چاند کی چاندنی متاثر ہوئی ہے۔ نہ ہم ان چیزوں میں کی بیشی کر سکتے ہیں۔ تاہم علم خواہ کتنا ہی بے مصرف ہو آخر علم ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اب ہر ملک کے بارے میں ہم مانتے ہیں کہ اس کی GNP کیا ہے، اوسط آمدنی فی کس کتنی ہے۔ مہنگائی کا اعشاریہ کیا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے سے مہنگائی کم ہو جاتی ہے یا آمدنی بڑھ جاتی ہے یا پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن علم میں تو اضافہ ہوتا ہی ہے۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ تو گئے جاتے ہی ہیں۔ بسیں معلوم نہیں کہ پرانے حکمران، بابر، شیر شاہ، اکبر اعظم اور فیروز تغلق وغیرہ اعداد و شمار جمع کیا کرتے تھے اور اوسط نکالا کرتے تھے یا نہیں، مثلاً شیر شاہ، اکبر اعظم اور فیروز تغلق کے زمانے میں خاصی ارزانی اور خاش حالی تھی لیکن یہ ذکر نہیں ملتا کہ فی کس کتنے موٹھ صڑا آتے تھے، یا شیر شاہ کی سڑکیں فی کس کتنے گز ہر آدمی کے حصے میں آتی تھیں یا GNP کیا تھی۔ آج کل اقتصادی مشیر اور روزیہ وغیرہ ہونے کے باوجود اقصادیات گڑ بڑا رہتی ہیں۔

پُرانے زمانے میں اقتصادی مشیر نہ ہونے کے باوجود شاید اسی وجہ سے کوئی اقتصادی

خلل واقع نہیں ہوتا تھا، لیکن اس بات کی ہم تعریف نہیں کر سکتے کیونکہ انکل ہچ چیز انکل ہچ چیز ہوتی ہے۔ لوگ تو حکمت اور ہومیو پتی کی دواؤں سے بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہم ان کو صحیح طریقہ علاج مان لیں اور ایلو پتی تھی جس پر انگریزوں نے اتنا روپیہ صرف کیا ہے خدائی کا درجہ نہ دیں۔

آج کل ہر چیز کے لیے کیلکولیٹر اور کمپیوٹر وغیرہ نکل آئے ہیں۔ کسی کو ۲+۲ کا جواب چاہیے تو مشین ہی پر حساب کرتا ہے۔ ایک کلرک کو ہم نے دیکھا کہ اس نے ایک کیلکولیٹر خرید لیا تھا تا کہ اپنی ماہانہ آمدنی بڑھا سکے اور ایک کسان نے ایک بینک سے کہا تھا کہ میرے ہاں فی ایکٹر پیداوار کم ہوتی ہے۔ اپنے کمپیوٹر سے کہیے کہ اسے بڑھا دو۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ یہ بچ ہے کہ جتنے لوگ ہمارے ہاں کمپیوٹر دل کے شعبے میں کام کرتے ہیں اگر جا کر کھیت میں مل چلائیں تو پیداوار بڑھ سکتی ہے لیکن پھر سائنٹفک اعداد و شمار کی کمی واقع ہو جائے گی جو پیداوار سے کم ضروری چیز نہیں۔ اوسط کا مطلب بھی لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ ہم بھی غلط سمجھتے تھے۔ جاپان میں سنا تھا کہ ہر دوسرے آدمی کے پاس کار ہے۔ ہم نے نوکیو میں پہلے آدمی کی بہت تلاش کی لیکن ہمیشہ دو سراہی آدمی ملا۔ معلوم ہوا پہلے آدمی دور دراز کے ویہات میں رہتے ہیں۔ حساب لگایا ہے کہ ایک امریکی سال میں اوسطاً ساڑھے گیارہ بار چھینکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بارہویں چھینک آئے تو اسے روک لیتا ہے یا آدمی روک لیتا ہے، ناک سکیر کر رہ جاتا ہے۔ نہ ہر خاندان کے پاس ۱۲ ٹیلی ویژن اور ۱۳ کار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ہر گھر میں ایک ٹیلی ویژن اور ایک خالی کھوکھا ہوتا ہے یا کار کا ایک پہیہ ہوتا ہے، چاہے وہ دروازے پر انکاڑ چاہے ہوا بھر کر لڑھکاتے پھرو۔ اور ایسا مومپنا تو اعداد و شمار کا مذاق اڑاتا ہے۔ ملک کی ساری کاروں اور سارے ٹیلی ویژنوں کو ساری آبادی پر تقسیم کر کے اوسط نکالی جاتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کاریں اور ٹیلی ویژن سچ مچ غریب غرباء سمیت

سب کو وے دیے جاتے ہیں۔ خدا خواستہ ایسی بدعتیں تو سوشلزم وغیرہ میں سنی جاتی ہیں فقط حساب کتاب کی حد تک۔

☆☆☆

تاہم اوسط نکالنے میں کچھ احتیاط ضرور چاہیے۔ ایک بار ایک حساب دان نے دریا پار کرتے وقت اوسط نکالی تھی۔ لوگوں نے بہت منع کیا کہ بابا ڈوب جاؤ گے لیکن اس نے بانس بنوایا۔ ایک جگہ آٹھ فٹ گہرائی تھی، دوسری جگہ تین فٹ ایک جگہ چار فٹ۔ اوسط نکلی پانچ فٹ۔ سو یہ کچھ گہرائی نہ ہوئی۔ دریا میں اتر پڑا اور لگا ڈبکیاں کھانے۔ لوگوں نے مشکل سے نکالا۔ پھر بھی حیران کہ اوسط پانچ فٹ کی ہے، میں چھ فٹ کا ہوں گا۔ ڈوبا تو کیوں ڈوبا۔

☆☆☆

ایسا ہی ایک حساب دان اصفہان کی میر کو گیا تھا۔ وہاں بازار میں کئی جگہ ٹھنکا۔ خریداری کی اور ہوٹل واپس آیا تو معلوم ہوا کہ چھاتا کہیں کسی دکان پر رہ گیا۔ پہلی دکان پر گیا دکان دار نے کہا کہ حضرت یہاں نہیں۔ دوسرے نے کہا۔ آپ لے گئے تھے۔ تیسرے نے کہا میں نے دیکھا ہی نہیں۔ چوتھے نے بھی انکار میں سر ہلایا۔ پانچویں دکان دار نے البتہ شکل دیکھتے ہی چھاتا نکال حوالے کیا کہ میاں جی آپ بھول گئے تھے۔ اس پر اس شخص نے اہل اصفہان کے بارے میں یہ حکم لگایا کہ۔ اصفہانیوں میں ہر پانچ میں سے صرف ایک آدمی ایماندار ہے۔ یہ اوسط آج بھی سچ ہے ورنہ تو ہر مسافر وہاں ایک چھاتا لے کر جاتا اور پانچ چھاتے اٹھائے واپس آتا۔

☆☆☆

ایک کالم بغیر عنوان

صاحبو، آج اعلان ہوا ہے کہ پی آئی اے کے کرایے پچیس فیصدی بڑھ گئے، کل اعلان ہوا تھا کہ ریلوے کے کرایے بڑھ گئے، اس کے ساتھ ہی خبر آئی ہے کہ دودھ کا نرخ بھی بڑھ گیا ہے، پہلی اپریل سے ساڑھے تین روپے سیر ملا کرے گا۔ خالص یا ناخالص کی نہ آج تک کسی نے ذمہ داری لی نہ آگے لینے کو تیار ہے، یہ دودھ دینے اور دودھ پینے والوں کا انجی معاملہ ہے، اس میں حکومت یا حکومت کا کوئی ادارہ دخل دیتا اچھا نہیں لگتا، اس معاملے میں سختی کی جائے تو لوگ چیخ اٹھیں گے کہ اس ملک میں جمہوریت نہیں ہے۔ شہریوں کے حقوق نہیں ہیں۔



گویا صاحبو اب دوسینک سڑ پے کے دن گئے جب آپ شاداں وفرحاں گاڑی سے اترتے تھے اور دودھ پیتے ہوئے ہوائی جہاز میں جاسوار ہوتے تھے وہاں سے اترے، پھر دودھ پیا اور گاڑی میں آن بیٹھے، گاڑی کا تو یہ ہے کہ ریل اور ہوائی جہاز نہ سہی تا نگہ سہی تا نگہ نہیں، گھوڑا سہی۔ گھوڑا نہیں، لیکن آگے غیر شریفانہ جانوروں کی فہرست آ جاتی ہے، دودھ کا مسئلہ بھی زیادہ اہم نہیں ہے، اب ہم کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں، یہ سچ ہے ابھی چند سال پہلے تک پاکستان کو نو زائیدہ مملکت ہی کہا جاتا تھا،

اس وقت بھی جب کہ اس کی داڑھی مونچھیں نکل چکی تھیں، بیٹھا برس لگ کر اتر بھی چکا تھا، دودھ کا قصہ یہ ہے کہ اس نوزائیدہ قوم کو دودھ بھی ملا تو ڈبے کا ملا اور وہ بھی امریکی ڈبے کا۔ امریکی دودھ کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع میں اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن پچتا نہیں ہے، بچہ شروع میں موٹا ہوتا ہے، آخر میں سوکھ کر قاق ہو جاتا ہے، اب جب کہ اس کے دودھ کے دانت بھی ٹوٹ چکے ہیں، ہماری قوم کو دودھ کی زیادہ پروا نہ کرنی چاہیے۔



اصل میں مسئلہ گاڑی، ہوائی جہاز یا دودھ کا نہیں ہے ان کی تفصیل میں جانا غلط بحث کا موجب ہوگا، اصل مسئلہ محبت اور فرض، محبت اور ظالم سماج، محبت اور شادی، ہماری ساری فلمیں ہر پھر کے اسی مضمون پر آتی رہی ہیں، اب وہ دن گئے جب محبت پر فرض کو یا فرض پر محبت کو قربان کیا جاتا تھا، فلم کا مکالمہ بھی اس کے گرد گھومتا تھا، وودلوں کے ٹوٹنے پر اور جڑنے پر، ظالم سماج سے بغاوت پر اور دنیا کے اس نکرے چلنے پر آئندہ فلموں میں عاشق اور محبوب چاندنی راتوں میں یا مری کے سبزہ زاروں میں یہ گفتگو کیا کریں گے کہ آج کل شلہم کس بھاؤ میں؟ ہائے ری بجنی اب تو لٹھا بھی مہنگا ہو گیا، وغیرہ آئے وال کا بھاؤ محبت کرنے والوں کو فلم میں پہلے بھی بہ خوبی معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ اب فرق یہ پڑے گا کہ وہ لوگوں کو بھی بتایا کریں گے، ناچ کر، تھرک کر، گا کر، مکالمے بول کر۔

پچھلے ہنسنے بلکہ اسی مہینے کی شروع کی تاریخوں میں گھی ملنا بند ہو گیا تھا۔ انوا دیہ اڑی تھی کہ گھی کے رام فی سیر و روپے کم ہو گئے ہیں، پس احتیاط پسند دکان داروں نے مال اٹھایا ہی نہیں کہ کہیں سستانہ بیچنا پڑے۔ یہ انواہ ہم نے بھی سنی اور پہلے تو خوش ہوئے کہ اب گھی ہی گھی کھایا کریں گے لیکن پھر اس کے عواقب پر نظر گئی تو من میں مندی کا

ہیلہ پڑ گیا، تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ آج گھی کی قیمت کم ہوئی ہے، کل آنے کی ہو جائے گی، پرسوں والیں سستی ہو جائیں گی، پھر اوبدا کر بسوں گاڑیوں والے اپنے ریٹ گھٹا دیں گے، کپڑے والے بھی کپڑا سستا دیئے لگیں گے، وودھ والا بھی اصرار کرے گا کہ صاحب آئندہ میں ڈھائی روپے سیر کے بجائے دو روپے سیر دیا کروں گا۔ آپ کو لینا ہے تو لیجیے، نہیں لینا ہے تو نہ لیجیے، قصاب بھی کہے گا کہ حضور چودہ روپے سیر کی بات بھول جائیے، اب تو دس روپے دام دیا کیجیے گا اور اچھی بوٹی لیا کیجیے گا۔ جھنجھڑے مانگ کر شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں، گویا بالکل ہی کساد بازاری کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ آج کل فرو کوئی چیز نہیں ہے، ہماری آپ کی مہنگائی ذاتی مہنگائی ہے، ملک کی G.N.P وغیرہ کو دیکھنا چاہیے آپ نے سنا ہوگا کہ مہنگائی تو ترقی پذیری کا لازمہ ہے، جس دن مہنگائی رک گئی، سمجھیے ہماری ترقی رک گئی۔

روزنامہ جنگ دہلی در معقولات مورخہ ۶/۷/۷۹ ۲۹



بجٹ کی باتیں

اب کے بجٹ کے اعلان پر وہ جہاں ہی نظر نہیں آتی جو نظر آیا کرتی تھی، کچھ لوگ واہ واہ سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا یا کرتے تھے۔ مبارک باد کے جلسے برپا کیا کرتے تھے کچھ اخباروں میں صدر مملکت کے نام اپیلیں شائع کرتے تھے کہ فریاد ہے فریاد ہے فریاد ہے فریاد ہے، غم کی کہانی ہے، سن لیجیے پریشان بیانی ہے، سن لیجیے۔ اب کے مرکز میں ٹیکس زیادہ نہیں لگے۔ کسی کی طرف سے اس قسم کا بیان نہیں آیا جس طرح کا ہم نے دو تین سال پہلے دیکھا تھا۔ جب ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کے کھانے پر ایکسائز ٹیکس حاید ہوا تھا۔ بالکان ریسٹوران یونین نے اشتہار شائع کرایا تھا۔

ہوٹل پر ڈیوٹی مبارکباد

بناب والا! نئے مرکزی بجٹ میں بڑے ہوٹلوں پر جو دس فیصد ایکسائز ڈیوٹی لگی ہے، اس کا ہم تادل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

لیکن جناب والا! ریسٹوران جن کا مقصد شہریوں اور مسافروں کی بے لوث خدمت کرنا ہے، ان پر ایکسائز ڈیوٹی لگانا ظلم کرنا ہے۔ لہذا ہم ملتیں ہیں کہ..... ہم اس موقع پر اس قسم کے اشتہارات اخباروں میں دیکھنا چاہتے تھے۔

گھوڑ دوڑ پر ٹیکس بہت ضروری تھا

حضور! والا آپ نے گھوڑ دوڑ کے ٹکٹوں پر جو ایک روپیہ فی ٹکٹ ٹیکس لگایا ہے اس کا ہم فلم ڈسٹری بیوٹن ایسوسی ایشن والے بے ول سے خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ گزارش کریں گے کہ یہ کم ہے۔ یہ ملک اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ یہاں گھڑ دوڑ ہو بلکہ اس لیے کہ یہاں فلمیں بنائی جائیں اور لوگوں کو دکھائی جائیں تاکہ ان میں دشمن کو لکارنے اور بڑھک مارنے کی اہلیت پیدا ہو۔

جناب والا! آپ نے گھوڑ دوڑ کے ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ سینما کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگایا ہے اس سے لوگوں کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ آپ گھوڑ سے گدھے میں فرق نہیں کرتے۔ سینما وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ہم لوگوں کو راتوں کی نیندیں حرام کرنے والی اور موئے ہوؤں کو چوکھانے والی خرف ناک، دہشت انگیز اور سنسنی خیز فلمیں نہ دکھاتے تو یہ قوم خراب غفلت میں غرق ہوتی اور ملک کا دفاع کمزور ہو جاتا۔ رومانی اور جسمانی فلموں کی عدم موجودگی میں نئی پود کو جینے کا سلیقہ بھی نہ آتا۔ پنڈت کوکا کو آنجہانی ہوئے تو صدیاں ہوئیں ان کو عشق کے آداب کون سکھاتا۔

پس جناب والا گزارش ہے کہ....

یہ فرض کرتے ہوئے کہ جوتوں، کپڑوں، گھی وغیرہ پر بھی ڈیوٹی لگی ہے جیسی کہ لگا کرتی تھی۔ ہم اپنے تو سن خیال کو یوں بڑھاتے ہیں بلکہ کالم کے میدان میں بڑھاتے ہیں۔

سینما پر ٹیکس کا خیر مقدم

حضور والا! نئے بجٹ میں سینما کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے، وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے اور موجودہ حکومت کے انقلابی اور عوامی ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ سینما سے اخلاق بھی خراب ہوتا ہے اور آنکھیں بھی۔ مہم کہ جوتوں سے نہ اخلاق خراب ہوتا ہے نہ آنکھیں بلکہ اسکول کالج کی طالبات اس سے کبھی کبھی لوگوں کے اخلاق درست کرنے کا کام بھی لیتی ہیں۔

جناب والا! جوتے ہر شخص کے کام کی چیز ہیں۔ غریب انہیں پہنتے ہیں اور قوی خدمت گاران میں وال بانٹتے ہیں، بس گزارش ہے کہ جوتوں پر سے ٹیکس اٹھا کر جوتا مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی وحائیں لی جائیں۔

جوتوں پر ٹیکس ضروری تھا

حضور والا! آپ نے جوتوں پر ٹیکس لگا کر جو جوتوں والوں کو جوتا دیا ہے، اس کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ امید ہے اب ان لوگوں کا دماغ ٹھکانے آ گیا ہوگا۔ لیکن جناب والا کاغذ پریڈیوٹی انصاف سے سراسر بعید ہے۔ ہم تاجر ان کتب و اخبارات فردغ تعلیم کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ یہ نئی ڈیوٹی فوراً منسوخ کی جائے، فلم پروری ہوگی۔

کاغذ پریڈیوٹی ضروری تھی

جناب والا! ہم آپ کو کاغذ پریڈیوٹی لگانے پر سہار کبا دیتے ہیں، یہ بہت ضروری

تھی۔ آخر کتابوں اخباروں کا کیا فائدہ ہے۔ یہ چیزیں بے کار نہ ہوتیں تو لوگ ان کو ردی میں کیوں بیچتے۔ محض کاغذ کے سستا اور کھل الحصول ہونے کے باعث بے شمار لوگوں نے مصنف یا اخبار نویس بن کر اپنا مستقبل تباہ کر لیا ہے البتہ جناب والا ہم تاجرانِ داڑھیار ان بنا سیتی گھی کو ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ کیا جائے کیونکہ اس کا امنا سے گہرا تعلق ہے جو ایک مقدس جذبہ ہے۔

بنا سیتی گھی پر ڈیوٹی اور بڑھائی جائے

حضور انور! آپ نے بنا سیتی گھی پر ڈیوٹی حاید کر کے قوم کے دلوں کی آواز سن لی۔ ہم نے ان لوگوں کا اشتہار دیکھا ہے جس میں آپ کو مکھن لگانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ مکھن کسی طرح خالص نہیں ہے لیکن ہم جو سگریٹ پبلک کے افادے کے لیے تیار کر کے بازار میں دیتے ہیں۔ ان میں بعض میں خالص ہاتھی کی لید ہوتی ہے کسی اور لید کی آمیزش نہیں کرتے۔ جناب والا سگریٹ ایک معاشرتی ضرورت ہے جب کہ آپ نے فی وی کے اشتہاروں میں دیکھا ہوگا۔ محبوب کو اپنے قدموں میں لا کر گرانے کا واحد نسخہ یہ ہے کہ اس کے سامنے سگریٹ پیا جائے۔ حضور والا! سگریٹ کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ اس سے کھانسی ہوتی ہے، دمہ ہوتا ہے، دوائیں بکتی ہیں۔ فن طب کو فروغ ہوتا ہے۔ گورکنوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ پس سگریٹ پر سے یہ نیا ٹیکس ہٹایا جائے۔

سگریٹ بند کیجیے

جناب والا! سگریٹ پر جو ڈیوٹی لگائی گئی ہے اس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے کاربگر سگریٹ پیتے ہیں جس سے ہمارے کام کا حرج ہوتا ہے۔ ہم آل پاکستان مالکان

کھڑی یونین ملتیں ہیں کہ سگریٹ پر ادھر زیادہ ٹیکس لگایا جائے اور یہ ٹیکس آپ کھڑیوں پر سے ہٹا کر اس پر لگا سکتے ہیں۔ آپ کو زیادہ زخمی نہیں ہوگی جناب والا یہ بھی گزارش ہے کہ کھڑی میں کھ پرز برپڑھی جائے پیش نہ لگائی جائے۔ ہم پارچہ باف ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ فلک کج رفتار نے ہمیں بھٹکی جا کر رکھ دیا ہے۔

کھڑیوں پر ٹیکس جائز ہے

حضور فیض گنجوڑ نے بحث میں کھڑیوں پر جو ٹیکس لگایا ہے، وہ نہایت مستحسن ہے بلکہ بہت کم ہے۔ اگر مراد کپڑے بننے کی کھڑیوں سے ہے تو یہ غیر ضروری ہیں۔ جب ہمارے اسلاف درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے ستر پوشی بہ خوبی کر لیتے تھے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ بشرطیکہ اس کی ضرورت سمجھیں۔ اگر کھڑیوں پر ٹیکس لگایا گیا ہے تب بھی عین مناسب ہے۔ ہماری قوم کو کھلے کھیتوں میں جا کر حاجات ضروریہ کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ ہمارے کھیت زر خیز ہوں، پیداوار بڑھے اور زر مبادلہ کمایا جاسکے۔ آج کل سارا زر مبادلہ کھڑیوں کی چار دیواری میں رہ جاتا ہے۔ البتہ جناب والا! گھڑ دوڑ کے مکٹوں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے، اسے انجمن شائقین گھوڑ دوڑ پسند نہیں کرتی۔ یہ نہ صرف قوی مفاد کے خلاف ہے بلکہ اس سے اسلام بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ ہماری پرانی اسلامی روایت ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ آپ نے کیا ہو تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بزرگ بحر ظلمات میں گھوڑے وہڑایا کرتے تھے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی کسی بات کا تو پاس کرنا چاہیے۔ بالکل ہی ناخلف نہیں ہونا چاہیے۔ بس حضورہ الا.....

(روزنامہ امروز ۷-۶-۲۳)



ہونہار طالب علموں کے درمیان

ہمارے دوست حسنین کاظمی نے کراچی ایئرپورٹ کے عین سامنے علامہ اقبال کالج قائم کر رکھا ہے۔ یہ مقام شاید انہوں نے عدیم الفرصت مسافروں کی سہولت کے لیے چنا ہے کہ شہر سے ہوائی اڈے جاتے ہوئے راستے میں تھوڑا رک کر ایف اے۔ بی اے پاس کرتے جائیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا کہ شہر سے چلے تو الف کے نام بے نہ آتی تھی۔ ہوائی اڈے پر سامان تلوانے لگے تو فضیلت میں بھاری بھر کم پائے گئے اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ حسنین کاظمی صاحب ڈگریاں لیے کالج کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں جو گزرا اس کو ایک تھمادی۔ علم ان کے کالج کا خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ ہوائی اڈے کو دیکھتے ہوئے کیا ہم مضمون کی ہوا اتنی بھی نہ باندھیں۔



گزشتہ ہفتے انہوں نے ہمیں یاد فرمایا کہ طالبات کی بزم ادب کا افتتاح ہے۔ ہم نے کہا۔ من آئم کہ دانم۔ ہم عزت کے لائق نہیں۔ حسنین کاظمی نے ہم سے اتفاق رائے کیا اور کہا اسی لیے ہم نے ریڈ اے بخاری صاحب کو بھی بلا لیا ہے اور فلاں صاحب اور فلاں صاحب کو بھی۔ آج کل کس نفسی کرتے بھی احتیاط چاہیے۔ دہ زمانے گئے جب کوئی خود کو جتنا گراتا تھا اتنا اونچا مرتبہ پاتا تھا۔ آج آپ خود کو ننگ اسلاف یا

آوارہ کوئے نااہلماں وغیرہ کہیں گے تو لوگ اس کا وہی مطلب سمجھیں گے جو دشمنی میں ہے۔ حسنین کا ظلمی صاحب کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ آداب و تکلفات سب جانتے ہیں لیکن ہماری بد قسمتی کہ ہمیں بھی جانتے ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ جن دنوں ہم نے نیانیا۔ ایم۔ اے پاس کیا تھا تو ہم اور وہ ایک ہی کالج میں پڑھاتے تھے۔ جو رائے انہوں نے اس زمانے میں ہمارے متعلق قائم کی تھی، اسی پر قائم ہوں گے۔ حالانکہ ہم نے جو رائے ان کے متعلق اس وقت قائم کی تھی اس پر اب قائم نہیں۔

حسنین صاحب نے ہمیں خبردار کروایا تھا کہ کچھ نہ کچھ بولنا ہوگا۔ صدارتیں کرتے اور مہمان خصوصی بنتے ہمیں تقریر کا ایک ڈھب آ گیا ہے۔ اور یوں بھی ہمیں معلوم تھا بخاری صاحب موجود ہیں۔ ان کی عمر ہی تقریریں کرتے کرتے گزری ہے۔ ہم تک شاید دو درجام نہ آئے۔ حد سے حد کوئی غزل ارشاد کرنے کو کہے گا کہ آج کل مگنی ہو یا میلا و شریف۔ انجام سب کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ سو وہ ارشاد کرویں گے۔ پھر وہیں سر تقی شفیق صاحب نظر آئے۔ وہ پروفیسر ہیں۔ علمی ادبی باتیں ہم نے ان پر چھوڑ دیں۔ پروفیسر محمد فائق صاحب بھی کہ اتوار کے اتوار ریڈیو پر صبح دم دروازہ خاور کھولتے ہیں۔ اسٹیج پر رونق افروز نظر آ گئے۔ اب ہم بالکل پختہ ہو گئے کہ ان صاحبوں کی تقریروں کے بعد دقت ہی کہاں بچے گا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ یعنی ہمیں بولنا پڑا۔ لیکن وہ الگ حکایت ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلے پہیلیاں بکھوائی جائیں گی۔ اس کام کے لیے فائق صاحب سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف کالجوں کی ٹیموں کو آنا تھا۔ موالات پر چیوں پر لکھے تھے اور پرچیاں گڈنڈ ایک ڈبے میں تھیں۔ طریقہ قرعہ اندازی کا تھا۔ ایسے موقع پر کسی معصوم بچے سے پرچیاں اٹھوائی جاتی ہیں۔ لہذا یہ فرض ہمارے بخاری صاحب نے انجام دیا۔ سب سے پہلی پرچی جونکی وہ یہ تھی کہ ”چاند نگر“ کس شاعر کا مجموعہ کلام

ہے۔؟“

سب چپ۔ اتنے مشکل سوالات پوچھنے بھی نہ چاہئیں۔ خصوصاً کالج یونیورسٹی کے طلبہ سے۔ آخر فائق صاحب نے تھوڑا اشارہ دیا کہ ممکن ہے دو شاعر اسٹیج پر ہی بیٹھا ہو اس پر ہونہار طالب علموں کی طرف سے جواب دیا۔ ”بخاری صاحب کا۔“ ایک ہی ہمارا مجموعہ کلام ہے۔۔۔ وہی ظالموں نے سمرقند و بخارا کی طرح بخاری صاحب کو بخش دیا۔ ہمارا ناخوش ہونا تو قدرتی تھا لیکن بخاری صاحب ہم سے زیادہ ناخوش نظر آئے۔ بدیں وجہ کہ اس قسم کا کلام مجھ سے کیوں منسوب کیا۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے اور بخاری صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اتفاق سے تیسرا چوتھا سوال یہ نکلا کہ وہ کون سا شعر ہے جسے دو شاعروں نے مل کر لکھا۔ طالب علم تو کیا بتاتے۔ فائق صاحب ہی نے بتایا کہ شعر یہ ہے۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سو جھی

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سو جھی

یہ بھی تشریح کی کہ اس کا ایک مصرع جرات کا ہے۔ ایک انشا کا ہے۔ اس پر ایک صاحبہ جو ہمارے قریب بیٹھی تھیں ہمارے کان میں پوچھنے لگیں کہ ان میں پہلا مصرع آپ کا ہے یا دوسرا؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلاتے کیا

اس پر ہمیں پیکنگ گا واقعہ یاد آ گیا جہاں سفارت خانے کے افسروں کی بیبیوں نے ہم پاکستانی ادیبوں کے اعزاز میں دعوت دی تھی۔ ان بیبیوں کو ہم نے ہر طرح کی غزلیں سنائیں۔ عاشقانہ۔ ناصحانہ۔ فلسفیانہ مسخوفانہ وغیرہ لیکن وہ دپٹے اوڑھے احتراماً بیٹھی رہیں۔ ہم شرمندہ سے ہو کر بیٹھ گئے۔ تو پاس والی بی بی نے ترس کھا کر ہم سے بات کرنا ضروری سمجھ کر کہ ”یہ غزلیں جو آپ نے پڑھیں، آپ کی اپنی لکھی ہوئی

تھیں؟“

خیر دیگر سوالات اتنے مشکل نہ تھے اور پھر مطالعہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ذہانت اور قیاس آرائی بھی تو ہوتی ہے۔ فائق صاحب نے پوچھا۔ دربار اکبری کس کی تصنیف ہے۔ کسی نے کہا۔ اکبر الہ آبادی کی فسانہ آزاد کے نام ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہوگا۔ یادگار غالب کا غالب کی تصنیف ہونا بھی آسانی سے دریافت ہو جاتا ہے اور موازنہ انیس دہیر کے متعلق یہ بتانا بھی کچھ مشکل نہیں کہ انیس اور دہیر دونوں نے مل کر اسے لکھا۔ یہی حال اشعار کا ہے کہ بعض اوقات شعر خود بول اٹھتا ہے کہ میں کس کی تصنیف ہوں۔ مثلاً

درد دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
(حسرت موہانی)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
(داغ دہلوی)

دیکھیے پاتے ہیں عشاق جنوں سے کیا فیض
(فیض احمد فیض)

حیراں ہوں دل کو ردوں کہ پیوں جگر کو میں
(جگر مراد آبادی)

ہاں ایک شعر ایسا بھی ہے کہ تہا ایک آدمی کی تصنیف نہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اسے غالب ناخ اور میر تینوں نے مل کر لکھا۔ اتنا اچھا شعر ایک شاعر تنہا لکھ بھی نہیں سکتا۔



آج کل کے طالب علم صرف کتابیں نہیں پڑھتے رسالے بھی پڑھتے ہیں۔ جب فائق صاحب نے پوچھا کہ اچھا اردو کے تین ادبی رسالوں کے نام بتائیے تو ایک طرف سے کوئی بولا۔ کہ ایک تو اردو ڈائجسٹ۔ باقی بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ اب کے فائق صاحب نے پھر ایک مشکل سوال پوچھا کہ نیاز فتح پوری مرحوم کے پرچے کا کیا نام ہے۔ طالبات کوچہ کنم میں دیکھ کر فائق صاحب نے اشارہ بھی دیا کہ اس نام میں ن بھی ہے گ بھی ہے۔ ابھی ہے۔ افسوس کہ الف انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ بھی بتا دیتے تو کچھ عجب نہیں کوئی طالب علم بتا ہی دیتا کہ نگار کو پوچھا ہے۔

(اخبار جہاں باتیں انشاجی کی ۷۰-۵-۲۰)



ترجمہ کرا لیجیے، تقریر لکھوا لیجیے سودا منگوا لیجیے.....

یہ زمانہ کمپیوٹر کا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر کام کمپیوٹر سے لیا جانے لگا ہے۔ لوگ یہ تک کمپیوٹر سے پوچھتے ہیں کہ آج نہائیں کیا، نچوڑیں کیا، سنا ہے نہانا ہو تو کمپیوٹر صابن لگا لگا کر اور مل کر نہلا بھی دیتا ہے۔ گھر کی بی بیوں بھی کمپیوٹر ہی سے پوچھتی ہیں کہ آج کون سی سبزی پکانی جائے۔ بھنڈی یا کرلے، آپ کو فرصت نہ ہو تو کمپیوٹر سبزی بھی لا دیتا ہے۔ پکاریندھ کے آپ کے سامنے بھی رکھ دیتا ہے۔ جھاڑو بہارو بھی کر دیتا ہے۔ ایک طرح سے مغربی معاشرے میں اب مردوں کی سرے سے ضرورت نہیں ہی۔ مردان ہی کاموں کے لیے تو ہوتے ہیں۔



ہمارے ہاں فی الحال ابتداء ہے۔ ہمارے ٹیلی فون کے محکمے والے بل خود بنانے کے بجائے کمپیوٹر سے ہواتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پہلے ہمارے بل میں صرف کالوں کا خرچہ شامل ہوتا تھا، اب کمپیوٹر کا خرچہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ ایک صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ کچھ کالیں ہم کرتے ہیں، زیادہ کالیں ہمارے نمبر سے خود کمپیوٹر کرتا ہے۔ لاہور کی ایک

صاحبہ نے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں کہ ہم نے بلوں سے بچک آ کر ٹیلی فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ پڑوس میں ایک رشتے دار خاتون رہتی ہیں اشد ضرورت کے لیے بھی ان ہی کے ہاں جا کر فون کرتے رہے لیکن بل وہی۔ ڈھائی سو روپے تین سو روپے شکایت کرو تو جواب یہی کہ ہماری مشین غلطی تھوڑی ہی کر سکتی ہے۔ یہ انسان تھوڑی ہی ہے۔



کمپیوٹر جسمانی کار ہی نہیں کرتا۔ وماغی کام بھی کرتا ہے۔ اب تو اس قسم کے کمپیوٹر بھی ایجاد ہو گئے ہیں جن سے آپ ترجمہ کرا لیجیے، نظم لکھوا لیجیے، فلم کے لیے چربہ کہانی اور اخبار کے لیے چربہ کالم تک لکھ دیتے ہیں۔ انہیں کسی کالم نگار کا ایک کالم ایک بار سنا گھا دو۔ اس کے بعد ایسے ہی فقرے ویسی ہی چھوٹی بڑی لائنیں ویسے ہی عنوانات لے لو کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ۔ اب رہا اصل اور نقل میں ڈالنے کا فرق اور تاثر کا فرق۔ سو آج کل زمانے کا مذاق یہ چل رہا ہے کہ بچے کو اصل گھی کھلاؤ تو یہ مامتا کے حنائی سمجھا جاتا ہے۔ مچ مچ کی مامتا کا ثبوت دینے کے لیے کسی نہ کسی بنا سستی گھی کی سند لاتے ہیں۔



مشہور امریکی مزاح نگار آرٹ۔ نچوالڈ کا کہنا ہے کہ امریکہ کے صدر نکسن بھی اپنی تقریریں خود تھوڑی لکھتے ہیں۔ کمپیوٹر سے لکھواتے ہیں۔ پچھلے دنوں کمبوڈیا میں فوجیں بھیجیں تو ضرورت پڑی کہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے ایک مدلل بیان دینا چاہیے۔ کمپیوٹر کو اس قسم کے بیانات کا پرانا تجربہ ہے۔ ویت نام میں مداخلت کے وقت بیان دیے گئے۔ کیوبا میں مداخلت کے وقت دیے گئے۔ ڈومینکن ری پبلک میں مداخلت کے وقت دیے گئے۔ پس صدر نکسن کے سیکریٹری نے کمپیوٹر کا مٹن دبایا اور جوابات رقم

ہونے شروع ہو گئے۔

سوال کیا گیا کہ ہم امریکہ سے ہزاروں میل دور فوجیں کیوں بھیجا کرتے ہیں؟

ترنت جواب آیا۔ ”اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے۔“

سوال: ”کب وڈیا میں ہم نے مداخلت کیوں کی ہے؟“

جواب: ”جنوبی دیت نام میں جمہوری راج قائم کرنے لیے۔“

سوال: ”شمالی دیت نام نے کس چیز کی خلاف ورزی کی ہے؟“

جواب: ”کب وڈیا کی غیر جانبداری کی۔“

سوال: ”امریکی عوام کو کیا کہہ کر پرچایا جائے؟“

جواب: ”یہ کہ یہ موقع امریکی عوام کی حب الوطنی اور عزم و ہمت کے امتحان کا

ہے۔“

سوال: ”مزید کچھ ارشاد ہو؟“

جواب: ”ہاں، یہ اضافہ کر دیجیے کہ ہم جارحیت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ امریکی

عوام سیسنہ پلائی دیوار بن جائیں گے۔ ہم ہر محاذ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ آزادی اور

جمہوریت۔“

”بس بس کافی ہے۔“



کمپیوٹر کے متعلق یہ بات ہمارے قارئین کرام کو معلوم ہوگی کہ اس میں جو کچھ ڈالو
وہی موقع محل کے لحاظ سے نکلتا ہے، تقریریں لکھوانے والے کمپیوٹروں میں ہر موقع کی
سیاسی تقریریں، سیاسی بیانات، ادبی تقریریں، معاشرتی تقریریں، تجارتی تقریریں وغیرہ
بھری رہتی ہیں۔ آپ کو اگر تجارتی تقریر کرنی ہے جس میں سامعین صرف پیسے اور
آڑھتی ہیں اور ساڑھے چار حنٹ کی تقریر چاہیے تو مطلوبہ ٹن دبا دیجیے۔ آپ کی دلی

مراد کھٹ سے پوری ہو جائے گی۔ ادبی تقریریں کا جن دو سرا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کے کمپیوٹر ہمارے ملک میں بھی آگئے ہیں اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ہم مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں، قباحہ صرف یہ ہے کہ..... خیر ہم بات کو مثال دے کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔



پچھلے ہفتے انجمن عرفان نوریات ضلع کچہری کی سالانہ کانفرنس تھی۔ ہمیں صدارت کرنے کی دعوت دی گئی۔ ہمیں مختصر طور پر یہ تو معلوم تھا کہ ان لوگوں کے کچھ مسائل اور مطالبے ہیں لیکن ان کا حل کیا تجویز کریں، یہ نہیں معلوم تھا، آخر ایک صاحب نے کمپیوٹر کی بھائی۔ یہ کمپیوٹر تقریریں لکھوانے والا سب سے بڑا کمپیوٹر ہے۔ آج کل جتنی بھی تقریریں آپ جلسوں میں سنتے ہیں، اخباروں میں دیکھتے ہیں، اسی کمپیوٹر کی لکھی ہوئی ہیں۔ ہم نے من و با کر کہا۔

”حیاں کمپیوٹر! السلام علیکم۔ مزاج شریف؟“

جواب آیا۔ ”فضول باتیں مت کیجیے۔ سوال کیجیے۔“

ہم نے کہا۔ ”عرفان نوریات کی حالت کیسے بہتر ہو سکتی ہے؟“

جواب: ”نظریہ پاکستان کی حفاظت کیجیے۔“

سوال: ”یہ لوگ دھوپ میں بیٹھتے ہیں، کچہری میں سایہ دار جگہ نہیں۔ اس کا حل؟“

جواب: ”پاکستان میں کوئی ازم نہیں چلے گا۔“

سوال: ”کارپوریشن والے عرفان نوریات کو تنگ کرتے رہتے ہیں ان کو روکنے کی

کوئی سبیل۔“

جواب: ”نظریاتی سرحدوں کی حفاظت۔“

سوال: ”اے میاں کمپیوٹر سوال از آسمان جو ان از زمین سہاں۔“

جواب: (قطع کلام کرتے ہوئے۔) ”میں فارسی کا کمپیوٹر نہیں ہوں‘ اردو بولے۔“

سوال: ”آخر اعتراض نویس کیا کریں‘ کہاں جائیں؟“

جواب: ”تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں“

سوال: ”ہیاں کمپیوٹر‘ یہ تم نے پہلی بار بر محل جواب دیا ہے۔ لیکن اس سے آگے کیا

لکھیں۔ خاصی لمبی تقریر کرنی ہے ہمیں؟“

جواب: ”لکھیے۔ ہم طاغوتی طاقتوں کے خلاف سر دھڑکی بازی لگا دیں گے۔ سر

سے کفن باندھ کر نکلیں گے۔ کشتوں کے پُش پُش پُش۔“

معلوم ہوا کہ کوئی اسپرنگ ٹوٹ گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ جوش میں آنے کا نتیجہ یہ

ہی ہوتا ہے۔

(باتیں انشاء جی ۷۰-۶۰-۱۳ اخبار جہاں)



آنا ہمارا

اتنے الیکشن ہوئے۔ قومی اسمبلی کے صوبائی اسمبلی کے، صیو سہیل کارپوریشن کے اور بی ڈی کے۔ یہ پہلی بار ہے کہ ہمارا ووٹ بنا ہے۔ یہ گمان نہ کیا جائے کہ حق رائے دہندگی بالغان کی وجہ سے بنا ہے کیونکہ بالغ تو ہم عمر کے لحاظ سے ایک زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ بس نہیں بنا۔ کوئی نہیں آیا ہمارا نام لکھنے اور ہمارا نام ووٹروں میں آ جاتا تو لوگ شاید ہماری بے لوث قومی خدمات پر نظر کرتے ہوئے ہم سے اصرار کرتے کہ ممبر بن جائیے قومی اسمبلی کے نہ سہی۔ صوبائی کے سہی۔ صوبائی کے نہیں تو میونسپل کارپوریشن کے سہی۔ وہ بھی نہیں تو بی ڈی کے سہی۔ کھڑے ہوتے تو یقیناً منہانت ضبط کراتے۔ حریف کی نہیں اپنی کیونکہ ہمارے ملک میں جو ہر قابل کی قدر نہیں۔ گویا ہمارا نام فہرستوں میں جو نہیں آیا تو یہ بھی اچھا ہوا، برانہ ہوا۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت خداوندی ہوتی ہے۔

بارے الیکشن کمیشن کی شائع کردہ نئی فہرست شائع ہوئی۔ اس میں ہم نے اپنا نام شامل دیکھا۔ لیکن بایں طور کہ ہم آپ بھی شرمسار ہیں اور مرزا مظفر الحسن کو بھی شرمسار کر رہے ہیں۔ ڈالنے والے نے ہمیں عورتوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ عمر ہم نے یوں بھی ایک دو سال کم کر کے لکھی تھی۔ فہرست بنانے والے نے بھی عورتوں کو

روایتی کم عمری کی رعایت سے اور چھوٹا کر دیا۔ اور پچیس سال کا بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے فہرست بنانے والوں کی نظر سے ان دو خواتین کی گفتگو کا لطیفہ گزر چکا ہے۔ جن میں سے ایک کہہ رہی تھی کہ ”میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی جب تک پچیس سال کی نہیں ہو جاتی۔“

دوسری نے کہا۔ ”بی بی! میں تو اس وقت تک پچیس سال کی نہیں ہوں گی جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی“ فہرست بنانے والوں میں یہ بیاں بھی شامل تھیں۔ ہمارے ساتھ یہ رعایت کسی بی بی نے برقی ہوگی کہ عمر مناسب رکھی۔ اور رائج نہیں ہونے دیا۔ شکریہ آپ کی عنایت کا۔

آج کل عورتوں مردوں کے درمیان سے ناموں کا پردہ بھی اٹھ گیا ہے۔ عصمت، مسرت، نعیم، نسیم، شمیم، طلعت، رفعت وغیرہ ادھر بھی ہیں، ادھر بھی۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ دن گئے جب عورتیں سیکنڈ فاسٹ زلیخا وغیرہ ہوتی تھیں اور مرد گھیسٹے خان، عبداللہ، الہی بخش، ابراہیم بیگ وغیرہ ہوا کرتے تھے جہاں عورتوں، مردوں میں تعلیم۔ پوشش ہارسنگار کے فرق مئے، یہ فرق بھی نہ رہا۔ لیکن ابن انشاء کے نام پر ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ ہمیں عورتوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے جو ہر چند کہ ہماری عزت افزائی ہے۔ لیکن ہمیں منظور نہیں۔ ہم ایک زمانے میں عورتوں کے ایک اخبار میں کالم لکھا کرتے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ کان نمک ہونے کی وجہ سے لوگ نمک نہ سمجھ لگیں، اپنی تصویر ساتھ چھاپ دیا کرتے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ ہمارے محلے کے ناموں کی فہرست بنانے والا یا بنانے والی اسی اخبار کی قاری رہ چکی ہو یا رہ چکا ہو۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

مشکل یہ ہے کہ ہم کسی خاتون کے لیے ووٹ ڈالنے جائیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ مرد کو ڈالنے جائیں گے تب بھی پکڑے جائیں گے۔ اس جمہوریت نے تو ہمیں

کہیں کا نہیں رکھا۔ ہم نے فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہماری والدہ عمر میں ہم سے دو سال چھوٹی ہیں۔ اور ہماری سب سے چھوٹی بہن ہم سے تین سال بڑی ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری والدہ ہماری چھوٹی بہن سے پانچ سال چھوٹی ہو گئیں۔ لکھنے والوں نے بس اتنی احتیاط رکھی ہے کہ ان کو بالغ رہنے دیا ہے۔ ورنہ اپنی اولاد سے تو گنی تھیں، ووٹ سے بھی جاتیں۔



ہمیں یاد ہے لاہور میں ایک زمانے میں دو ٹروں کی فہرستیں چھاپنے کا کام ایک ایسے ٹھیکیدار کو دیا تھا جو کتابوں کے پیسے بچانا چاہتے تھے۔ کچھ ضرورت مند ادیبوں نے اس سے قطع نظر کہ ان کا خط کیسا تھا بطور کتاب اپنی خدمات پیش کر دیں۔ قیص اتار کر بیٹھ گئے اور پہلے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔ اجرت کارگزاری کے لحاظ سے تھی۔ شاید چار آنے صفحہ۔

دیر یا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے
نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کشتیاں درمیان ہی میں رہیں۔ بیٹا بالغ ہے باپ نابالغ ہے۔ نہ ولدیت کا پتا نہ سکونت کا سراغ۔ نہ نام صحیح نہ مقام صحیح۔ فہرستیں چھپ کر آئیں تو چھاپنے اور چھپوانے والوں نے سر پیٹ لیا اور الیکشن ملتوی ہو گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ اب کے بھی کسی نے الیکشن کو ملتوی کرانے کے لیے ہمارے ساتھ یہ وارداتیں کی ہیں لیکن اصل وجہ اس تذکیر و تانیث کے پھیر کی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

ہم نے پوری فہرست کا مطالعہ نہیں کیا ہو سکتا ہے تمام ادیبوں، صحافیوں کو اس طرح عورتوں کے خانے میں ڈال دیا گیا ہو جس طرح ایک زمانے میں ارباب خطاط کے خانے میں ڈالا گیا تھا۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بد گمانیاں ہیں

ممکن ہے زینب بی بی یا یاسمین خاتم کو مردوں میں شامل کر کے حساب پورا کر دیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں تو آئندہ عورتوں مردوں کی علیحدہ صفت بندی کا جھنجٹ نہیں ہونا چاہیے۔ برب زندگی میں جھنجٹ نہیں تو فہرستوں میں کیوں۔ آپ نے سنا ہوگا۔ کہیں کھیل ہو رہا تھا کسی تماشاخی نے کہا۔

”بھئی یہ لڑکی بہت اچھا کھیلتی ہے۔“ پاس سے آواز آئی۔ ”یہ لڑکی نہیں ہے لڑکا ہے۔ میرا بیٹا ہے۔“

پوچھنے والے نے کہا۔

”تو گویا آپ اس کے باپ ہیں؟“

مخاطب نے بہت احتجاج کیا اور کہا۔

”بد تمیز کہیں کے۔ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔“

(اخبار جہاں باتیں انشاجی کی ۷۰-۲-۱۱)



چیٹ چوری پٹ فیصلہ

لاہور کی خبر ہے کہ یہاں پچھلے دنوں سائیکل چوری کے ایک مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ ۷ اگست ۱۹۵۲ء کو ایک شخص عبدالحمید کی سائیکل چوری کرنے کے الزام میں دو افراد کے خلاف رپورٹ درج کرائی گئی تھی جن کے نام خبر میں مسلمان عبدالحمید اور جاوید اقبال بتائے گئے ہیں۔ مجسٹریٹ نے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں حتمی فیصلہ سنا دیا اور ملزموں کو بری کر دیا۔ رپورٹ درج کرانے اور فیصلہ سنانے کے درمیان فقط چوبیس سال ہوتے ہیں۔

چوبیس سال تو مومن کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ سکندر اعظم کی آمد بظاہر کل کا واقعہ معلوم ہوتی ہے اور محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے بھی۔ ممکن ہے کچھ چشم دید گواہ بھی ان واقعات کے نکل آئیں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ان دونوں واقعات پر صدیاں گزر چکی ہیں۔ دور کیوں جاسیے ویدہ ورکا پیدا ہونا کوئی ایسی بڑی بات معلوم نہیں ہوتی۔ بعض لوگ تو یہاں تک دعوے کرتے ہیں کہ آپ آج آرڈرو بیچے ہم کل دس دیدہ ور پیدا کروں گے جن کی بغل میں یوم اقبال کے جلسوں میں پڑھے جانے کے لائق زنانے کے مقالے لکھی ہوں گے۔ حالانکہ خود حضرت اقبالؒ نے جو پیہم رواں پیہم دواں قسم کی باتیں کیا کرتے تھے اس کے لیے ہزاروں سال نرگس کے رونے کی

شرط رکھی تھی۔ یہاں ہم فٹ نوٹ کے طور پر عرض کر دیں کہ اقبال کے ایک شارع نے شعر کی شرح کرتے ہوئے نرگس راج کپور کا نام لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ نرگس سلہا کی عمر علامہ اقبال کے انتقال کے وقت اتنی زیادہ نہ تھی۔ کم از کم ہزاروں برس تو ہرگز نہ تھی۔ پھر نرگس راج کپور کا بے نوری ہے کچھ تعلق نہیں۔ وہ تو نور علی نور ہیں یا کچھ سال پہلے تک تھیں۔ علامہ اقبال کا اشارہ کسی اور نرگس کی طرف رہا ہوگا۔



خیر ذکر سائیکل کا ہو رہا تھا جو بوجہ ہماری علیست کے علامہ اقبال کی طرف نکل گیا بلکہ زمان و مکان کے مسائل میں جا الجھا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ دو پیسے کی سائیکل کے مقدمے کا فیصلہ اتنی جلدی یعنی ۲۴ سال میں ہو جانا بڑی حیرت کی بات ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ کوئی چار پیسے کی موٹر چوری ہو تو اس کا فیصلہ ہونے اور چوری کے ملزموں کے بری ہونے میں نصف صدی سے زیادہ وقت نہ لگے گا۔ علامہ اقبال ۱۹۳۸ء میں انتقال کر گئے۔ انہیں کہاں اندازہ ہوگا کہ دنیا میں کم از کم ان کے خوابوں کے پاکستان میں انصاف کی رفتار اتنی تیز ہو جائے گی کہ ادھر کوئی چیز چوری ہوئی ادھر چنکی بجاتے میں ربع صدی سے بھی کم میں اس کا مقدمہ فیصلہ۔ یہ سچ ہے کہ جہانگیر وغیرہ کے زمانے میں بھی فیصلے زیادہ دیر نہ لیتے تھے۔ ادھر فریادی نے گھٹنہ بجایا۔ ادھر جہانگیر نے جھرو کے میں آ کر فیصلہ سنا دیا۔ موڈ اچھا ہوا تو فریادی کے حق میں نہ اچھا ہوا تو فریادی کے خلاف کہ لے جاؤ نابکار کو۔ ہماری نیند میں خواہ مخواہ کو خلل ڈالتا ہے۔ اس تعمیل کو ہم سند اس لیے نہیں بناتے کہ جہانگیر کے زمانے میں تحریری کارروائی نہ ہوتی تھی۔ ایف آئی آر نہ کھینچتے تھے۔ تفتیش کنندگان نہ تھے۔ اسٹامپ فروش نہ تھے۔ اپیلیں نہ تھیں۔ اے آرڈر نہ تھے۔ زٹ کا دستور نہ تھا۔ یہ سب چیزیں ہوئیں تو ہمہ یکہتے کہ جہانگیر یا نوشیرواں یا بکر ماجیت جن کے نام تاریخ میں ناحق مشہور ہیں کیسے انصاف

سے عہدہ براہوتے ہیں۔



اس مقدمے میں خوشی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ملزم بھگت سنگھ جیات ہیں۔ اس دوران میں فوت نہیں ہوئے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ نو عمر ہی میں ان کے خلاف مقدمہ درج ہو گیا تھا۔ اُس وقت جاوید اقبال کی عمر بارہ سال تھی۔ اب ۳۶ سال ہے اور عبدالحمید ۱۴ برس کا تھا۔ اب ۳۸ سال کا ہے اور دونوں کھڑ بڑی واڑھی رکھے پھرتے ہیں۔ افسوس خبر میں سائیکل اور مالک کا ذکر نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں فوت ہو چکے ہیں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ رپورٹ درج کراتے وقت سائیکل کی اور اس کے مالک کی عمر کیا تھی۔ کچھ نہ کچھ تو رہی ہوگی۔

عبدالحمید اور جاوید اقبال دونوں ملزموں کی صرف واڑھی ہی نہیں بڑھی بلکہ لیاقت بھی اس دوران میں بہت بڑھی ہوگی کیوں کہ اس مقدمے کی اب تک پانچ سو پیشیاں ہوئی ہیں۔ یعنی سائیکل میں پہیوں کے اسپوکس سمیت جتنے پرزے ہوتے ہیں ان سے کوئی تین گنا لگائی۔ جو آوی پانچ سو بار عدالت میں پیش ہوگا خواہ کسی حیثیت میں بھی ہو اس کا قانون پر عبور حاصل کرنا یقینی امر ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے ان دونوں کو بری تو کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ وکالت کی ڈگری بھی دے دیتے تو اچھا ہوتا۔ ویسے اگر ان صاحبوں کو مزید علم حاصل کرنا ہے تو اس کی گنجائش ابھی موجود ہے۔ ۳۶ یا ۳۸ برس کوئی ایسی عمر نہیں ہوتی۔ ابھی یہ لوگ اپنی طبعی زندگی کے حساب میں ایک سائیکل اور چرا سکتے ہیں۔ دوبارہ بری ہونے کے وقت ایک ان میں ساٹھ سال کے ہوں گے دوسرے باٹھ برس کے۔ لیکن فائدہ یہ ہوگا کہ پھر ایک ہزار پیشیوں اور نصف صدی کا عدالتی تجربہ ان کی پشت پر ہوگا۔ جو اس زندگی میں نہ سہی آئندہ زندگی میں ضرور ان کے کام آئے گا۔

سائیکل کے مالک کا نام اس خبر کے موجب عبدالحمید تھا۔ ملزموں میں سے ایک کا نام بھی عبدالحمید ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اس نے یعنی سائیکل کے مالک ہی نے توجا وید اقبال کے ساتھ سازش کر کے خود ہی اپنی سائیکل نہیں چرائی تا کہ مقدمے کو طول دے کر ہمارے نظام عدالت اور اس کی طوالت کو بدنام کر سکے اور پھر پولیس نے اس کی بدینتی کو بھانپ کر اسے شامل تفتیش بلکہ ملزموں میں شامل کر لیا ہو۔ اگر یہ ہم نامی اتفاقی ہے تو آئندہ یہ قانونی پابندی ہونی چاہیے کہ مستغیث اور ملزم ایک نام کے نہ ہوا کریں تا کہ ہم جیسے پڑھنے والوں کو اشتباہ نہ ہو۔ ایک قصہ ہم نے پڑھا تھا کہ ایک ملزم جس پر ایک کمرل چرانے کا الزام تھا عدالت سے بری ہو گیا۔ اس نے فیصلہ سننے کے بعد دست بستہ حج سے پوچھا کہ حضور آپ کی مہربانی۔ تو کیا اب وہ کمرل میں اپنے پاس ہی رکھ سکتا ہوں.....؟ ہمارے خیال میں ہمارے فاضل مجسٹریٹ کو بھی دونوں ملزموں کو بری کرنے کے ساتھ اس امر کی اجازت دے دینی چاہیے تھی کہ وہ سائیکل اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ ۲۴ سال پیشیاں بھگتتے تھے، حوالات جانے، وکیل وغیرہ کرنے پر ان کا جو خرچ ہوا ہوگا اس سے وہ اور کچھ اور نہیں تو ایک مرسیڈیز کار تو خرید ہی سکتے تھے۔

ایک دلچسپ بات اس مقدمے میں یہ ہے کہ مقدمے کے تفتیشی افسر اے۔ ایس۔ آئی منظور احمد ان چوبیس سال میں ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ عدالت نے پولیس کے افسران اعلا کو کئی بار ہدایت کی کہ منظور احمد کو پیدا کریں اور اگر وہ پیدا ہو چکا ہے تو عدالت میں پیش کریں۔ لیکن یہ لوگ جو دنیا کی ہر چیز پیدا کرنے اور پیش کرنے پر قادر ہیں، شاعروں کی جیب سے بیاض کی جگہ بم اور کوکین تک برآمد کر سکتے ہیں، ایک ڈرامے اے۔ ایس آئی کو برآمد نہ کر سکے۔ ہم نے ایک بار پولیس کے ہر چیز برآمد کر لینے پر خوش ہو کر حکومت سے سفارش کی تھی کہ ملک کی برآمدات بڑھانے کا

ٹھیکہ بھی پولیس کو دے دیا جائے۔ اب اس تجویز پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

دوسری چیز جو منظور احمد کے علاوہ مفقود الخمر ہے وہ سائیکل ہے۔ مالک کے پاس وہ نہیں ہے در نہ وہ رپورٹ درج کیوں کر اتنا۔ ملازموں کے پاس وہ نہیں ہے در نہ بری کیوں ہوتے۔ پھر ہے تو کہاں ہے؟ وہ قصہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک صاحب سیر بھر قیمہ لائے تھے۔ نوکر کو بھوک لگی تو وہ اسے تل کر چٹ کر گیا۔ مالک نے پوچھا تو اس نے کہا کہ حضور بلی کھا گئی۔ مالک نے بلی کو پکڑ منگوایا اور تو لا تو وہ سیر بھر نکلی۔ مالک نے کہا کہ ”اے شخص! اگر یہ بلی ہے تو قیمہ کہاں ہے اور اگر یہ قیمہ ہے تو بلی کہاں ہے؟“ کہیں ایسا تو نہیں کہ مذکورہ اے۔ ایس۔ آئی اسی سائیکل پر سوار ہو کر تفتیش کرتے کرتے دور بہت دور افق کے پار نکل گیا ہو۔ ہماری دانست میں ایک مقدمہ اس سلسلے میں بھی درج ہونا چاہیے۔ مسمی منظور احمد بری تو اس میں ہو جائے گا لیکن کب؟ ۲۰۰۰ء میں۔

اگر ملازمان مذکورہ عبدالحمید اور جاوید اقبال کسی کو قتل کر دیتے اور بالفرض محال بری نہ ہوتے تو اغلب ہے کہ ان کو چودہ سال کی قید کی سزا ہوتی یعنی آج سے دس سال پہلے وہ مقدمے اور عدالتوں کے چکر سے آزاد ہو چکے ہوتے۔ ثابت یہ ہوا کہ کبھی کوئی چھوٹا جرم مثلاً سائیکل وغیرہ کی چوری نہ کرنا چاہیے بلکہ... آگے ہم وضاحت نہیں کرتے۔ کیا عجب قتل کی ترغیب اور اعانت وغیرہ کی دفعہ میں خود بھی ماخوذ نہ ہو جائیں اور ۲۴ سال بعد جا کر بری ہوں۔ نہ صاحب نہ ہم کوئی مشورہ نہیں دیتے۔

(جنگ، دخل در معقولات۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۸۰)



کچھ اخباروں کے بارے میں

ہمارے اخباروں نے بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنی ترقی کی ہے۔ اور کیا کیا رنگ بدلے ہیں، پہلے اردو اخبار لیتھو میں چھپتے تھے یعنی کاتب پیلے کاغذ پر ذرا زیادہ پہلی روشنائی سے لکھتا تھا۔ پروف ریڈر اسے پڑھنے کے لیے آنکھوں کا تیس پکاتا تھا اور چکی کے پاٹوں والی عینک لگاتا تھا۔ کبھی کبھی تصویر کا چہرہ لگا کر اخبار کو با تصویر بنانے کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔ تصویر بہت صاف آ جا۔ تو صاحب تصویر کا کوٹ اور سر کے بال کچھ دکھائی دے جاتے تھے۔ باقی حلیہ قاری کے قیاس پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چرمل کی جگہ سر سید احمد خان کی داڑھی والی تصویر لگ گئی۔ بلکہ ایک بار تو گاندھی جی کے ایک بیان کے ساتھ گاندھی جی کے بجائے ایک گینڈے کی تصویر چسپاں کر دی گئی، کیونکہ اس وقت اسٹاک میں وہی میسر تھی، دیدہ درقارمین کرام کو آنکھوں آنکھ پتا نہ چلا۔ اسی سے ہمارے مایہ ناز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے ایک محاورہ بھی نکالا۔ ”ٹھہر ذرا ابھی تیرا لیتھو بناتا ہوں۔“ یعنی ایسی درگت بناؤں گا کہ شکل نہ پہچانی جائے گی۔



انصاف کی بات یہ ہے کہ باکمال کاریگروں نے لیتھو میں بھی ایسی ایسی کتا ہیں

چھاپ دکھائیں کہ آنکھیں روشن ہوں۔ اور کاتب بھی ایسے باکمال گزرے ہیں کہ پلیٹ پر سے عبارت اڑ جائے (جوائی لکھی ہوتی ہے) تو صفحوں کے صفحے الٹے لکھ جاتے تھے۔ خیر اخباروں کی حد تک وہ دور اب ماضی ہوا۔ اب تو بیس بیس صفحے کا جہازی ساز پر روزانہ اخبار نکلتا ہے اور رنگ برنگی تصویریں آتی ہیں۔ یہ سب آفسٹ کا کمال ہے ظاہری صورت کے ساتھ خبروں، اداروں اور کالموں کا اسلوب بھی بدلا۔ لیکن صوری سے معنوی تبدیلیوں کے ذکر کی طرف آنا خطرے سے خالی نہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے اخبار نویس مولانا محمد علی ظفر علی خان اور حسرت موہانی اسی غریب لیتھو میں حق کی بات کر جاتے تھے خواہ اس کی پاداش میں اپنا پریش ضبط کراتے تھے اور جیل کی ہوا کھاتے تھے۔ اس آفسٹ کے ترقی یافتہ زمانے میں جب کہ اخبار حق کے پرچار کے لیے نہیں بلکہ اشتہار کے لیے نکالا جاتا ہے۔ اخبار والا فقط وہ بات کہتا ہے جس میں اس کی جان و مال کو خطرہ نہ ہو۔ ورنہ چپ رہتا ہے جیل نہیں جاتا۔ اکڑوں بیٹھ کر چنے کی دال نہیں کھاتا۔ اپنا آفسٹ مشینوں والا پریش ضبط نہیں کراتا۔



لاہور سے ہمارے بعض عزیز دوستوں نے اخبار نکالا ہے۔ اور سریخوں کا انداز یکسر بدل ڈالا ہے۔ پچھلے سرکاری الیکشنوں کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس اخبار نے ایک ڈیڑھ فٹ اونچے حروف میں سرخی دی۔

پھر آ گیا

یعنی شیر آیا۔ شیر آیا۔ ووڑنا۔ اسی اخبار نے اپنے حریفوں کے لیے ٹھاو کا لفظ ایجاد کیا۔ اپنوں کے لیے واہ۔ دوسروں کے لیے ٹھاہ۔ فلاں ٹھاو۔ ڈھمکا ٹھاہ۔ دیکھتے دیکھتے

دوسرے اخباروں نے بھی یہ نسخہ کیسے اچک لیا۔ ہر طرف ٹھاٹھاٹھا ہونے لگی، پورا ملک چاند ماری کا میدان بن گیا۔

اتنے میں نیوز پرنٹ کی قلت ہو گئی۔ صفحے سکڑنے لگے۔ یہ ضروری ہو گیا کہ سرخیاں بھی مختصر کی جائیں۔ تین تین لفظوں کی سرخی دینا عیاشی معلوم ہونے لگا۔ ایک روز ہم نے اس اخبار میں یہ بڑی سرخی دیکھی۔

صفایا

معلوم ہوا اس روز پاکستانی فوج نے کسی مقام پر دراندازوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہم سمجھے اب اس سے زیادہ اختصار ممکن نہیں، لیکن سابق صدر ایوب جو اب کے پریولس گئے اور لگا کر ٹھیس گئے تو اس اخبار نے تصویر اور خبر کے درمیان یہ ایک لفظی سرخی دی۔

کے

کون گیا، کہاں گیا اور کیوں گیا اور کب گیا؟ یہ تو خبر پڑھنے سے معلوم ہو، ہی جاتا ہے۔ سرخی میں یہ تفصیل دینے کی ضرورت نہیں لیکن کراچی کے اخبار اب تک پرانی وضع کی لمبی لمبی سرخیاں دیے جا رہے ہیں حتیٰ کہ مقنن میں دینے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ بھلا یہ بھی کوئی سرخی ہوئی۔

”ماڈرز بٹک نے نکسن کو بلایا اور نکسن نے کہا۔ میں آیا۔“

غور کیجیے تو کون سا سمندر ہے جسے آپ کوڑے میں نہیں بند کر سکتے۔ آخر کسی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کا خلاصہ کیا ہی تھا۔ پدرے بود پسرے داشت، گم کر ڈبا یافت۔“ انہی چند دن کے اخباروں میں سے بعض خبریں ہمارے سامنے ہیں جن کی سرخیوں پر اختصار کا عمل کر کے ہم کافی نیوز پرنٹ بچا سکتے تھے مثلاً۔

پبلنگ۔ چین کے بطل عظیم ماؤزے تنگ نے امریکہ کے صدر نکسن کو دعوت دی ہے کہ وہ چین تشریف لائیں یہاں ان کا ہر طرح سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

اچھا

واشنگٹن۔ ماؤزے تنگ نے صدر نکسن کو جو دعوت دی تھی کہ ہماری گلی آنا، صدر نکسن نے اس کے جواب میں کہا۔ اچھا جی۔ لیکن میں چین کب جاؤں گا یا ابھی نہیں کہہ سکتا۔

جا

ماسکو۔ روس نے ماسکو کے برطانوی سفارت خانے کے ایک ڈپلومیٹ کی سرگرمیوں پر سخت اعتراض کیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر روس کی حدود سے نکل جائے۔

کیا؟

لندن۔ برطانیہ کی حکومت نے روسیوں کے اس اقدام پر کہ ایک برطانوی سفارتی افسر کو روس سے نکال دیا گیا ہے، کہا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس اخراج کی کیا وجہ ہے، افسر مذکور وہاں کسی کا کیا لیتا تھا بس! جاسوسی ہی تو کرتا تھا۔

دے

تل ابیب۔ اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میر نے صدر نکسن کو پیغام بھیجا ہے کہ ”دے جا

خدا کے نام پر بابا ہمت ہے گردینے کی۔ ہاتھی نہیں مانگتی، گھوڑا نہیں مانگتی۔ بس سوچا اس
 ہوائی جہاز اور کچھ جیب خرچ وغیرہ تاکہ عربوں کے علاقے ہاتھ سے نہ نکلنے پائیں۔“

لے

واشنگٹن۔ صدر کنسن نے وزیر اعظم اسرائیل کی اپیل پر اسے چالیس فنٹیم جیٹ
 طیارے دیے ہیں اور چالیس ارب ڈالر بطور نان و نفقہ منی آرڈر کرو دیے ہیں اور کہا ہے
 لے تو بھی کیا یاد کرے گی کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ سراپا یاد رکھنا۔

کھا

کراچی۔ کل مسٹر ابن انشانے جاپان کے مشہور پبلشر مسٹر نوما کو ایک پر تکلف لیچ
 دیا۔ اس کے بعد مشہور شاعر جمیل الدین حانی کو فلم ”شیراں و سہ پتر شیر“ دکھائی اور
 انٹرول کے دوران جیب سے مٹھی بھر موگ پھلی نکال کر پیش کی اور کہا۔ کھا۔ کھا جا۔ اس
 میں دامن ڈی ہوتی ہے۔

پی

کراچی۔ کے ڈی اے کے ایک ترجمان نے لوگوں کی شکایتوں کے جواب میں کہا
 ہے کہ آج کل جو پانی شہریوں کو دیا جا رہا ہے وہ ہرگز مضرت نہیں ہے۔ جیسا کہ اس
 کے ذائقے سے معلوم ہوگا۔ سپلائی کرنے سے پہلے اسے ایک دن حقے میں استعمال کیا
 جاتا ہے۔ تمباکو کا دھواں بار بار گزرنے سے اس کے جراثیم سر جاتے ہیں۔ بالقرض یہ
 مضرت ہے بھی تو ہم کیا کریں۔ کراچی کے شہریوں کو ہماری طرف سے اجازت ہے

کہ سوڈاواثر پیچیں۔ گرائپ واثر پیچیں۔

سرخیوں میں اختصار کا یہی رجحان رہا تو بات ایک حرف پر آ کر ٹھہرے گی ملاحظہ ہو۔

لاہور۔ صوبے کے وزیر اعظم خان بہادر محمد فاضل نے اعلان کیا ہے کہ عن قریب صوبے میں تعلیم بالکل عام کر دی جائے گی۔

محمد فاضل صاحب نے حضرت بلھے شاہ کے ایک قول کا حوالہ دیا۔

علموں بس کریں ادیار ☆ اکو الف تجھے درکار

یعنی تعلیم الف پر شروع ہو کر الف پر ختم ہو جانی چاہیے۔ وزیر تعلیم نے کہا۔ بعض لوگ میرے نام اور ایک مشہور محاورے کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ میں پڑھا لکھا نہیں حالانکہ میں الف پڑھ بھی سکتا ہوں اور لکھ کر بھی دکھا سکتا ہوں۔

اس کے بعد وزیر تعلیم نے (ن) لکھ کر دکھایا۔ حاضرین نے تالیاں بھی بجائیں اور الف زند و باد کے نعرے لگائے۔

☆☆☆

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں

ایک شخص کے پاؤں کے انگوٹھے پر ایک گوسڑا نکل آیا تھا۔ کسی نے کہا اسپتال جا کر اسے کٹا دو۔ معمولی سا آپریشن ہوگا۔ پس دو اسپتال چلا گیا۔ آپریشن کے لیے اسے بے ہوش کرنے کی دوا دی گئی جس سے اس کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسے آکسیجن ٹینٹ میں رکھا گیا جس میں ہڈیوں کی سوزش کے جراثیم پہلے سے موجود تھے چنانچہ اسے دوبارہ لگ گئی۔ اسے اسٹریچر پر لیے جا رہے تھے کہ اسٹریچر الٹ گیا جس سے اس کی ایک ٹانگ اور ہنسی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس ضرب سے اس کو دل کا ایک اور دورہ پڑ گیا۔ دم تحریر وہ اس عالم میں ہے کہ اس کے ایک نکلی سانس لینے کے لیے لگی ہے۔ ایک نکلی پیشاب خارج کرنے کے لیے۔ ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہے اور بازو پٹی میں بندھا گلے کا بار ہو رہا ہے۔ اب رہا وہ گھڑا۔ اسے سب بھول گئے ہیں۔ وہ جہاں تھا وہیں ہے۔



یہ خبر اجنبائیں کی ہے اور کسی اور کے بارے میں ہے لیکن یہ یہاں کی بھی ہو سکتی ہے اور ہم خوش قسمت نہ ہوتے تو ہمارے بارے میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اپنی ٹانگ کو لیے لیے ہم ایک مقامی اسپتال میں بھی ہو آئے ہیں جہاں ہر کوئی ہر کسی سے شاکی تھا۔

زیادہ تفصیل میں اس لیے نہیں جاتے کہ ہمیں تجربے نے بتا دیا ہے کہ کبھی اسپتالوں کے بارے میں نہ لکھنا چاہیے۔ کبھی پولیس اور تھانے کے بارے میں نہ لکھنا چاہیے۔ بلکہ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب کے مشہور افسانے ’رپورٹ پنواری‘ مفصل ہے، میں ہے کسی پنواری کے بارے میں بھی لکھنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ہر پھر کرواسطہ انہی لوگوں سے پڑنا ہوتا ہے۔ شہاب صاحب کے سائل نے جس کی زمین پنواری نے کسی اور کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ شکایت تو گورنر کے نام بھیجی تھی انہوں نے اپنے سیکریٹری کو برائے ضروری کارروائی بھیج دی۔ سیکریٹری نے کمشنر کو کمشنر نے ڈپٹی کمشنر نے تحصیل دار کو اور تحصیل دار نے اسی پنواری کو منتقل کر دی کہ اس پر ضروری کارروائی کی جائے۔ پنواری نے درخواست دہندہ کو بلایا۔ ایک جوتا لگاتا تھا اور ایک درخواست دکھاتا تھا۔ درخواست دکھاتا تھا اور ایک جوتا لگاتا تھا کہ اور دے درخواست گورنر کو۔ بڑا آیا ہماری شکایتیں کرنے والا۔ اس ”ضروری کارروائی“ کے بعد درخواست یہ لکھ کر گورنر صاحب کو لوٹاوی کہ مناسب تحقیق کی گئی۔ مدعی جھوٹا ہے۔ جھوٹی درخواستیں دینے کا مادی ہے۔ شکایت داخل دفتر کی جائے۔

ہم کوئی دس دن سے اپنی ٹانگ سمیت بستر پر پڑے ہیں۔ ہمارے دودھ ڈاکٹر منیر الحق ہمیں دیکھ جاتے ہیں اور دلاسا دیتے ہیں کہ چند روز اور سری جان فقط چند ہی روز انہوں نے نصیحت بھی کی کہ پرانے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم نے نہیں اڑائی لیکن اگر پرایا بھٹہ خود آ کر ہماری ٹانگ میں اڑ جائے تو کیا کر سکتے ہیں۔ ایک اور دوست نے فرمایا کہ یہ جو تم دعوے کرتے پھرتے ہو کہ تم کو دولت مل رہی تھی۔ تم نے اس پر لات مار دی، کوئی بڑا عہدہ مل رہا تھا اس پر لات مار دی تو ایسے کاموں کا تو یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم نے کہا نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ زبان سے کہنے کی بات اور ہے۔ ہم عزت، شہرت یا عہدے پر لات مارنے والے آدمی نہیں

ہیں۔ بات فقط اتنی ہے کہ ۳۱ جنوری کو ریڈیو پاکستان کے سامنے ٹیکسی لینے کے لیے ہم سڑک پار کر رہے تھے کہ غلط سائیڈ سے آکر ٹیلی فون کے محکمے کی ایک جیپ نے ہمیں ٹکرا دیا اور دروازہ اچھال دیا۔ رپورٹ ہم نے اس لیے نہیں کی کہ اس مقام پر جہاں پانچ طرف سے ٹریفک آتا ہے اور سڑک عبور کرنے میں چند روحت لگتے ہیں نہ کوئی زیر اثر سنگ ہے نہ کوئی ٹریفک کا آدمی ہوتا ہے۔ ہوتا بھی تو رپورٹ کا کچھ مقام نہ تھا۔ قصور ہمارا تھا۔ ہم کیوں گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ الٹا ہم نے جیپ والے کا شکریہ ادا کیا کہ ہمیں زندہ رہنے دیا۔ خبر اس واردات کی اس لیے کسی کو نہ ہوئی کہ ہمارے شہر میں اگر کوئی گاڑی کسی آدمی کو ٹکرا دے تو یہ خبر نہیں ہے۔ ہاں کوئی آدمی کسی گاڑی کو ٹکرا دے تو خبر بنتی ہے۔

عباسی شہید اسپتال بہت بڑا اعلیٰ شان اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان کر ہماری طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ لیکن اسپتال صرف سنگ دشت نہیں ہوتا۔ ایکسرے کرنے والا آدمی پون گھنٹے کی تلاش کے بعد ملا۔ اور ملا تو ہم سے ایمر جنسی کی فیس چارج کی۔ لیبارٹری کا نظام جیسا اس اسپتال میں ہونا چاہیے ویسا نہیں ہے۔ ماہر ڈاکٹروں کی بھی کمی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنے بڑے علاقے کے لیے اتنا بڑا اسپتال بنا ہے تو کچھ ماہرین جناح اسپتال اور سول اسپتال سے یہاں منتقل کر دیے جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جناح اسپتال سرکاری حکومت کا ہے۔ سول اسپتال صوبائی حکومت کا اور عباسی اسپتال میونسپل کارپوریشن کا۔ یہاں اکثر ڈاکٹر نئے ہیں۔ بعض تو شاید امی سال فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ تجربہ کم رکھتے ہیں لیکن ایک صاحب نے کہا کہ چند سال چیر پھاڑ کرتے رہیں گے اور دو آئیں آزماتے رہیں گے تو ان کو بھی تجربہ ہو جائے گا۔ انسان گاتے گاتے ہی کلاوت ہوتا ہے۔ ویسے ان طالب علم نما ڈاکٹروں کو دیکھ کر ہمیں وہ مریض یاد آیا جو آپریشن ٹیبل پر لیٹا تو کہنے لگا ڈاکٹر صاحب مجھے

کھبراہٹ ہو رہی ہے کیونکہ یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا بھی تو یہ پہلا آپریشن ہے۔ میں کوئی گھبراہٹ ہوں۔“

ویسے تو ہم خیریت سے ہیں لیکن اس تقریب سے بستر پر پڑے سارا سارا دن یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے اہل وطن کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں اور ہمارے اہل وطن ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم مشرقی تہذیب کے آدمی ہیں ”پہلے آپ“ کے قائل ہیں لہذا اس معاملے میں بھی پہل کرنے کا موقع اہل وطن ہی کو دینا چاہتے ہیں۔ قومی خدمت کا جذبہ ہم میں ایک تو فراغت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کچھ یار عزیز الحاج جمیل الدین عالی کی صحبت سے جو ہمیں برابر دیکھنے آتے رہے ہیں۔ حج کرنے کے بعد سے ہم ان میں نمایاں فرق دیکھ رہے ہیں۔ لہو و لعب کی طرف ان کو رغبت مطلق نہیں رہی۔ خیالات فاسدوان میں پہلے بھی نہیں تھے اب تو اور بھی نہیں رہے۔ غزلوں دو ہوں کو لا حاصل قرار دے کر انہوں نے عزم کیا ہے کہ آئندہ صرف قوالوں کی فرمائش پر گراموفون کمپنیوں کے لیے لکھا کریں گے۔ ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس سے دنیا بالکل ٹھیک ہو جائے۔ ہر طرف عربی ہی عربی رائج ہو جائے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی خرابی باقی نہ رہے۔ تبلیغی تقریریں اس جذبے سے کرتے ہیں کہ بے اختیار جی چاہتا ہے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیں۔ پھر خیال آتا ہے ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ اگر آپ کو کوئی شخص عربی لباس میں رجز پڑھتا ہوا، ننگی شمشیر ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار بحر ظلمات کا راستہ پوچھتا نظر آئے تو نام پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور کون ہو سکتا ہے۔

(۱۱ فروری ۱۹۷۴ء۔ روزنامہ جنگ)

ایک دو کہانیاں ملکر رارشاو ہیں

جو شخص سیدھی بات نہ کہہ سکے یا سیدھی بات کو موثر نہ پائے دو کہانیاں کہتا ہے چنانچہ ان دو سال میں ہمارا منصب بھی داستان گو کارہا ہے ہم نے مختلف اوقات میں کتنی ہی کہانیاں کہیں جو اسے پیارے طالب علمو.... ہر عمر کے طالب علمو آپ لوگوں نے دلچسپی سے سنیں۔ یہ کہانیاں بھی جو آج آپ کی ہڈیوں پر فرمائش کے بغیر ہی ہم مکرر رارشاو کر رہے ہیں کچھ نئی نہیں ہیں۔ بلکہ جہ کہانیاں ہیں لیکن۔

مرا معنی تازہ مدعا ست

امید ہے آپ لوگ انہیں دلچسپی سے پڑھیں گے اور دعائے خیر سے یاد کریں گے۔

چڑ اور چڑیا

ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑ۔ چڑیا لائی دال کا دانا۔ چڑ لایا چاول کا دانا۔ اس سے کھجڑی پکائی دونوں نے پیٹ بھر کر کھائی۔ آپس میں اتفاق ہوا تو ایک ایک دانے کی کھجڑی بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑ اب بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اس کے دل میں دوسرا آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔ پس دوسرے روز کھجڑی پکی تو چڑے نے کہا۔ ”اس میں سے چھپن

حصے مجھے دئے چوالیس حصے تولے۔۔ اے بھاگوان... پسند کریا نا پسند کر۔ حقائق سے آنکھ مت بند کر، چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نکات بھی نکالے اور اس بی بی کے آگے ڈالے بی بی حیران بلکہ رو رو کر ہلکان ہوئی کہ اس کے ساتھ میرا جنم کا ساتھ تھا۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانالائی اور چڑا چاول کا دانہ۔ دونوں نے الگ الگ ہنڈیا چڑھائی، کچھڑی پکائی کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں ہنڈیاؤں میں بس ایک ہی ایک دانا ہے، چڑے نے چاول کا دانا کھایا۔ چڑیا نے دال کا دانا اٹھایا۔ چڑے کو خالی چاول سے پیش ہوگئی، چڑیا کو خالی دال سے قبض ہوگئی۔ دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بلا تھا۔ اس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا۔

دیکھا تو تھے دو مُشت پر

یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔ آج کل تو چاول ایک سپورٹ ہو جاتا ہے اور دال مہنگی ہے۔ اتنی کہ دولڑکیاں جو مولوی اسماعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں آج کل فقط شیخی بھگارتی ہیں۔

ایک گورو کے دو چیلے

ایک تھا گورو بڑا نیک، دھرم تھا۔ وہ اس کے چیلے تھے وفادار، جان نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کو تیار، ایک کا شہہ نام پور بول تھا۔ دوسرے کا بچھمی چند گورو جی جب لوگوں کو اپدیش دیتے اور ان کی سراویں پوری کرنے کے بعد.... آرام کرنے کو لیتے تو چیلہ پور بول ان کی وہی ٹانگ دباتا اور بچھمی چند بائیں ٹانگ کی ٹہل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی مٹھی چا پی کرتے، جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے، اس کے جیرکارے بدلتے، اس پر کبھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، ایک روز کرنا پر ماتا

کا کیا ہوا کہ گرد جی ایک کر دٹ لیٹ گئے اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جا پڑی۔ چیلے پور بول کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ایک ڈنڈا اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گورد جی نے بلبل کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھی چند کی غیرت نے جوش مارا اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی سرت کی۔ گورد جی بہت چلائے کہ خالمو کیوں مارے ڈالتے ہوئے۔ لیکن چیلے کہ علاقائی خود مختاری کے سرور میں تھے کب مانتے تھے دونوں نے پریس کانفرنس کیں۔ اور زیادتی میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا۔ گورد جی کی ٹانگیں سوج کر کپا ہو گئیں مدتوں ہلدی چونالگا ناپڑا۔

اب آئے چیلے۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، لالہ پچھی چند کے کئی بیٹے تھے بڑے ہونہار اور ہوشیار پشاور می مل لاہوری مل سندھورام اور بلوچ رائے جب لالہ پچھی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پائی۔ وہ گورد جی کی ٹانگ تو دباتے تھے لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دباتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ زور دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور سب نے طے کیا کہ ہم اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پور بول نے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو۔ میں تو اپنے حصے کی پوری ٹانگ کاٹ کر لیے جا رہا ہوں۔ اب ان بر خورداروں نے گنڈا سا منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی، پوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لی، تیسرے نے گھٹنا اٹھایا۔ چوتھے نے پاتی کو سمیٹا اور گھر کی راہ لی اور اس کے بعد سبھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

گورد جی کا کیا ہو؟ مرے یا بیے؟ جیے تو کتنے دن تک جیے؟ اس کا کہانی میں ذکر نہیں۔

(جنگ، دخل در معقولات ۷۱-۱-۳)



لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم نے لکھنے کا آغاز امروز ہی سے کیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ پھر لکھا جائے۔ گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ یوں تو اس زمانے میں بھی کچھ مطلب نہ ہوتا تھا لیکن بعد میں تو ہم نے بے مطلب لکھنے میں ایک طرح کا کمال حاصل کر لیا۔ اب ہم آٹھویں یا دسویں جماعت کے طالب علم تو ہیں نہیں کہ جراب مضمون لکھنے بیٹھیں تو تمہید باندھیں، پھر دلیلیں دیں بعد ازاں نتیجہ نکالیں۔ نتیجہ نکالنے کی ہدایت تو ہمیں چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہی کر دی گئی تھی، ہمیں یاد ہے ایک بار ہم دسہرے کے میلے میں گئے تھے بڑی رونق تھی۔ طرح طرح کے دیہاتی آئے ہوئے تھے۔ بعضوں نے عذر مستی رکھ کر دھول دسپا بھی کیا۔ انہجائے سرخوشی میں باہم لٹھی چارج سے بھی باز نہ آئے۔ رام پھمن کا قصہ تو ہمارے کچھ پلے نہ پڑا۔ ہم نے دسہرے پر مضمون جو لکھا تو بہت سوچ سوچ کر یہ نتیجہ نکالا کہ سیلے میں شراب پی کر نہ جانا چاہیے، پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ "ماسٹر جی نے بعد میں بتایا کہ "رام پھمن کے قصے کا یہ نتیجہ زیادہ صحیح نہیں، ہمیں بھائی کی محبت اور ایثار کے جذبے وغیرہ کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور ظالم کے کیفر کردار کو پہنچنے کی بابت کرنی چاہیے تھی۔ غلط نتیجہ نکالنے سے یہ زیادہ اچھا ہے کہ سرے سے کوئی نتیجہ نہ نکالا جائے۔"

اس دن کے بعد سے ہم نے اپنے کسی مضمون سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ بس پڑھنے

والے نکالتے ہیں اور حساب تک ہمیں معلوم ہے وہ زیادہ اچھا نہیں ہوتا (ہمارے حق میں) دلیل بازی میں بھی ہم کبھی مشہور نہیں رہے اور تمہید باندھنے سے ہمیں ہمیشہ سے چڑ رہی ہے۔ اب کسی شخصیت پر مضمون لکھو تو ماسٹر جی کا نسخہ یہ تھا کہ پہلے بتاؤ کب پیدا ہوا تھا۔ پھر حالات زندگی۔ پھر کارنامے۔ پھر فاتح ہے تو فتوحات اور مصنف ہے تو تصنیفات کا حوالہ لاؤ اور آخر میں اسے مار کر یعنی سن وفات لکھ کر یا تو مرحوم کو چال چلن کا سرٹیفکیٹ دو کہ ہاں اچھا آدمی تھا یا اس کی حکمت عملی پر دو پیرے لکھ کر نتیجہ نکالو۔ اب یہ روانہ نہیں ہے۔ لکھنے والے کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ اس کا مدوح کب پیدا ہوا اور پیدا ہوا بھی تھا یا نہیں۔ ہم ذاتی طور پر کسی شخص کے پیدا ہونے یا مرنے کو اس کا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں۔ دخل نہیں دیتے۔ لازمہ شرافت بھی یہی ہے۔ ہندوستان میں ہوتے تو اور بات تھی۔ وہاں دوسروں کے معاملوں میں دخل نہ دینا۔ غیر مستحسن بات سمجھی جاتی ہے۔



ہم قین آدمی ایک ہی روز امر دز کے ادارے میں شامل ہوئے تھے۔ آدمی کے لفظ سے فقط حیوانات کی قسم واضح کرنا مقصود ہے۔ آدمیت وغیرہ کی بحث یہاں بے محل ہے خیر افراد کو لیجیے انتظار حسین امجد حسین اور ہم۔ زمانہ یہ اللہ بخشے چراغ حسن حسرت کا تھا کہ کالم نگاری میں کسی کا چراغ ان کے آگے نہ جلا۔ اہل زبان نہ تھے مگر اہل زبان کے لیے بھی زبان پر سند تھے۔ خفہ نگاری میں ان کا اسلوب بے ساختہ اور بے مکان تھا۔ فرمائشی مزاح اور لطیفہ نگاری ان کے ہاں نہ تھی۔ یوں تو ہر اخبار میں ہر طرح کا کام ہونا ضروری تھا اور ہمارے مرحوم مخدوم مولانا عبد المجید سالک کے ہاں بھی عجیب چاشنی تھی لیکن ان کا رنگ الگ تھا۔ حاجی لق لق مرحوم کو بھی لوگ شوق سے پڑھتے تھے اور تقسیم سے پہلے لاہور کے ہندو اخباروں نے بھی اپنے اپنے سالک اور حسرت پیدا کر

رکھے تھے۔ تو رکھا، نیپالی، نانگ چند ناز وغیرہ یہ ناز صاحب بالخصوص دلچسپ آدمی تھے۔ مولانا ظفر علی خان سے بھی فکر لیتے تھے۔ لیکن لکھتے کیا تھے پکڑے ملتے تھے۔ ہمارے سالک صاحب کو تو اپنے لکھنے کا سالہ زیادہ تر انہی سے ملتا تھا۔



ہم تو امروز سے فارغ ہوئے شتابی سے۔ انتظار اور امجد رہ گئے تھے۔ یہ اپنی اپنی باری پر گئے۔ ہم نے کراچی کو ہجرت کی اور امروز کراچی میں لکھتے رہے۔ اس زمانے میں کالموں میں اپنے نام سے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ حسرت صاحب سند با وجہازی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ سالک صاحب بھی ”انکار و خواص“ پر اپنا نام نہ دیتے تھے۔ ہم نے جانے کن کن ناموں سے مضمون نگاری کی۔ دمشق، نانا فر نويس، علی بابا، پہلا درویش، پانچواں درویش، حامی بابا، اصفہانی وغیرہ درویشوں کی سرگزشت یوں ہے کہ ہم گنڈے دار کالم لکھتے تھے۔ (یہی حرف و حکایت) تو اس پر فقط درویش لکھتے تھے۔ پھر ہمارے دوست طفیل احمد جمالی نے ہمارا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو کہا بھی تم پہلے درویش بن جاؤ، ہم دوسرا درویش بنتے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت دن جاری رہا۔ مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں میں ان دنوں بھی تم کو پڑھا کرتا تھا لیکن اس زمانے میں کراچی کے امروز کو فقط خواص پڑھتے تھے یعنی سنجیدہ اور باشعور لوگ، دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ اس کی اشاعت بہت محدود ہوتی تھی۔ ہم اپنی دانست میں اچھے سے اچھا کالم لکھتے تھے لیکن داد کے منتظر ہی رہتے تھے خود کو کرکریں تو لوگ پوچھتے تھے امروز؟ کیا کراچی سے بھی نکلتا ہے؟ جمالی صاحب ان دنوں لطیفہ کہا کرتے تھے۔ ”اگر کسی بات کو راز رکھنا ہو۔ ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تو امروز میں چھاپ دو۔“ یہ تذکرہ ہم ہارون سعد صاحب سے سعذرت کے ساتھ کرتے ہیں، کیونکہ امروز کراچی کے انچارج ایک طرح سے وہی تھے لیکن اس میں ان کا قصور نہیں۔ زمانے کی بد مذاقی کی

طرف اشارہ مقصود ہے۔

پھر ہم نے کالم لکھنا چھوڑا اور اخبارات نے یکا یک ترقی کرنی شروع کی۔ یہ ہم واقعات کی زبانی ترتیب بیان کر رہے ہیں۔ اس میں علت و معلول کا رشتہ نہ ڈھونڈا جائے۔ خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے یعنی اشاعتیں بڑھیں۔ صفحے بڑھے، اشتہارات بڑھے، کالم بڑھے اور کالم نگار بڑھے۔ یہ عورتوں کا صفحہ ہے جس میں کشیدہ کاری اور مہاسے دور کرنے سے لے کر ہنڈیا بھونسنے تک کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ یہ فلمی صفحہ ہے، گلے میں بے باندھ کر تصویریں دیکھیے اور رال پٹکائیے۔ یہ علمی صفحہ ہے، یہ صحت کا صفحہ ہے۔ جسے ڈاکٹر، حکیم، ایلوپیتھ اپنی اپنی باری پر تختہ مشق بناتے تھے اور یہ طالب علموں کا صفحہ ہے۔ بازیچہ اطفال کہہ لیجیے۔ ہمارے زمانے میں طالب علم پہلے تختی لکھا کرتے تھے۔ اسے گاجنی سے لپ کر پھر لکھا کرتے تھے۔ پھر چار سطر لائنوں پر لکھنے کا نمبر آتا تھا پھر رولدار کاپی اور جواب مضمونوں کی مشق وغیرہ لیکن اب اخباروں کی ریل پیل کے ساتھ یہ ہوا کہ جسے چار لائنوں والی کاپی پر لکھنا چاہیے، وہ بھی اخبار میں لکھ رہا ہے یا لکھ رہی ہے اور جسے تختہ پر گاجنی پھیر کر مشق کرنی چاہیے، اس کے مضامین اور نام بھی کچی سیاسی سے زیور طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ جب ہم اخبار میں ٹوکر ہوئے تو اس زمانے میں اخبار لیتھو میں چھپتے تھے۔ تصویریں کا رواج نہ تھا، کبھی کبھی ضرورت ہوتی تو چرہ لگا دیتے تھے۔ یہ چرے کی حادث فلم والوں نے اخبار والوں ہی سے لی ہے اس میں دیکھنے والا تصویر کے نیچے نام پڑھ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ ہاں فلاں صاحب کی تصویر ہے یا ہوگی۔ ایک بار ہمیں سر سید احمد خاں کی تصویر چھپانی تھی۔ وہ تو نہ ملی ہاں چرچل کی تصویر کا چرچل بل گیا۔ وہی لگا دیا۔ آج تک تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ آج پہلی بار اپنی زبانی بتا رہے ہیں۔

ہاں آفست پر چھپنے کے بعد تصویریں چھاپنا آسان ہو گیا تو تصویر کو مقدم اور تحریر کو

مؤخر رکھنے لگے کہیں کوئی جرم ہوتا تھا بلکہ ہوتا ہے کہنا چاہیے کیونکہ آج کل بھی یہی کیفیت ہے تو نہ صرف مجرم اور قتل یا اغوا ہونے والے کی تصویر چھپتی ہے بلکہ ان کے پھوپھی زاد بھائیوں کی 'محلے والوں کی ان کو پکڑنے والے کانٹیل کی' اس شیر فروش کی جو محلے کے گز پر رہتا ہے بلکہ تصویر کے نیچے ہم نے لکھا دیکھا، محمد بخش ٹین ساز جو واردات کے روز ڈیرہ خازی خان گیا ہوا تھا اور جس کو واردات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہندیا بھوننے والوں اور اچار کے نسخے تھانے والوں کی تصویریں تو بالالتزام اور اکثر اوقات رنگین چھپنے لگیں۔ ایک بار ایک صاحبہ نے اٹلے تلنے کی ترکیب بھیجی۔ ایڈیٹر نے واپس ڈاک سے لکھا کہ اپنی تصویر بھی بھیجیں کیونکہ ہم تصویر کے بغیر کچھ نہیں چھاپتے۔ اس طرح وہ سائل سمندر پر گئیں اور غرارہ بہن کرا اور پورے سولہ سترہ سنگھار کر کے اور جڑاؤ زیور پہن کر تصویر کھنچوائی اور وہ آب و تاب کے ساتھ اخبار کے آدھے صفحے پر چھپی نیچے لکھا تھا۔ اٹلے تلنے کی مشہور ماہر۔ رشیدہ فاطمہ۔

انگریزی کے مشہور مصنف سوئٹ (Swift) کی تعریف میں لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ جھاڑو کے تنکے پر بھی مضمون لکھ سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی ایسا کمال نہیں۔ ہم لوگ لکھنے کے لیے جھاڑو کے تنکے کے بھی محتاج نہیں۔ ہاں جھاڑو کا تنکا ہمارا محتاج ہو تو ہو۔ وضاحت اس کی یوں ہے کہ اگر ہم مضمون نہ لکھیں اور لوگ اسے پھاڑ پھاڑ کر نہ پھینکیں تو جھاڑو کو کوئی نہ پوچھے۔ اس کا کوئی مصرف نہ رہے۔

(بقلم خود۔ روزنامہ اسروز لاہور ۱۷۔۶۔۶۷)



پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

آج کل شہر میں جسے دیکھو پوچھتا پھر رہا ہے کہ غالب کون ہے؟ اس کی ولدیت سکونت اور پیشے کے متعلق تفتیش ہو رہی ہے۔ ہم نے بھی اپنی سی جستجو کی۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری کو کھولا۔ اس میں غالب آرٹ اسٹوڈیو تھا لیکن یہ لوگ مدِ رخوں کے لیے مصوری سیکھنے اور سکھانے والے نکلے۔ ایک صاحب غالب مصطفیٰ ہیں جن کے نام کے ساتھ ڈپٹی ڈائریکٹر فوڈ لکھا ہے۔ انہیں آٹے دال کے بھاؤ اور دوسرے مسائل سے کہاں فرصت ہوگی کہ شعر کہیں؟ غالب نور اللہ خاں کا نام بھی ڈائریکٹری میں ہے لیکن ہمارے موکل کا نام تو اسد اللہ خاں تھا جیسا کہ خود فرمایا ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا ☆ اے وریغا وہ رید شاہد باز
بے شک۔ بعض لوگ اس شعر کو غالب کا نہیں گنتے۔ ایک بزرگ کے نزدیک یہ اسد اللہ خاں تمام کوئی دوسرے شاعر تھے۔ ایک اور محقق نے اسے غالب کے ایک گمنام شاگرد درِ یغا دہلوی سے منسوب کیا ہے لیکن ہمیں یہ دیوان غالب ہی میں ملا ہے۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری بند کر کے ہم نے تھانے والوں کو فون کرنے شروع کیے کہ اس قسم کا کوئی شخص تمہارے رزنامے پر یا حوالات میں ہو تو مطلع فرماؤ کیونکہ اتنا ہم نے سن رکھا ہے

کہ کچھ مرزا صاحب کو اک گونہ بخود دی کے ذرائع شراب اور جوئے وغیرہ سے دلچسپی تھی اور کچھ کو تو ان کا دشمن تھا۔ بہر حال پولیس والوں نے بھی کان پر ہاتھ رکھا کہ ہم آشنا نہیں، نہ ملزموں میں ان کا نام ہے نہ مفردوں میں نہ ڈیفنس رولز کے نظر بندوں میں نہ اخلاقی قیدیوں میں نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

مرزا ظفر الحسن ہمارے دوست نے سرزار سوا کو رسوائی کے مقدسے سے بری کرانے کے بعد اب مرزا غالب کی یاد کا بیڑا اٹھایا ہے۔

مرزا کو مرزا ملے کر کر لے ہاتھ

پچھلے دنوں انہوں نے ایک ہوٹل میں ادارہ یادگار غالب کا جلسہ کیا تو ہم بھی کچے دھاگے میں بندھے پہنچ گئے۔ ظفر الحسن صاحب کی تعارفی تقریر کے بعد صہبا لکھنوی نے تھوڑا سا تندی صہبا سے موضوع کے آگے بڑھانے کو پگھلایا۔

اس کے بعد لوگوں نے مرزا جمیل الدین عالی سے اصرار کیا کہ کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ نہ نہ کرتے رہے کہ ہے ادب شرط منہ نہ کھلاؤ لیکن پھر تاب خن نہ کر سکے اور منہ سے گھٹکیاں نکال کر گویا ہوئے۔ غالب ہر چند کہ اس بندے کے عزیزوں میں تھا لیکن اچھا شاعر تھا۔ لوگ تو اسے اردو کا حب سے اونچا شاعر کہتے ہیں۔ مرزا ظفر الحسن قابل مبارک باد ہیں کہ اس کے نام پر منظوم جلسہ یعنی بیت بازی کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اسے کسوٹی پر بھی پرکھ رہے ہیں لیکن اس عظیم شاعر کی شایان شان دھوم دھامی صد سالہ بری کے لیے ہندوستان میں لاکھوں روپے کے صرف کا اہتمام دیکھتے ہوئے ہم بھی ایک بڑے آدمی کے پاس پہنچے کہ خزانے کے سانپ ہیں اور ان سے کہا کہ گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ شرم بھی۔ کچھ غالب نام آور کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ! طعنہ دیں گے بٹ کہ غالب کا خدا کوئی نہیں ہے

ان صاحب نے کہا۔ ”آپ غالب کا ڈوی سائل سرٹیفکیٹ لائے؟“

یہ بولے ”نہیں۔“

فرمایا۔ ”پھر کس بات کے روپے مانگتے ہوؤ وہ تو کہیں آگرے دلی میں پیدا ہوا وہیں مر کھ پ گیا۔ پاکستان میں شاعروں کا کال ہے۔“

عانی صاحب نے کہا۔ ”اچھا پھر کسی پاکستانی شاعر کا نام ہی بتا دیجیے کہ غالب کا سا ہو۔“

بولے۔ ”میں زبانی تھوڑا ہی یاد رکھتا ہوں۔ شاعروں کے نام اچھا اب لمبے ہو جائیے مجھے بحث بنانا ہے۔“



خیر ہندوستان کے شاعر تو ہندوستانیوں ہی کو مبارک ہوں خواہ وہ میر ہوں یا انیس ہوں یا امیر خسرو ساکن پٹیالی واقع یوپی لیکن غالب کے متعلق ایک اطلاع حال میں ہمیں ملی ہے جس کی روشنی میں ان سے تھوڑی رعایت برتی جاسکتی ہے مفت روزہ قذیل لاہور کے تماشائی نے ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک اعلان سنا کہ اب اردن کے مشہور شاعر غالب کا کلام سنیے۔ یہ بھی تھا کہ ”اردن کو مرزا غالب پر ہمیشہ ناز رہے گا۔“ تو گویا یہ ہمارے دوست ملک اردن کے رہنے والے تھے۔ تبھی ہم کہیں کہ ان کا ابتدائی کلام ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتا اور عربی فارسی سے اتنا بھرپور کیوں ہے اور کسی رعایت سے نہیں تو اقربا پروری کے تحت ہی ہمیں یوم غالب کے لیے روپے کا بندوبست کرنا پڑے کہ اردن سے ہماری حال ہی میں رشتے داری بھی ہو گئی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ صد سالہ برسی فروری میں ہے۔ فردوسی کی طرح نہ ہو کہ ادھر اس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ہاتھ خالی کنن سے باہر تھا اور ادھر خدام ادب اشرفیوں کے توڑوں کا ریڑھا دھکیلتے غزنی کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔



عالی صاحب کا اشارہ تو خدا جانے کس کی طرف تھا۔ کسی سینٹھ کی طرف یا کسی اہل کار کی طرف۔ لیکن مرزا ظفر الحسن صاحب نے دوسرے روز بیان چھپوادی کہ ہم نے حکومت سے کچھ نہیں مانگا نہ اس کی شکایت کرتے ہیں جو دے اس کا بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یہ شکوہ شکایت ادارہ یا دوکار غالب کے حساب میں نہیں، مرزا جمیل الدین عالی کے حساب میں لکھا جائے، ہم تو پنسلین بیچ کر یوم غالب منائیں گے۔“

ہم نے پہلے یہ خبر پڑھی تو ”پنسلین“ سمجھے اور خیال کیا کہ کہیں سے مرزا صاحب کو ”پنسلین“ کے ٹیکوں کا ذخیرہ ہاتھ آ گیا ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ نہیں۔ وہ پنسلین مراد ہیں جن سے ہم پاجاموں جس ازار بند ڈالتے ہیں اور گھڑ بیبیاں دھوبی کا حساب لکھتی ہیں۔ خیر مرزا ظفر الحسن صاحب کا جذبہ قابل تعریف ہے لیکن دو مرزاؤں میں تیسرے مرزا کو حرام ہوتے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ حکومت سے غالب یا کسی اور شاعر کے نام پر کچھ مانگنا یا شکوہ کرنا کوئی جرم تو نہیں، آخر یہ کسی راہے یا نواب کی شخصی حکومت تھوڑا ہی ہے۔ خزانہ عامرہ کا پیسہ ہمارے ہی ٹیکسوں کا پیسہ ہے۔ اب یہ تو ٹھیک ہے کہ انجمن ترقی اردو والے یا ڈاکٹر حمید احمد خان اس موقع پر کچھ کتابیں چھاپ رہے ہیں اور مرزا ظفر الحسن صاحب منظوم جلمے کا اہتمام کر رہے ہیں یا غالب کو کسوٹی پر پرکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ چار کتابوں کا چھپنا اور منظوم جلمے میں ہم ایسے شاعروں کا غالب کی زمینوں میں ہل چلانا حق سے ادا ہونا تو نہ ہوا۔ وہ مرحوم تو بڑی اونچی نفیس طبیعت کے مالک تھے۔

منزل اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
 عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکان اپنا
 اخبار جہاں۔ باتیں انشاجی کی (۶۹-۱۵)

☆☆☆

اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

ایک زمانہ تھا کہ لوگ مضمون کے ساتھ تصویر تو بڑی چیز ہے نام تک نہ دیا کرتے تھے بلکہ سند باد جہازی وغیرہ لکھ کر کام چلاتے تھے۔ مرحوم مولانا عبد المجید سالک کو تو قلمی نام دینا بھی پسند نہ تھا۔ ہم نے ان کے مشہور و مقبول کالم ”افکار و حواش“ پر کبھی ان کا نام نہیں دیکھا۔ ہاں۔ پڑھنے والے جانتے تھے۔ یعنی شدہ شدہ جاننے لگے تھے اور چونکہ ان دنوں پیری مریدی کا رواج تک ایسا تھا کہ شاعروں میں استادِ شاگردی جاں نشینی وغیرہ کے مسائل پر سر پٹھول ہو جاتی تھی۔ لہذا لوگوں نے پیر افکار کا نام دے رکھا تھا۔ لوگ دعا کراتے تھے تعویذ مانگتے تھے۔

اور پھر آفسٹ کی چھپائی کی برکت سے تصویر کا رواج نکلا۔ اب مضمون ہونہ ہو تصویر ہونا ضروری ہے۔ ایک روز تو ہم نے ایک صاحب کی تصویر چھپی دیکھی جس کے ساتھ فقط ایک معذرتی نوٹ تھا کہ آج حضرت حمام شکر قندی اپنی علالت کی وجہ سے کالم نہیں لکھ سکے۔ اب یہ ہونے لگا کہ کالم نگار یا مضمون نگار اپنی تصویر دے کر بھول جانے لگے۔ جو مونچھوں والا تھا وہ داڑھی والا ہو گیا اور جو داڑھی والا تھا اس نے چارابرو کا صفایا کر دیا۔

لیکن تصویر وہی رہی کہ جوتھی۔ ہمارے دوست انتظار حسین نئی تصویر کھینچوانا شرعاً ممنوع تو نہیں مگر وہ ضرور سمجھتے ہیں۔ اس لیے مدتوں ان کی ایک ہی تصویر چلتی رہی۔ انہی دنوں ہمارے مہربان اور مخدوم ش نے واڑھی رکھی اور چونکہ اپنا ٹوڈیٹ آدمی ہیں۔ تصویر بھی اپنے کالم پر واڑھی والی دی۔ اس قلب مابیت کا پتا نہ تھا اس لیے شکایتا لکھ گئے کہ عجب ماجرا ہے۔ انتظار حسین اپنے کالم پر اپنے بیٹے کی تصویر چھاپے جا رہے ہیں اور م۔ ش صاحب اپنے والد کی تصویر لگا دیتے ہیں۔ بعد میں ہم یہ جان کر شرمندہ ہوئے کہ دونوں اپنی اپنی تصویریں لگا رہے تھے۔ قصور فہم ہمارا تھا۔ بعد میں پھر سنا کہ م۔ ش نے واڑھی منڈ والی اور انتظار حسین نے رکھ لی۔ لیکن تصدیق نہ ہو سکی۔

ہم نے جب کراچی کے ایک اخبار میں وقتاً فوقتاً لکھنا شروع کیا تو ہم سے تصویر کا تقاضا ہوا۔ تصویر تو بڑی چیز ہے ہم نے نام کی بھی بڑی مشکل سے اجازت دی۔ لیکن خیر اس چیز کے زیر اثر جسے پبلک کا پر زور اصرار کہتے ہیں لیکن اصل میں پبلک سے شخص مذکور کا اصرار ہوتا ہے۔ تصویر پر بھی راضی ہو گئے اور پھر ایسے راضی ہوئے کہ بس۔ لیکن وہ الگ قصہ ہے۔

کراچی کا وہ اخبار بند ہو چکا ہے۔ لوگ اس کے بند ہونے کی وجوہ میں ہمارا نام بھی لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں۔ بے شک اشاعت اس کی ہمارے کالم کے زمانے ہی میں گر گئی تھی۔ اور دن و ونی رات چوگنی گھٹ رہی تھی۔ لیکن اس میں علت و معلول کا رشتہ تلاش نہ کرنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ اخبار مذکور (انجام) ہمارے لکھنا چھوڑنے کے بعد بند ہوا تھا۔ جس میں ہم زور و شور اور ذوق و شوق سے لکھا کرتے تھے وہ اس روز کراچی تھا لیکن اس کے بند ہونے کی وجوہ بھی دوسری تھیں۔ ہمارا ان دنوں اس کا مضمون نگار ہونا اتفاقی تھا۔ ہمیں اپنی تحریر کے متعلق کبھی یہ خوش گمانی نہیں ہوئی کہ وہ اتنی موثر ہے آخر اور پرچے بن میں ہم لکھتے ہیں چل ہی رہے ہیں۔

ہاں تو ذکر انجام میں لکھنے اور تصویر چھپوانے کا تھا جس کے انجام کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ فوری فائدہ اس کا یہ ہوا کہ اگلے مہینے جو مالک مکان کرایہ مانگنے آیا تو اس کا لہجہ بہت شریفانہ تھا بلکہ اس نے یہ کہا کہ اس مکان کو آپ اپنا ہی مکان تصور فرمائیے ہاں کرایہ ماہ بہ ماہ پابندی سے دیتے رہیے اور یہ میرے بیٹے کے ویسے کی تصویر چھپوا دیجیے۔ علاقے کے بی۔ ڈی نمبر نے بھی اس جمعرات کو مٹا جوں مسکینوں میں تقسیم کرنے کے لیے ختم دلایا۔ اس میں سے زروے کی لبالب بھری ہوئی ایک پلیٹ ہمارے لیے بھیجی۔ ان دنوں بی ڈی کے ایکشن پھر ہونے والے تھے لہذا پلیٹ کے ساتھ یہ رقعہ بھی شامل تھا کہ اگر آپ آئندہ بھی مجھے قوم کی بے لوث خدمت کرنے کا موقع دلانے میں مدد کریں تو بے دام غلام رہوں گا بلکہ آپ کے اخبار کے لیے خریدار بھی فراہم کر دوں گا۔ اگر لوگ برضا و رغبت خریداری بھی قبول نہ کریں گے تو دیگر ذرائع بھی استعمال کرنے میں حار نہ ہوگا۔ ایک پڑوسی نے اپنے لڑکے کو بھیجا کہ پوچھ کے آؤ مسئلہ کشمیر کا اب کیا ہوگا۔ ایک صاحب نے اپنا سلیمانی منجن اخبار میں ریویو کے لیے ہمارے پاس بھیج دیا جس کے مسلسل استعمال کے بعد دانت نکلوانے کے لیے کسی دندان ساز کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مضبوط سے مضبوط دانت بلا تکلیف اور زہور کے خود ہی نکل جاتے ہیں۔ پھر ایک بزرگ نے اپنی چھڑی سے پھانک پر آؤ دستک دی اور کہا کہ یہ جو کوڑے کا ڈرم گئی کے موڑ پر پڑا ہے بہت بودرتا ہے اسے اٹھوائیے۔ ہم نے کہا۔ قبلہ یہ ہم نے نہیں رکھا۔ نہ اس کی صفائی کی سیوسپلی کی طرف سے ہمیں تنخواہ ملتی ہے۔ جمعدار جھنڈا مسیح سے کہیے۔ بولے۔ میں کیوں کہوں۔ آپ اخبار والے ہیں آپ کارپوریشن کے چیئرمین سے کہیے وہ ہیلتھ آفیسر سے کہے گا۔ ہیلتھ آفیسر داروغہ سے کہے گا اور داروغہ جمعدار جھنڈا مسیح سے کہیں گے۔ آخر ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں یہی طریقہ ہے۔ ہم نے وہ کوڑے کا ڈرم تو

اٹھوا دیا لیکن پھر جمعہ دار لوگ سارے محلے کا کوڑا ہمارے دروازے پر لا کر ڈالتے تھے۔ اور تادم تحریر یہی کیفیت رہی۔

ایک روز تو ایک وفد بھی ہم سے ملے آیا کہ انشاء صاحب آپ ہی ہیں جن کی یہ تصویر چھپی ہے۔ ہم نے کہا من آنم کہ من دانم لیکن فرمائیے۔ بولے ہم رکشا والے ہیں اور یہ ہمارا مطالبہ ہے جسے آپ نے اپنے انبار میں نہ چھاپا تو کوئی رکشا والا آپ کو نہیں بٹھائے گا۔ محض یہ تھا کہ پولیس جو آئے دن ہمارے میٹر چیک کرتی ہے یہ ہمارے شہری حقوق پر حملہ ہے۔ اس کا مدد افظیوں ہو سکتا ہے کہ بھارت کی طرح ہمارے ہاں بھی ایک رکشا وزیر ہو۔ ہم نے کہا، ہمیں معلوم نہیں۔ وہاں ایسا کوئی وزیر ہے۔ اس پر وفد کے سربراہ نے ہمیں اخبار دکھایا جس میں ایک تصویر تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ شری چادن۔ رکشا منتری بھارت۔ ہم نے بہت ٹالنے کی کوشش کی یہاں رکشا کا مطلب موٹر رکشا نہیں بلکہ دفاع ہے لیکن وفد کو قائل نہ کر سکے۔ ان کی دلیل بھی محکم تھی اور وہ یہ کہ دفاع کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں باہر سے کوئی حملہ ہو یا حملے کا امکان ہو۔ بھارت کو تو ہمیشہ کسی پر خود حملہ کرنا ہوتا ہے خواہ وہ گواہ یا پسین ہو۔ حیدر آباد ہو کہ جونا گڑھ ہو۔ لہذا چادن جی وزیر دفاع نہیں ہوں گے۔ ضرور وزیر امور موٹر رکشا ہوں گے۔ وفد کے سربراہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کام کے لیے ملک میں موزوں آدمیوں کی کمی نہیں انہوں نے اپنی مثال بھی پیش کی۔

یہ تو بات خوا خواہ لمبی ہو گئی۔ کہنا یہ ہے کہ اپنی تصویر دینے سے ہم معذرت چاہتے ہیں۔ صرف اچھی تصویر کی بات نہیں کر رہے ہم تو ڈائجسٹوں پر چھپنے والی ایسی تمام تصویروں کے غلاف ہیں جن کو دیکھ کر بچے چپ بیٹھے ہوں تو رد نے لگتے ہیں اور رد رہے ہوں تو چپ ہو جاتے ہیں۔

روزنامہ سردرز..... بقلم خود (۷۱-۱۰-۲۳)



اب ہماری قربانی شرعاً جائز نہیں رہی

ہمارا ایک دانت تھا جس پر ملک بھر کے ڈاکٹروں کے ایک مدت سے دانت تھے، اسے ہم ان لوگوں کی دست برد سے دس سال تک تو بچاتے رہے لیکن آخر جاں بحق ہوا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے ہمارے حسن خداداد میں تو چنداں فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ یہ دکھانے کا دانت نہ تھا۔ کھانے کا تھا، یعنی بہت پیچھے کی ایک داڑھ۔ تاہم اس کی مفارقت کا افسوس ضرور ہوا۔

ہمارے اس داڑھ کے نکلوانے میں ہجر پھر کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ ایک دوست نے کہا تھا کہ یہ عقل داڑھ ہے، اگرچہ اس کے ہونے سے عملاً کچھ فائدہ کبھی نہیں پہنچا۔ لیکن اس کے نکلوانے سے تو بھرم بھی جاتا رہے گا۔ ہمارے ایک ماہر ڈاکٹر نے یہ شک رفع کیا اور کہا کہ یہ عقل داڑھ نہیں اور اس کے نکلنے کی تمہارے نظام جسمانی میں گنجائش بھی نہیں۔ اب رہا علاج۔ اس کے لیے ایک وٹرنری ہسپتال تو ہم بے شک نہیں گئے حالانکہ بعض مہربانوں نے اس کا مشورہ بھی دیا تھا اور اس کے ڈاکٹر کی شہرت بھی سنی تھی۔ ہاں کوئی اور معالج ہم نے نہیں چھوڑا۔ ”بنا کر مریضوں کا ہم بھیس خالب نکلتے تھے۔“ تو سائیں چمن دین سنیاہی سے لے کر پردیسراے آر (اللہ رکھا) چشتی حامل کامل اور عزرائیل الاطبا حکیم فضل مولیٰ تک کے در دولت پر جادو تک دیتے تھے۔

فقیری منجن بھی استعمال کیا۔ ایک پیر صاحب نے کچھ پڑھ کر معمولی ہدیہ لے کر ایک مسواک بھی ہمیں دی، اور ایک بزرگ نے تو تعویذ بھی باندھنے کو دیا اور کالا سرغا بھی ہم سے چورا ہے پس پھرا دیا۔ لیکن درو نے برابر ترقی ہی کی۔ عشرہ ترقیات منا کردم لیا۔ بعض لوگوں نے چینی دندان سازوں سے رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ چین سے ہماری ہمدردیاں ڈھکی چھپی نہیں لیکن خطرہ یہ تھا کہ ان میں کوئی کومن تا نگ کا ہمدرد نکلا تو پورا جبرائیل لے گا۔ یہ احتیاط مقامی لوگوں کے باب میں بھی ضروری معلوم ہوئی۔ کیونکہ خود ہمارے ملک میں بعض سیامی براعتیں کومن تا نگ سے رشتہ رکھتی ہیں۔ بلکہ سوشلزم اور ماڈرن ٹیک کے نام پر پیا نگ کا ٹیک سے بھی زیادہ بدکتی ہیں۔ دانت نکلاتے وقت دیکھ لینا چاہیے کہ ڈاکٹر کا کس جماعت سے تعلق ہے۔



ہمارے ملک میں بے ڈگری کے ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ مزے کی طرح انہیں کہیں جگہ نہ ملی تو فٹ پاتھوں پر ہی کائی بن کر جم گئے ہیں۔ بعض تو ان میں سے ایسے باکمال ہیں کہ سنہ میں (مریض کے منہ میں) انگلی ڈال کر انجکشن دیے بغیر دانت نکال لیتے ہیں اور اس میں اس کی تخصیص نہیں کہ دانت بیمار تھا یا تندرست۔ ہمارے ایک دوست نے ایک بار ایسے ہی ایک ڈاکٹر سے نکلوا یا تھا۔ اس نے زبور ڈالا اور دانت نکال کر ہمارے دوست کے ہاتھ میں دے دیا۔ دانت ہی نہیں اس کا جھٹلا اور پلیٹ بھی۔ یہ وہ مصنوعی دانت تھا جو بیمار دانت کے پڑوس میں واقع تھا، سچ ہے ”صحت طالع ترا طالع کند“ ہمارے دوست نے احتجاج کیا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہتھی نکال کر بولے۔ ”اے بھی بدلوا لیجیے۔ آج کل مصنوعی دانتوں میں بھی کیڑا لگ جاتا ہے۔“



بارے پھر پھر اگر دنیا بھر کے چکر لگا کر ہم اپنے دوست ڈاکٹر طیب محمود کے پاس

آئے کہ اے طیب جملہ علیہائے ما۔ اس بد ذات کو نکال۔ اب انہوں نے پس و پیش کی۔ ہم نے کہا آج کل لوگوں کے دل اور گروے بدلے جا رہے ہیں، آپ اسے نکال کر کسی بکری کا دانت ڈال دیجیے تو مانوں۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور بولے۔ دانتوں کی سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی، اور جب انہوں نے ہمارا دانت نکالنے کی ہامی بھری تو ہم پر رقت طاری ہو گئی اور ہم نے دیوانی مقدموں کی طرح تاریخیں ڈالنی شروع کیں۔ ذرا یہ ملک کے حالات تو ٹھیک ہولیں۔ بالغ حق رائے و ہندگی کا مطالبہ منظور ہو لے۔ ایمر جنسی ختم ہو۔ طالب علم رہنما چھوٹیں تو بے شک نکال دیجیے گا۔ آخر ایک روز انہوں نے کہا۔ ایمر جنسی ختم ہوئی۔ باقی مطالبات بھی پورے ہونے والے ہیں۔ اب میرا مطالبہ یہ ہے، کہ اس داڑھ کو نکلواد دیجیے۔ اس پر ہم نے کہا آج نہیں۔ آج تو بارش کے سے آثار ہیں اور ایسے عالم میں دانت نکلوانا اچھا نہیں ہوتا۔ یوں بھی متگل کا دن ہے۔ اس پر وہ بولے، اچھا صفائی کر دوں، اور پھر واقعی انہوں نے صفائی کر دی۔ داڑھ نکال کر ہمارے ہاتھ میں دے دی۔ کانوں کان بلکہ دانتوں دانت خبر نہ ہونے دی۔



اب وہ دن گئے جب لوگ ہم سے کہا کرتے تھے کہ۔ وندان تو جملہ درد بانند۔ لوگ ہنسنے میں ہنسی نکالتے ہیں۔ ہم اکتیسی نکال کر ہنسا کریں گے۔ عاقبت کا بھی خیال آتا ہے، جس کے باب میں ایک پرانے شاعر نے لکھا ہے کہ سوال و جواب ہوں گے۔

جہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے؟

بتاکے دانت ہیں منہ میں تیرے، کھایا پیا کیا ہے؟

باقی حساب تو ہم دے لیں گے، لیکن دانتوں کے معاملے میں دانتا کل کل ضرور ہوگی، ویسے ہر چیز کا ایک روشن پہلو بھی ہوتا ہے۔ ہم سے مختلف اوقات میں مطالبہ کیا

جاتا رہا ہے کہ ملک پر جان قربان کر دو۔ قوم کے سرچڑھ کر سر جاؤ، یا سر کو کسی محبوب کے زیر پائے رکھ کر اللہ اکبر اذن دو کہ اردو شاعری میں محبوب عموماً قصاب کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن ہم مصروفیت یا کسی ناگزیر وجہ کا بہانا بنا کر طرح دیتے رہے، اب ہم سیدھے سیدھے چھاتی نکال کر کہہ سکتے ہیں کہ کیسی قربانی اور کہاں کی قربانی۔ ہماری تو قربانی ہی شرعاً جائز نہیں۔ ہمارا تو ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اٹھیا ٹا ہم فتادلے عالمگیری کی ایک جلد بھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں، خصوصاً بقرعید کے دنوں میں۔



مٹو بھائی

مائی ڈیز مٹو بھائی! یا رتہارا نام بڑا گڑ بڑ ہے۔ اس کے ساتھ القاب دا آداب لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ اگر برادر مٹو بھائی لکھیں یا میرے بھائی مٹو بھائی تو تکرار لفظی ہے اور تم جانتے ہو حشو و زائد کچھ اچھی چیز نہیں ہیں۔ خدا جانے تم نے اندر دن خانہ اس مشکل کا حل کیا نکالا ہوگا اور وہ عقیقہ کہ ہماری بھابی ہیں تمہارے بھائی پن سے کیسے نکلتی ہوں گی۔ تمہارے اس نام سے بلانے سے تو اُن کے لیے کئی فقہی مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔



ایک زمانے میں ہم تم کو مٹو موٹر دوں والے سمجھا کرتے تھے کہ اس قوم کا ایک آدمی موٹر کے بجائے ادب کے اسٹیرنگ پر آ بیٹھا ہے۔ شاعری کلچر دبار ہا ہے اور صحافت کو دھکا دے رہا ہے۔ بھائی بھی گجراتی دولت مندوں کے نام کا لاحقہ ہے۔ رد پیہ بھائی پیسہ بھائی، کھونا بھائی، کھرا بھائی۔ چھوٹا بھائی، بڑا بھائی۔ یہ بھائی وہ بھائی۔ یہاں کراچی میں جتنے اس قسم کے بھائی ہیں کر دڑ پتی ہیں۔ ہم غریب غریب تو ان کو بھائی سمجھتے ہیں اور کہتے بھی ہیں، کہنے پر مجبور بھی ہیں، اُن پر کوئی پابندی نہیں کہ ہمیں بھائی سمجھیں یا بھائی کہہ کر بلا لیں۔



ایک بھائی اور ہوتے ہیں جیسے بھائی چھیلا پٹیا لے والا، یا مٹو بھائی امروز والا۔ ایک بھائی سکھوں کے ہوتے ہیں بلکہ وہاں بھائی سے وہی مطلب لیا جاتا ہے جو ہمارے ہاں مولوی یا مولانا سے لیا جاتا ہے۔ ہم نہیں کہتے تم میں سکھوں والی کوئی بات ہے وہ لوگ تو بڑی خوبیوں کے ہوتے ہیں۔

ع جہاں پر گئے داستان چھوڑ آئے

تاہم نام کی تاثیر ہوتی ہے۔ باپ یہ پوت اور پتا پر گھوڑا کی طرح۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا چونکہ ہمارے ہاں اکہری اور دو چشمی ہائے میں بھی لکھنے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ لوگ آنکھوں کو آنکھوں چہرہ کو چہرہ اور اس کے برعکس ہاتھی کو ہاتھی اور جھاڑ کو جھاڑ لکھ دیتے ہیں اس لیے بعض لوگ سمجھتے ہیں تمہارا تعلق بھائی فرقے سے ہے کیونکہ تم جیسا اچھا لکھنے والے اس ملک میں کم ہیں۔ یعنی تم ایک طرح کی اقلیت ہو اس لیے اس فرقے کی طرح لوگوں کا دھیان جانا قدرتی ہے۔ دو چشمی ہا اور دوسری ہاں میں جسے نہ جانے کیا کہتے ہیں، خود ہمیں دھوکا ہوا۔ پچھلے دنوں مسعود مفتی کی کتاب دیکھی چھرنے چونکہ مضمون اس کا مشرقی پاکستان کے آخری ایام ہے لہذا ہم اسے چھرنے ہی سمجھے۔ برادران ملت کے چھرنے۔ اندر پڑھا تو معلوم ہوا امر او ہے ”چہرنے“ اس سلسلے میں ایک شعر بھی سناؤں، ڈرو نہیں، میرا نہیں، کسی استاد کا ہے۔

ہائے یہ حسرت دیدار مری ہائے کو بھی

ہائے دو چشمی سے لکھتے ہیں کتابیں والے



ہمارے ایک دوست ہیں یوسف صدیقی۔ ہم کبھی رواداری میں ان کے نام کے رفقے میں یوسف بھائی لکھ جائیں تو کاٹنا پڑتا ہے جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر یوسف

ہمارے بھائی ہوئے تو ہم یوسف کے بھائی ہوئے اور برادران یوسف میں اپنا شمار کرانا کون پسند کرے گا۔ شاید تم نے بھی اپنا نام اس زمانے میں رکھا ہوگا جب ابھی حالی کا یہ شعر تمہاری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست باں ملتے ہیں کم، بھائی بہت

البتہ میں نہیں کہوں گا کہ اب تم نام کو بدل لو۔ تم اس نام سے مشہور ہو چکے ہو۔ ایک مشہور ادیب کسی محفل میں کہہ رہے تھے کہ پندرہ سال تک لکھنے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں کبھی ادیب نہیں بن سکتا۔ ایک شخص نے کہا۔ ”تو پھر آپ نے لکھنا چھوڑ دیا ہوتا۔“ موصوف نے فرمایا۔ قباست یہ ہوئی کہ اس وقت تک میں مشہور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اب یہ دیکھو! مائی ڈیر کتنا اچھا لقب ہے اس کا مطلب ہوا میرے پیارے منو۔ یہ لقب مردوں کو خط لکھنے میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں سے خط و کتابت میں بھی، لیکن ان کے معاملے میں اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی قباستیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو تم پیزا تک ہو سکتی ہے۔ بہر حال آپ کسی دو شیزہ کو مائی ڈیر لکھتے ہوئے دل ہی دل میں تو اس کا ترجمہ کر ہی سکتے ہیں، جس طرح اور بہت سی باتیں دل ہی دل میں کرنے کا ہمارے ہاں رواج ہے۔ وراصل ہمارا معاشرہ ابھی پسماندہ ہے۔ ابھی کل ہی کہیں میں پڑھ رہا تھا کہ امریکہ میں ایک پاکستانی افسر اعلا کی امریکن سیکرٹری مستعفی ہو کر چلی گئیں۔ کسی نے پوچھا کہ اس شخص نے کیا کیا، جو تم نے ناراض ہو کر مستعفی دیا۔ پولیس یہی تو شکایت ہے کہ کچھ بھی نہیں کیا۔ میں ایک ہفتے سے اس بھلے آدمی کی سیکرٹری ہوں۔ اُس نے ایک بار بھی تو مجھے پوچھنے کی کوشش نہیں کی، کیا میں ایسی ہی گنی



تمہید کچھ لمبی ہوگئی لیکن آج کل چالیس صفحے کی کتاب پر چار صفحے کا دیباچہ لکھنے کا دستور ہے۔ بلکہ بعض کتابوں پر تو صرف دیباچہ یا مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ کتاب ہوتی ہی نہیں۔ مقدمہ ابن خلدون کو سب جانتے ہیں لیکن اگر کوئی ایسی تحریر یا کتاب ہے یا تھی جس کا یہ مقدمہ ہے تو اسے کوئی نہیں جانتا۔ آج کل بی۔ اے۔ ایم۔ اے میں طالب علموں کو حالی کا مقدمہ شعر و شاعری تو پڑھاتے ہیں۔ حالی کی شاعری کوئی نہیں پڑھاتا۔ یہ بھائی اور بھائی بچے کی بحث میں تو میں ناحق الجھ گیا۔ قصہ یہ ہے کہ میں نے تمہارا وہ کالم پڑھا تھا جس میں یہ ذکر ہے کہ کوئی قرار اور اسٹریٹ گلڈ کے خلاف خاطر غزنوی نے لاہور کے سیمینار میں پیش کی تھی جو سیری صدارت میں منظور ہوئی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر تم نے آگے چل کر مجھے اور خاطر و دونوں کو گلڈ کا کھڑ پیچ بھی لکھ دیا۔



نہ میں گلڈ کا پیچ نہ کھڑ پیچ۔ ایک نسبت سے اس کا کچھ کام کرتا بھی تھا تو اس سے مستغنی ہوئے بھی بہت دن ہوئے۔ خاطر غزنوی کا تو اتنا تعلق بھی نہیں رہا۔ وہ تو اکثر و بیشتر گلڈ سے ناخوش رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ بات حقیقت نہیں کہ کوئی قرار واد میری صدارت میں گلڈ کے خلاف منظور ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں میں تم کو معاف کرتا ہوں کہ تم اس سیمینار کے کسی اجلاس میں آئے ہی نہیں۔ ایک بار مولانا عبد المجید سالک نے روزنامہ انقلاب میں ایک جلسے کی روداد پوری تفصیل کے ساتھ مع مقررین کی تقریروں کے چھاپ دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ جلسے کا اعلان ہو چکا ہے اس میں یہی کچھ تو ہوگا۔ اگلی صبح اخبار چھپ کر آیا تو لوگوں نے فون کیے کہ مولانا شام کو آندھی آ جانے کی وجہ سے وہ جلسہ تو ہوا ہی نہیں۔ اب رہا لائبریریوں میں غلط کتابیں جانے کا معاملہ۔ وہ

دوسرا معاملہ ہے اور پڑا اہم معاملہ ہے۔



تفصیل اس کی لاہور کے پبلشروں سے سنو۔ لاہور میں کئی طرح کے پبلشر ہیں۔ ایک تو اچھے پبلشر، دوسرے چور پبلشر، تیسرے چوروں کے مور پبلشر۔ ہوتا یہ ہے کہ محکمہ تعلیم والے سرکلر نکالتے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب لائبریریوں میں خریدنے کے لیے منظور کی جاتی ہے۔ مشہور کتابوں کے فقط نام لکھے جاتے ہیں۔ شعرا العجم، بانگ درا، نقش فریادی وغیرہ۔ یہ چوروں کے موران ناموں کے ٹائٹل چھپوا لیتے ہیں اور اندر کچھ اوٹ پٹانگ چھپوا کر جوڑ دیتے ہیں۔ قیمت وہی ہوتی ہے جو اصل شعرا العجم، اصلی بانگ درا اور اصلی نقش فریادی کی۔ رجسٹر میں قانون کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اور کاروبار میں ہیڈ ماسٹر کے کمیشن کی تقسیم میں لا قانونیت کے۔ پوچھیے تو ڈھٹائی سے جت کرتے ہیں کہ کیوں صاحب شعرا العجم صرف شبلی نعمانی لکھ سکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ بانگ درا صرف اقبال کی شاعری کی کتاب ہو سکتی ہے۔ مرغی خانے کی نہیں اور نقش فریادی کے نام پر فیض احمد فیض کا کوئی اجارہ ہے۔ انہوں نے بھی تو یہ غالب کے ہاں سے اُڑایا ہے۔

بقلم خود، روزنامہ اسروز، لاہور۔



ہفتہ ٹریفک کیوں شروع کیا

ہم کوئی ہفتہ بھر کے لیے کراچی سے باہر چلے گئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب کراچی والے عاقل و بالغ ہیں۔ ان کی ایسی بھی کیا نگرانی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا جانا تھا کہ یہاں طرح طرح کی وارداتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ ہمارے گھر کے سامنے جو پارک کی زمین ہے اور جس میں ایک زمانے سے کتوں کا چوپال یا جھنا نہ کلب چلا آتا تھا جہاں وہ ٹائلٹ بھی کرتے تھے اور استراحت بھی اور اکثر راتوں کو زندہ ناچ گانے کا پروگرام بھی، اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا۔ یعنی کے ڈی۔ اے والوں نے اس میں گدھوں سے بل پھروا دیے اور زمین کو ہموار کر دیا ہے۔ ابھی یہ تحقیق نہیں ہوا کہ وہاں سبزہ لگے گا یا پٹرول پمپ بنے گا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ سبزہ لگا تو اس پر ٹیلنے کے لیے ہماری خدمات غیر مشروط طور پر حاضر ہیں البتہ پٹرول پمپ بننے میں یہ قیاحت ہے کہ پٹرول سے چلنے والی کوئی نہ کوئی چیز خریدنی پڑے گی۔ کار وغیرہ۔ اسکوٹر وغیرہ۔ سگریٹ لائٹر وغیرہ۔ سیکنڈ ہینڈ کاروں اسکوٹروں، سگریٹ لائٹروں والے متوجہ ہوں۔

کچھ ایسا ہی فائدہ پولیس والوں نے بھی اٹھایا یعنی ہمارے کراچی سے روانہ ہوتے ہی ہفتہ ٹریفک کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہماری غیر موجودگی میں ٹریفک کا ہفتہ منانا ایسا ہی ہے جیسا بلا کسی بیمار کے ہسپتال جانا یا بلا کسی دولہا کے بارات لے کر جانا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ٹریفک کے حادی خلاف ورزی کرنے والے ہیں۔ ہاں ٹریفک اکثر ہماری خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے ہم ہمیشہ سے شاکی ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم عین وکٹوریہ روڈ یا بندر روڈ کے بچوں بیچ جا رہے ہیں۔ پان کلفے میں ہے اور زیر تحریر غزل کا مصرعہ لب پر۔ غیب سے مضامین خیال میں آرہے ہیں جا رہے ہیں۔ اتنے میں یکفخت کوئی زور سے کار کے بریک لگا کر ہٹو بچو کا شور مچا کر ساری کیفیت کو غارت کر دیتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایسے میں لوگ باگ بھی موٹر نشین کی حمایت کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھائیں کہ بھائی تو اپنی موٹر فٹ پاتھ پر کیوں نہیں چلاتا اور کھبے پر کیوں نہیں چڑھتا کہ بجلی کمپنی والوں نے ازراہ رفا و حاتمہ اسی مقصد کے لیے کھڑے کیے ہیں۔ سب اپنا غصہ غریب مسافر پر نکالتے ہیں۔ کیونکہ یہ دور سرمایہ داری کا ہے۔ جس کے پاس پیسہ ہے سب اسی کی پیچ کرتے ہیں۔



ٹریفک کی طرف سے ہماری خلاف ورزی کی یہی ایک مثال نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم ٹیکسی میں یا کسی دوست کی گاڑی میں بیٹھے ہیں اور بندر روڈ سے الفسٹن اسٹریٹ کی طرف مڑنا چاہا۔ یک لخت کسی نے ٹوکا کہ ادھر جانا منع ہے۔ بھائی کیوں منع ہے؟ کیوں پاکستان کے آزاد شہریوں کی راہ روکتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ خیر کسی صورت صدر پنج کروکٹوریہ روڈ کے راستے بندر روڈ آنا چاہیں تو پھر ٹریفک کا سنتری روکتا ہے کہ صاحب آپ دیکھتے نہیں۔ صاف لکھا ہے کہ ”بند ہے“ اور آپ درازتے

چلے جا رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ٹریفک سنٹریوں کو منطق نہیں پڑھائی نہیں جاتی جس طرح ہمارے نصاب تعلیم میں ٹریفک کے قواعد نہیں تھے۔ ورنہ ہم پوچھیں کہ خالی ”بند“ ہے“ سے یہ مطلب کہاں نکلا۔ ادھار بند ہے بھی تو کہتے ہیں اور ”ناطقہ بند ہے“ بھی تو ایک محاورہ ہے۔

☆☆☆

ہم نے ایک بارتجویز پیش کی تھی کہ اگر کراچی کی تمام سڑکیں لارنس روڈ، فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ کی طرح مستقل طور پر کھود دی جائیں تو ٹریفک کا مسئلہ فی الفور حل ہو جائے نہ سڑکیں ہوں نہ ان پر سواریاں چلیں نہ ٹریفک ہو نہ ٹریفک کا ہفتہ۔ آج تک مذکورہ بالا سڑکوں کے متعلق کبھی نہ سنا کہ وہاں موٹریں لو گئیں یا کسی ٹرک نے کسی رکشہ پر مجرمانہ حملہ کیا۔ لوگ بالخصوص کے۔ ڈی۔ اے اور گیس دالوں کے جمعدار اور بیلدار بڑی دلجمعی سے عین سڑک کے بچوں بیچ بیٹھ کر گز گزئی پیتے ہیں۔ چوسر کھیلتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی توانی کی محفل بھی برپا کرتے ہیں۔ ٹریفک ان کو ڈور ہی سے دیکھتا، بے چارگی سے دانت پیتا گزر جاتا ہے ضرب خرابی کی بنیاد پر لگائی جائے۔ نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔

☆☆☆

کراچی میں آج کل گیس کی شکایت عام ہے۔ جس کو دیکھو پیٹ پکڑے پھرتا ہے۔ ایک روز ہمارے ایک دوست ناظم آباد کی چورنگی پر بھاگم بھاگ جاتے مل گئے۔ ہم نے پوچھا کہ اے جان قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج۔ بولے۔ ”گیس کی شکایت لے کر جا رہا ہوں۔“ ہم نے کہا۔ ”دیکھو۔ ہڑکا سر بہ نہار منہ کھاؤ اور کلونجی اور شہد ہم دزن لے کر کسی بوتل میں ڈال لو اور دن میں تین بار عرق گاؤ زبان کے ساتھ استعمال کرد۔ گیس کے لیے اکسیر ہے۔“ بولے ”جناب یہ دوسری گیس ہے جسے موئی گیس

کہتے ہیں۔ ہمارا پائپ کچھ لیک کرنے لگا ہے۔“ یہ ہمارا سوئی گیس والوں سے پہلا تعارف ہوا تھا۔ دوسرا اس وقت ہوا جب انہوں نے عین ناظم آباد کے چوراہے میں سڑک کھودی اور ٹریفک کو روکنے کے لیے رنگارنگ بورڈ لگائے تھے۔ یہ بات اس موقع پر یوں یاد آئی کہ یہ بورڈ اردو میں تھے اور خاصی مہذب زبان میں۔ جس میں ایک فقرہ اس قسم کا بھی تھا کہ ٹریفک کی دقت کے لیے جو ہماری وجہ سے پیدا ہوئی ہے ہم معذرت خواہ تو ہیں لیکن یہ کام آپ ہی کا ہے، یہ پائپ وغیرہ ہم آپ ہی کے لیے ڈال رہے ہیں۔ جب ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ محکمہ کار خیر کا محکمہ ہے۔ اس میں ان کا کوئی مالی یا تجارتی منافع نہیں ورنہ اس وقت تک ہمارا یہ خیال تھا کہ شاید گیس کمپنی والے بھی دوسروں کی طرح پیسوں ہی کے میت ہیں۔ گیس فراہم کرتے ہیں تو بل بھی بھیجتے ہوں گے۔ پیسے بھی وصول کرتے ہوں گے۔



ڈاک خانے دالو پانی چھوڑ دو

ایک مقامی اخبار میں ایک مراسلہ چھپا ہے جس کا عنوان ہے ”ڈاک خانے والے توجہ کریں“ اس سرخی کے نیچے مضمون یہ ہے کہ ناظم آباو میں پانی کی قلت ہے۔ آتا ہے تو قطرہ قطرہ پپ پپ آتا ہے۔ اس کا اُپائے کیا جائے، تدارک کیا جائے۔ ڈاک خانے والے اور کسی شکایت یا مراسلے کا جواب دیں یا نہ دیں۔ اس کا جواب انہوں نے ترنت دیا ہے کہ مگرمی! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ گھروں میں پانی چھوڑنا نہ چھوڑنا ڈاک کے محکمے کی فئے داری نہیں۔

ڈاک خانے کے اس مستعد افسر نے یہ تو وضاحت کر دی کہ پانی بند کرنا، چھوڑنا ہم ڈاک خانے دالوں کا کام نہیں ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان کا اپنا کام ہے کیا۔ اگر ڈاک بائٹنا کام ہے تو وہ تو پہلے ہی ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے ایک بار فرمایا تھا ”مورج رات کو ٹکنا چاہیے، اس کی اصل ضرورت رات کو ہے، دن کو تو ویسے ہی روشنی ہوتی ہے۔“ ہم بھی یہی کہیں گے کہ اگر ڈاک خانے والے پانی کی قلت و ور نہیں کر سکتے تو سمجھیے کچھ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ نامہ بری۔ تو کبوتر بھی بہ خوبی کر لیتے ہیں۔ آخر کیا ہی کرتے تھے۔ ٹکٹ لگانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ رجسٹری کرانے کا جھنجٹ بھی نہ تھا۔ بس کوٹھے پر انتظار میں کھڑے ہونا

پڑتا تھا۔ بہت ہوا کبوتروں کو چوگا دے دیا، دانہ ڈال دیا۔ سودہ ڈالنے اور کبوتر کو کھلانے ہی کی چیز ہے۔ نہ ڈالیں تو خاک میں مل کر گل دگزار ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑی قابحتیں پیدا ہوتی ہے۔ باغ ہوگا تو اس میں مگس ضرور آئے گی اور اس سے ناحق پردانے کی جان جائے گی۔



قصہ یہ ہے کہ لوگ پانی کی شکایت پانی کے محکمے کو لکھتے لکھتے تنگ آ گئے تھے۔ شکایت دُور کرنا تو ایک طرف، وہ لوگ رسید تک نہ دیتے تھے۔ پانی تو خیر ڈاک خانے والوں نے بھی نہ دیا لیکن جواب تو دیا اور جواب میں اسی طرح آدھا پانی یعنی آب موجود ہے، جس طرح کسی نے فرمایا ہے۔

”جس کو کہتے ہیں بشر اس میں ہے شروع و بنائیں۔“ اس اصول پر ڈاک وقت پر نہ ملنے اور رسالے چوری کیے جانے کی شکایت بھی ڈاک خانے کو بھیجنے کا فائدہ نہیں۔ وہ محکمہ آب رسانی کو بھیجنی چاہیے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ڈاک کی شکایت کا ازالہ وہ لوگ کریں یا نہ کریں ان کا افسر رابطہ جواب ضرور دے گا کہ حضرات۔ رسالے چوری کرنا ہم آب رسانی والوں کا کام نہیں ہے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔



کسی کا کام ہونا تو قسمت کی بات ہے، جواب ملنے کو بھی کام ہی سمجھنا چاہیے۔ فی زمانہ کوئی آدمی وہ کام تو کرتا نہیں جو اُس کے سپرد ہے یا جس کی اسے تنخواہ ملتی ہے۔ دوسرے کاموں کے لیے مستعد رہتا ہے۔ مثلاً ادیب سائیکل کا پنکچر لگاتا ہے اور سائیکل کا پنکچر لگانے والا شاعری کرتا ہے۔ ادبی جلسوں کی صدارت بنے اور موسیقی کی محفلوں کی سرپرستی آڑھتے کرتے ہیں۔ گویا جو تاپاش کرتا ہے۔ جو تاپاش کرنے والا گاتا ہے، گویا جس کا کام اُسی کو نہ ساجھے، وہ خود کرے تو ٹھیکہ گاہی باجے۔

کابل میں ایک بار ہمیں خط پوسٹ کرنا تھا۔ سارے شہر میں کاغذ لفافے اور ٹکٹ کی تلاش میں گھوم لیے۔ لیکن جہاں نقشے میں ڈاک خانہ لکھا ہوتا وہاں سبزی کی دکان ملتی یا تو رملتا۔ ڈنمارک کے ایک سیاح ہمارے ساتھ تھے۔ بے چارے بہت دن تصویری کارڈ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہے۔ ڈاک خانہ ملا تو دسی، ان کارڈوں کو گھر واپس لے گئے، جناب ظفر حسن ایک نے اپنی آپ بیتی میں جلال آباد افغانستان کا ذکر کیا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں اسٹیشنری یعنی قلم، دوات، پنسل کی کوئی دکان نہ تھی۔ کاغذ البتہ قصاب کی دکان سے ملتا تھا۔ اعتراض کرنے والے یہ رمز نہیں سمجھتے کہ قلم دوات، کاغذ آسانی سے ملنے لگے تو لوگ پڑھنے لگتے ہیں۔ شورش کرنے لگتے ہیں، حقوق مانگتے ہیں، آئین مانگتے ہیں۔ افغانستان میں تھوڑی سی قلم دوات کی دکانیں گھلی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سرکوا گئے ہیں۔ نہ قلم دوات ہو نہ کوئی محضر لکھے، نہ اخباروں کو مراسلے بھیجے، نہ کالم نگاری کرے۔ یہاں بھی گس باغ اور پروانہ کا قصہ ہے لیکن بات کابل کی بیچ میں رہی جاتی ہے۔ کاغذ تو قصاب کی دکان سے ملتا تھا، گوشت کہاں سے ملتا تھا؟ ہمارے ایک مہربان نے جوان دنوں کابل میں ہوتے تھے اور گدھے پالا کرتے تھے، جواب دیا کہ ورزی کے ہاں۔

☆☆☆

ڈاک خانے اور پانی کا مضمون ہمارے دوست نصر اللہ خان کے ہاتھ آیا ہے اور انہوں نے اسے اچھا نبھایا ہے۔ اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ یہ تعلق اتنا دور کا بھی نہیں ہے بعض لوگ بوتل میں خط بند کر کے سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور وہ خط ڈوبتا تیرتا بھگتا کبھی ساحل مراد پر آ بھی لگتا ہے۔ مکتوب الیہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اگو پانی دافر نہ ہوگا تو خط بھیجنے والا خط کی بوتل کہاں ڈالے گا۔

☆☆☆

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ۔ بڑا دانش مند مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمہاد کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دُور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے۔ کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی نظر آتی تھی، کہیں تیل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حُسن انتظام ایسا تھا کہ اسیر لوگ مونا اُچھالتے اُچھالتے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک، بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی پہلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے تھے یا اس کی کامرانی کے لیے چلے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو اور درگزر کا ماوہ از حد تھا۔ اگر کوئی آ کر شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائداد ہتھیالی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے، تو مجرم خواہ باوشاہ کا کتنا ہی قریبی مرزب کیوں نہ ہو، وہ کمال میر چشمی سے اسے معاف کر دیتے تھے بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب باوشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لے کر تارک الدنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



چند غیر ضروری اعلانات بس مسافروں کے لیے مرثدہ

کراچی بس مالک ایسوسی ایشن بڑے فخر اور مسرت سے اعلان کرتی ہے کہ آج سے شہر میں تمام بسوں کے کرائے وگنے کر دیئے گئے ہیں۔ اُمید ہے محبت دطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں مسافروں کے معیار زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوسی ایشن ہذا کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لیے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سواریوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں گنڈوں، اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لیے ہر بس کی چھت پر پائیدانوں پر گارڈوں پر انجن پر حتیٰ کہ سائلنسر تک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان خصوصی جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہوگا۔ شرح ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے

یعنی کھڑے ہونے اور لٹکنے والے مسافروں کے وصول کی جائے لی۔ آئندہ سے سب مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکا لگانے کا یکساں حق ہوگا حتیٰ کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی بس میں یتیم خانوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے والوں اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس مینٹگ میں غور کیا جا رہا ہے جو کراچی کا ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

پانی بند رہے گا

ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مزید ہو کہ جمعہ اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بند رہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تینس گھنٹے پانی بند رہنے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے میں دو دن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ نانے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ماہ محرم کی آمد تک ہم ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہل ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے واٹر ٹینکس میں فوری طور پر تین سو فیصدی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز افزوں مسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جا رہا ہے تاکہ زمین بھر بھری ہو جائے اور کتے آسانی

سے اس میں لوٹ لگائیں۔

آپ کا اپنا اسکول

انٹرنیشنل انگلش آکسفورڈ اسکول آپ کا اپنا اسکول ہے جو تعلیم کے جدید ترین اصولوں پر کھولا گیا ہے۔ چند خصوصیات۔

۱۔ فیس کا معیار نہایت اعلیٰ:

شہر کا کوئی اور اسکول فیس کے معاملے میں ہمارے اسکول کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انواع و اقسام کے چندے اس کے علاوہ ہیں بن کی تفصیل پرنسپل صاحب کے دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اساتذہ:

نہایت مختی، ایماندار اور قناعت پسند جن کو پیش قرار تنخواہوں پر رکھا گیا ہے۔ حام ٹیچر کی تنخواہ بھی ہمارے ہاں میونسپل کارپوریشن کے تعداد سے کم نہیں اور پرنسپل کا مشاہرہ تو کسی بڑی سے بڑی غیر ملکی کمپنی کے چوکیدار کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ چھٹیاں:

چھٹیوں کے معاملے میں بھی ہمارا اسکول دوسرے تمام اسکولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہر ماہ فیس جمع کرانے کے دن کے علاوہ قریب قریب پورا سال چھٹی رہتی ہے۔ جو والدین سال بھر کی فیس اکٹھی جمع کرا دیں، ان کے بچوں کو فیس کے دن بھی حاضری دینے کے ضرورت نہیں۔

۴۔ ماحول:

اسکول نہایت مرکزی اور پر رونق جگہ پر واقع ہے اور شہر کا سب سے قدیم

اوپن ایئر اسکول ہے۔ یہاں طلبا کو مناظر فطرت سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بالکل سامنے ایک سینما ہے اور ایک سرکس۔ ایک بغل میں موٹر گیراج ہے اور دوسری طرف گنر باغیچہ جس کی کھاد سارے شہر کو ہرا بھرا رکھنے کی ضامن ہے۔ پروفیسر کیوی کے اصول کے مطابق یہاں پڑھائی کتابوں سے نہیں کرائی جاتی بلکہ کسی اور طرح بھی نہیں کرائی جاتی تاکہ طالب علم کے ذہن پر ناروا بوجھ نہ پڑے۔

۵۔ نتیجہ۔ اسکول کا نتیجہ کم از کم سو فیصد رہتا ہے۔ کئی بار تو دو سو ڈھائی فیصد بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم اس اسکول کے پاس سے بھی گزر جائے تو پاس ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ طالب علموں پر امتحان میں بیٹھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ سب کو گھر بیٹھے کامیابی کی سندیں بھیج دی جاتی ہیں۔



نظر ثانی کے بعد

ایک مضمون نگار ایڈیٹر قومی ادب کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے۔

”بی، معاف فرمائیے گا مجھے علامہ امتداد جگت پورمی سے ملنا ہے جو ”قومی ادب“ کے ایڈیٹر ہیں۔“

ایڈیٹر: ”آئیے تشریف لائیے۔ اسم شریف؟“

مضمون نگار (م): ”بی ہاں میرا نام محمد شریف ہی ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ عاجز تخلص کرتا ہوں۔ شاعری ورثے میں ملی ہے، ادب گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے پردادا کے نثر دادا شیر شاہ سورمی کے زمانے میں اصفہان جنت نشان سے آئے تھے۔ میری والدہ کی خالہ کے پھوپھا شاداں ناشاد پوری بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔“

ایڈیٹر (ن): ”آپ کیا لکھتے ہیں؟“

(م): ”بی ایک افسانہ لایا ہوں۔ بالکل، اچھوتا موضوع ہے آپ دیکھیں گے تو!۔۔۔!“

(ن): ”چھوڑ جائیے افسانہ، اس کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ ضرور ہونا چاہیے۔ آپ

کو چھ مہینے کے اندر اندر اپنی رائے سے مطلع کر دوں گا۔“

(م): (لجاجت سے بی اگر گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ چھوٹا سا تو افسانہ ہے آپ

ابھی سن لیں اور اپنی رائے مجھے بتاویں۔ بس تین چار منٹ کی بات ہے۔ آپ اجازت دیں تو۔۔۔“

(ل) (گھڑی دیکھتے ہوئے) ”اچھا خیر پڑھیے۔ کیا عنوان ہے؟“

(م) ”عنوان بھی اچھوتا رکھا ہے میں نے۔“ ”کارِ خیر“ اس کا عنوان ہے۔“ بہار اللہ دتا بھی ہو سکتا تھا، لیکن وہ دُانے فیشن کا ہے۔“

(ل) ”اچھا اچھا پڑھیے۔“

(م) پڑھتا ہے۔

”رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی روشنی نظر نہ آ رہی تھی۔ یکا یک ایک پُرانی حویلی کی تیسری منزل سے آگ کی لپٹیں آنھیں۔ پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ آگ..... آگ..... بچاؤ..... بچاؤ..... معلوم ہوتا تھا کوئی لا پروا کرایہ وار انگلیٹھی بچھائے بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ اب وہ شخص غریب آگے آگے تھا اور آگ پیچھے پیچھے۔ دفعتاً آگ بچھانے والے انجن کا گھگھوسنا کی ویا۔ فائر مین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق سپاہی تھا۔ وروا زے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر ورتا ہوا کمرے میں گھس گیا اور اس حواس باختہ شخص کو شعلوں میں سے باہر نکال لایا۔ اب اُس نے شست باندھ کر پانی کا تریڑا دیا اور آگ بجھ گئی۔ آگ بچھانے کے دستے کا جمدار مولا بخش آگے بڑھا اور بولا۔ ”آفرین ہے تری بہادری پر۔ محکمے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔“ اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ ”دُرا دیکھنا تمہاری دانی مونچھ جل رہی ہے۔“ بہار اللہ دتا مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑا اپنی دانی مونچھ پر بھی ویا۔ دُور مشرق میں سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔“

(ل) ”افسانہ بُرا نہیں، عنوان کیا بتایا تھا؟ کارِ خیر! یہ بھی اس پر عین چسپاں ہوتا ہے۔“

تاہم بعض جگہ نظر ثانی کی ضرورت پڑے گی تاکہ جھول نکل جائے۔ ذرا شروع سے پڑھیے دیکھیں اس کا کیا ہو سکتا ہے۔“

(م) ”سُنیے۔“

”رات کے تین بجے ہوں گے۔ ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔“
(ن) ”(سر ہلاتے ہوئے) یہ تو نہیں چلے گا۔ ہر کوئی مطلب ہے پولیس والے بھی سو رہے تھے یعنی اپنی ڈیوٹی سے خافل تھے..... نہ نہ یہ ٹھیک نہیں۔ لوگ سمجھیں گے اس مُلک میں چوکی پہرے کا انتظام درست نہیں ہے..... اسے بدل کر یوں کر دیجیے۔“

”رات کے تین بجے ہوں گے۔ کوئی آدمی خوابِ خرگوش کے مزے نہیں لوٹ رہا تھا۔“
(م) ”(نیم احتجاجی لہجے میں) ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات کا منظر ہے، ایسے میں تو لوگ سو ہی رہے ہوتے ہیں۔“

(ن) ”ہاں آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا تو یوں کہی۔“
”شہر میں ہر کوئی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا، لیکن ہوشیار اور چوکس تھا۔“
(م) ”(منمناتے ہوئے) ”کیا فرمایا؟ سو رہا تھا اور چوکس بھی تھا؟“

(ن) ”ہاں یہ بھی کچھ بے معنی بات ہوگی۔ اچھا یوں تو کر سکتے ہیں۔“
”کچھ لوگ خرابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔“
”چلیے آگے چلیے۔“

(م) ”(کھٹکھارتے ہوئے) ”کہیں کوئی روشنی نظر نہ آرہی تھی۔“
(ن) ”(زُکیے) ”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا آپ استعارے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں اندھیر مچا ہوا ہے؟“

(م) ”(بی نہیں) ”یہ بات نہیں۔ رات میں بلب بجھا دیے جاتے ہیں۔“
(ن) ”(عزیز من) ”سب لوگ اتنے سمجھ دار نہیں ہوئے کہ یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ بہت سے

تو یہ سمجھیں گے کہ ہمارا ملک اندھیر نگری ہے۔ میری مانو تو اسے کاٹ ہی دو۔ اگر بلب جل نہیں رہے تھے تو ان کے ذکر سے فائدہ؟“

(م) (کسماتے ہوئے آگے بڑھتا ہے)۔

”یکایک ایک بُرائی حویلی کی تیسری منزل سے آگ کی لپٹیں اٹھیں پھر کسی کے چلانے کے آواز آئی آگ..... آگ..... بچاؤ..... بچاؤ۔“

(ن) گویا بھگدڑ مچ گئی؟“

(م) ”جی ہاں۔“

(ن) ”گویا ہم اپنے پرچے میں اس بات کو شہرت دیں کہ ہمارے عوام میں ذرا سی بات پر بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ یعنی وہ اوسان کھو بیٹھے ہیں..... نہ صاحب یہ نہیں چلے گا۔ یہ قومی ادب، کا دفتر ہے۔“ ”نثرِ سورا“ کا نہیں۔

(م) ”جی یہ تو محض افسانہ ہے، ایک تخلیقی کوشش میں بس آگ کا منظر بیان کر رہا تھا۔“

(ن) ”آپ اس میں ایک بہادر اور اپنے فرائض سے باخبر شہری کے بجائے ایک ایسا کردار لاتے ہیں جس کی ذرا سی بات پر بھی محض مکان کو آگ لگ جانے سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ کیا یہ ایسی کسی قوم کے مرد کے شایان شان ہے جس کے بزرگ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑایا کرتے تھے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بچاؤ بچاؤ کے بجائے اس کروار سے کوئی ایسی بات کہلواتا جو قومی تھاوضوں کے زیادہ مطابق ہوتی۔“

(م) ”مثلاً“

(ن) ”مثلاً وہ کہہ سکتا تھا۔“ ”جی، ایسی آگیں بہت دیکھی ہوئی ہیں ابھی بُجھا دیں گے۔“ ”بلکہ اس کو کہنا چاہیے۔“ ”آگ واگ کچھ بھی نہیں تخریب پسندوں کا پروپیگنڈا ہے۔“

(م) ”مری ہوئی آواز میں“ ”جی آگ تو بہر حال لگی تھی۔“

(۱) ”ہم جب کہتے ہیں ”آگ واگ کچھ بھی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بے بھی تو ہم کیا پروا کرتے ہیں۔ دلاوروں کے آگے آگ کی کیا ہستی ہے۔“

اولوالعزمٰن دانش مند جب کرنے پڑتے ہیں

سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

(م) ”خیر آپ کے کہنے سے کر لیتا ہوں، لیکن اس سے بات نہیں بنتی۔“

(۱) ”بنتی کیوں نہیں، آپ آگے چلیے۔“

(م) (آگے بڑھتے ہوئے)۔ ”معلوم ہوتا تھا کوئی لا پروا کرایہ دار انگیٹھی بچھائے

بغیر سو گیا تھا۔ اس کی چنگاری کپڑوں پر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔“

(۱) ”کیسا کرایہ دار!“

(م) ”لا پروا۔“

(۱) ”اول تو لا پروا کی ترکیب ہی غلط ہے۔ لاء عربی کا پروا۔ فارسی کا یا شاید ہندی

کا۔ خیر اسے بھی جانے دیجیے۔ آج کل سبھی ایسی زبان لکھنے ہیں لیکن لا پروا کی اور

غفلت کی ہم اپنے پرچے کے صفحات میں تشہیر کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور یہ آپ

نے کیا لکھ دیا کہ شخص مذکور انگیٹھی بچھائے بغیر سو گیا تھا۔ آپ ہمارے پڑھنے والوں

کے سامنے ایک غلط مثال پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ بھی ایسی ہی غفلت کریں۔“

(م) (معذرتاً) ”جی۔ میں نے اس نیت سے نہیں لکھا۔ انگیٹھی کا ذکر اس لیے کیا

کہ اس کے بغیر آگ نہ لگتی۔“

(۱) ”چلیے مان لیا آگ نہ لگتی اس سے کیا نقصان ہوگا؟“

(م) ”نقصان تو کچھ نہ ہوتا بلکہ نہ لگتی تو اچھا تھا۔“

(۱) ”اب آئے ماراہ پرتو پھر یونہی لکھو بھی۔ انگیٹھی کا ذکر بالکل اڑا دو۔ آگ کے

ذکر کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ نہ رہے بانس بجے بانسری۔ اچھا اب آگے پڑھو یہ بیچ

کا حصہ چھوڑ کر سیدھے سیدھے فائر مین کے کردار پر آ جاؤ۔“
 (م) ”ف.....ف.....ف..... فائر مین اللہ دتا جو منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم گڈز کا سابق فوجی تھا۔“

(ن) ”خوب بہت خوب لکھا ہے آپ نے ہمارا وطن بھی جہلم کی طرف کو ہے چکوال کا نام سنا ہے آپ نے۔ وہاں کے لوگ ہوتے ہی بہادر ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں.....! (م) بات کاٹ کر پڑھنا جاری رکھتا ہے۔“ (دروازے کے سامنے رکا۔ تھوڑی دیر موچتا رہا۔“
 (ز) ”ہیں موچتا رہا نہیں نہیں فائر مین کو سوچتے مت دکھائیے، اس کا کام تو بس آگ بجھانا ہے۔“

(م) ”اس سے کہانی میں زور پیدا ہوتا ہے۔“
 (ز) ”کہانی میں زور پیدا ہو گیا تو کیا؟ اس سے فائر مین کی تو کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا تو فائر مین کے ذکر کی کیا حاجت ہے۔“

(م) ”لیکن پھر فائر مین اللہ دتا اور جمعدار مولا بخش کے مکالمے کا موقع کیسے پیدا ہوگا؟“

(ز) ”یہ مکالمے تو آپ ان کے دفتر میں بھی دکھا سکتے ہیں۔“
 (م) (پڑھتا ہے) ”آگ بجھانے والے دستے کا جمعدار مولا بخش آگے بڑھا اور بولا۔“ آفرین ہے تیری بہادری پر بھگے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔“ اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ ”ذرا دیکھنا تمہاری واہنی موچنے جل رہی ہے۔“ بہادر اللہ دتا بھی مسکرایا اور پانی کا ایک تریڑ اپنی واہنی موچنے پر دیا۔ دُور اُفق پر پسیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔“

(ن) ”کیا یہ ذکر بہت ضروری ہے؟“

(م) ”کس چیز کا ذکر ہے؟“

(ن) ”جلتی ہوئی مونچھ کا۔“

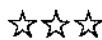
(م) ”یہ تو میں نے اپنے افسانے میں مزاح پیدا کرنے کیلئے ڈالا ہے۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس شخص کا ایسا انتہاک دکھایا گیا ہے کہ اسے اپنی مونچھ جلنے تک کی خبر نہیں۔“
(ن) میری مایے تو آپ اس ذکر کو خارج رکھیے۔ جب ہم نے آگ کا ذکر حذف کر دیا۔ جب مکان ہی کو آگ نہیں لگی تو مونچھ کو لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“

(م) ”پہلو بدل کر) مزاح.....!“

(ن) ”دو تو دیسے بھی رہے گا۔ لوگ کب ہنستے ہیں۔ جب ان کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ کیا آگ کا ذکر نکال دینے سے پریشانی رفع نہیں ہو جاتی؟ ضرور ہو جاتی ہے لہذا ہر شخص خوش ہوگا، ہر شخص خود بخود ہنسے گا۔ اچھا اب شروع سے سناؤ کہ کہانی کی کیا صورت ہے؟“
(م) ”جی سنیے!

”رات کے تین بجے ہوں گے۔ کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ کچھ ہوشیار اور چوکس تھے۔ یکا یک ایک پرانی حویلی کی تیسری منزل سے کوئی اکارا ”آگ داگ“ کچھ بھی نہیں لگی۔ تخریب پسندوں کا پراپیگنڈا ہے۔“ فائر مین اللہ دتا منجھلی عمر اور گٹھے ہوئے جسم کا جہلم کی طرف کا سابق فوجی تھا۔ آگ بجھانے والے دتے کا جمعدار مولا بخش آگے بڑھ کر اُس سے بولا۔ ”آفرین ہے تیری بہادری پر۔ مٹکے کو تجھ سے یہی توقع تھی۔“ اللہ دتا مسکرایا اور پانی کا تریڑ اپنی داہنی مونچھ پر دیا۔ ”دور افق پر سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔“

(ن) ”اب بات بنی نا! اب افسانہ بے نقص ہے اور ماہنامہ ”قومی ادب“ اسے آب و تاب سے چھاپے گا۔ نہیں شکریے کی ضرورت نہیں ”قومی ادب“ کا مقصد ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔“



علاج سے پرہیز بہتر ہے

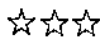
وہ دن گئے جب اخبار کا مطلب محض خبریں ہوتا تھا۔ خبریں تو آدمی ریڈیو سے بھی سُن سکتا ہے۔ چند خانے میں بھی سُن سکتا ہے، حجام کے ہاں بال کٹواتے ہوئے اور پنساری کے ہاں سودا لیتے ہوئے بھی۔ بلکہ یہ خبریں اخبار سے زیادہ تازہ ہوتی ہیں۔ اخبار فی زمانہ بارہ مسالے کی چاٹ ہے، یہ بات نہیں کہ اس میں خبریں نہیں ہوتیں۔ حسب خبریں ہوتی ہیں، جن کی آپ کو ضرورت ہے بلکہ جن کی ضرورت نہیں بھی ہے، صرف حال کی نہیں مستقبل کی بھی۔ آپ اپنی تاریخ پیدائش یاد رکھیے اور اپنا مَرَج معلوم کر لیجیے پھر آپ کو فی الفور معلوم ہو جائے گا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں اور کل کتنے پانی میں ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام اخباروں اور رسالوں میں آپ کے مقدر کے بارے میں ایک ہی بات لکھی ہو مگر بے شک تقدیر، پتھر کی لکیر ہوتی ہے لیکن اخبار تو سیاہی کی لکیریں ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ جس میں آپ کا مستقبل خوش آئند بتایا گیا ہے۔ اس پر اعتبار کیجیے۔ باقی کو چھوڑ دیجیے۔ بہر حال موضوع سخن ہمارا یہ ہے، اخبار میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ گو بھی پکانے کی ترکیبیں بھی سیز پوش کی کشیدہ کاری کے نمونے بھی، کپڑوں سے اچار کے داغ بھڑانے کے نسخے بھی اور طبّی مشورے بھی اور اشتہار بھی۔



دیے آدھے سے زیادہ اشتہار بھی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کو طبی مشورے ہی کہنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ اخبار میں ڈاکٹر اور حکیم کا کالم استعمال کر لیں، یعنی اس کالم میں دیے ہوئے مشورے اور کچھ فائدہ نہ ہو تو پھر کہاں جائیں۔ آپ کے سے مایوس العلاج مریضوں کے لیے ہی تو یہ سارے حکیم سنیا سی بادا، پردیسر اور عامل کامل اور جرمن، جاپان، خراسان، چین، انڈونیشیا اور لنکا دوا خانے ہیں۔ فقیروں کی چٹکیاں ہیں اور طلسمی انگوٹھیاں ہیں۔ اور مقناطیسی جھلے ہیں اور کراماتی تعویذ ہیں۔ تاہم بعض اخبار واقعی مستند ڈاکٹروں کے طبی مشورے بھی دیتے ہیں۔ کبھی مقامی ڈاکٹروں کے، کبھی غیر ملکی ڈاکٹروں کے بعض ان میں بہت مختصر بھی ہوتے ہیں۔ دلچسپ بھی اور کارآمد بھی۔ لاہور کے ایک مشہور سنجیدہ روزنامے میں ہر روز چوکھٹے میں جدید طبی تحقیق کا کالم چھپتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے جو تراشا ہے، وہ یہ ہے کہ سیرھیوں کے پھسلنے سے جو حادثات ہوتے رہتے ہیں کیا ان کا سد باب ممکن ہے!



آپ شاید کہیں گے کہ یہ تو طبی تحقیق نہ ہوئی۔ یہ وضاحت کروں کہ جب سیرھی گرتی ہے تو عموماً اس پر کوئی آدمی چڑھا ہوتا ہے اور وہ طبی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اگر نہ بھی چڑھا ہو تو سیرھی تو بہر حال ٹوٹتی ہے۔ اگر بانس کی سیرھی ہے تو اس کے مالک کو اس کے ٹوٹنے کا دکھ اپنی ٹانگ کے ٹوٹنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ بانس تو امر ترسکا ٹیلی ویژن دیکھنے کے لیے انٹینا اونچا کرنے کے کام آتا ہے۔ ٹانگ تو اس کام نہیں آ سکتی اپنے منہ مانگے دام نہیں پاسکتی۔



بہر حال اُد پر ہم نے صرف سوال درج کیا ہے۔ اصل چیز جواب ہے اور وہ یہ ہے

کہ۔ ”ہاں سید باب ممکن ہے، اگر سیڑھی کے استعمال میں احتیاط برتی جائے تو حادثوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ مثلاً سیڑھی کے اوپر تک نہیں جانا چاہیے۔ دو تین ڈنڈے نیچے رہنے سے توازن نہیں بگڑتا۔ حادثہ عدم توازن کے باعث ہوتا ہے۔“

آپ کہیں گے کہ دو تین ڈنڈے نیچے رہنے سے حاشہ تو بے شک نہیں ہوتا، لیکن آدمی چھت پر بھی تو نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اس کج بحثی کے جواب میں یہ عرض کریں گے کہ آپ کو اپنی جان اور اپنی سیڑھی زیادہ عزیز ہے یا چھت پر پہنچنا؟ آپ چھت پر جائیں ہی کیوں۔ چراکارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ آپ چھت پر جائیں گے تو اور بھی کئی قباحتیں پیدا ہوں گی۔ آپ ہمسائے کے گھر میں جھانکیں گے تو اس سے لپاؤ لگی ہوگی اور سیڑھی چڑھنے سے آپ کی ٹانگ نہیں ٹوٹی تو یوں ٹوٹ جائے گی بلکہ کچھ اور بھی۔

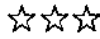


بس ہمارا صاحب مشورہ یہی ہے کہ اگر آپ کو سیڑھی پر چڑھنے کا بہت شوق ہے تو سیڑھی کے اوپر تک نہ جائیے۔ آدھی سیڑھی جا کر ڈنڈے پر بیٹھ جائیے اور پھر اتر آئیے۔ صرف بانس کی سیڑھی کی تخصیص نہیں۔ جو لوگ سیامت کی سیڑھی یا افری کی سیڑھی میں بالکل چوٹی پر چلے جاتے ہیں وہی زیادہ گرتے ہیں اور گزند اٹھاتے ہیں جو سیڑھی چڑھتے ہی نہیں ان کو ہم نے گرتے بہت کم دیکھا ہے۔ وہ جو کسی کا شعر ہے۔

گرتے ہیں شہ مواری میدان جنگ میں

وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

اس کا درپروہ مطلب بھی یہی نصیحت ہے کہ طفل کے نقش قدم پر چلو۔ اگر شہسواری کے شوق میں گھوڑے پر چڑھ گئے تو ہم تمہارے گرنے اور ہاتھ پاؤں تڑوانے کے ذمے دار نہ ہوں گے۔



شیخ سعدی سے بڑا دانا کون ہوگا۔ انہوں نے اپنی حکایات میں مشورہ دیا ہے اگر خواہی سلامت برکنار امت، یعنی اگر ڈوبنا مقصود نہیں تو پانی میں مت اتر وہم نے لوگ سفینوں میں تو ڈوبتے دیکھے ہیں لیکن خشکی پر کھڑا کوئی آدمی آج تک نہیں ڈوبا ہوگا۔ اگر آپ امتحان میں فیل نہیں ہونا چاہتے تو اس کا شرطیہ نسخہ ہے کہ پڑھیں ہی نہیں۔ الیکشن میں ضمانت ضبط نہیں کرانا چاہتے تو الیکشن میں کھڑے ہی نہ ہوں اور آپ کو اپنے بال بچوں کے مستقبل کی فکر ہے۔ ان کی فیسوں اور بیماریوں اور آوارگیوں اور پڑھ کر نوکریوں کی تلاش کے خیال سے وحشت ہوتی ہے تو بچے ہی نہ پیدا کریں بلکہ بچہ پیدا کرنے کی مشین ہی گھر میں نہ لائیں۔ ان مب امور میں ہمارا مفت اور طبی مشورہ ہے کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔



پرہیز علاج سے بہتر ہے

پچھلے دنوں ہم بیمار ہوئے۔ کیوں ہوئے؟ کیسے ہوئے؟ کس سے پوچھ کر ہوئے؟ اس کا جواب ہم نہیں دے سکتے۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم بہت شرمندہ ہیں۔ ہم سے بہت غلطی ہوئی اور آئندہ اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ آئندہ ہم بیمار ہوں تو جو چور کی سزا وہ ہماری سزا۔ اور چور کی سزا جوئی زمانہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اول تو پکڑا نہیں جاتا۔ پکڑا جائے تو بخوبی چھوٹ جاتا ہے۔ بشرطیکہ تھانیدار اچھا ہو۔ اور تھانیدار اچھا نہ ہو تو وکیل اچھا ہو۔

مدعی لاکھ برا چاہے یہ کیا ہوتا ہے



ہم صلح کل آدی ہیں۔ یونہی ذرا منہ پر سوجن سی ہو گئی تھی۔ وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ اتنی سوجن تو کسی طرم بلکہ بے گناہ کے تھانیدار کا ایک تھپڑ کھانے سے ہو جاتی ہے۔ ہمارے دوست ہمیں ایک حکیم حافق کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کہا بھٹی ڈاکٹری کے چکر میں نہ پڑنا۔ اسبغول استعمال کرو۔ ہم نے آکر اسبغول پانی میں بھگوایا اور پیلٹس کی طرح منہ پر باندھ لی۔ دو پار دن میں کوئی فائدہ نہ ہوا تو پھر حکیم صاحب کے پاس گئے۔ بولے یہ کیا باندھ رکھا ہے۔ ہم نے کہا آپ کے حب ہدایت اسبغول ہے۔

بولے۔ ارے۔ (پورا القاب ہم درج نہیں کرتے تاکہ ہماری دل آزاری نہ ہو) میں نے اسبغول کھانے کو کہا تھا گانے کو نہیں۔ تمہارا قبض دور ہوتا تو یہ سوجن بھی چلی گئی ہوتی۔ اب لکھو۔ ہینگ اور پھٹکری ہم وزن۔ دن میں دو بار۔ ہم نے کہا کس مقدار میں کھائیں۔ فرمایا کھائیں نہیں لگائیں۔ لیپ کریں۔ ضما فرمائیں اور پرہیز کا خاص خیال رکھیں۔ کوئی کھٹی چیز نہ کھائیں اور کوئی میٹھی چیز نہ کھائیں۔ تاکید ہے۔ ہم نے کہا انکو روکھا سکتے ہیں؟ سوال بے ضرر تھا لیکن بہت ناراض ہوئے۔



خیر ہم نے دوا کے ساتھ پرہیز شروع کر دیا حتیٰ کہ کھٹی ڈکھار لینے اور کسی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے سے بھی خود کو منع کر دیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہمارا اشارہ اپنی طرف ہے۔ حکیم صاحب کو تو ہماری بیماری سے معتد بہ فائدہ ہوا۔ وہ افراط زر کے حوالے سے کسی سے دس سے کم کا نوٹ ہی نہ لیتے تھے۔



بیدہ اضروہ کارگر ہوتی لیکن ہمارے ایک و وحش ہمیں ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ہم نے کہا۔ ”ہم آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔“
بولے ”کرو مشورہ۔ مشورے کی فیس دس روپے ہو گی۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا بتائیے جو ہمارا علاج کر سکے۔“
انہوں نے دس روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں خود اچھا ڈاکٹر ہوں بلکہ تعلیٰ نہ سمجھو تو بے مثل ڈاکٹر ہوں اور لالچی بھی نہیں ہوں۔ یہ فیس تو خیر مشورے کی تھی۔ اب میں سوائے علاج کی فیس اور دواؤں کی قیمت اور خرچہ اشتہارات پینٹنگ اور ڈاک خرچ کے تم سے کچھ نہ لوں گا۔ درویش آدمی ہوں۔ ڈیفنس سوسائٹی میں دو ہزار گز کے بنگلے پر پڑا ہوں۔ یہ دوا مسلسل استعمال کرواںشاء اللہ تندرست ہو جاؤ گے۔“

ہم نے کہا۔ ”دوسال میں؟“
 بولے۔ ”ہاں یہ کوئی سنگین بیماری نہیں ہے۔ معمولی سوجن ہے۔ پرہیز البتہ ضروری ہے۔ نمک اور مرچ سے مکمل پرہیز۔ آلو مت کھاؤ۔ انڈا مت کھاؤ۔“
 ہم نے کہا۔ ”جی اچھا۔“



چند دن میں اس علاج سے ہمارا جی بھر گیا اور ڈاکٹر صاحب کی جیب۔ اب ایک اور مہربان ملے وہ ہمیں ایک حاملہ کا مل کے پاس لے گئے۔ انہوں نے چاند کی چودھویں رات کو الو کے گھونسلے سے بیٹ لائے کو کہا اور ایک زندہ سا نڈھ ہماری جیب میں ڈالنے کی کوشش کی کیونکہ وید یعنی آیورویدک علاج بھی کرتے تھے۔ ہم وہاں سے چل دیے۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب پانی سے علاج کرتے ہیں۔ ہندی میں اسے جل چکٹا کہتے ہیں۔ بہت سادہ علاج ہے۔ مریض کو گردن سے پکڑ کر سات منٹ تک تالاب میں غوطہ دیا جاتا ہے۔ اور مرض رفع ہو جاتا ہے۔ اگر اس غوطے سے مریض زندہ برآمد ہو تو ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ لیکن پانی سے ڈرتے ہیں لہذا اس سے بھی کنارہ کیا۔ بولے۔

”اچھا علاج مت کرواؤ۔ پرہیز سننے جاؤ۔ پھل کی چیز کوئی نہ کھانا۔ وہ تمہارے لیے مضر ہے گی۔ دال منع اور گوشت منع اور سبزی تو بالکل ہی منع۔“



اپنی بیماری کی حکایت کو ہم مختصر کرتے۔ ہو میو پیٹھی کرتے۔ لیکن مٹھا منع تھا۔ کھانا بھی منع تھا۔ نمک مرچ بھی ہمارے لیے مضر پائے گئے حتیٰ کہ پھل کی چیزوں کی بھی ممانعت ہو گئی۔ اب صرف پینے کو پانی اور کھانے کو ہوارہ گئی تھی۔ یہ حال دیکھا تو ہم میں بیماری کی تاب نہ رہی۔ ناچار تندرست ہو گئے۔ مر تا کیا نہ کرتا۔



حکیم اور ڈاکٹر کچھ بھی کہیں۔ ہماری ناقص رائے میں علاج پرہیز سے بہتر ہے۔ اکثر اوقات علاج پر کم۔ پرہیز پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ لوگ پرہیز کرنے لگیں تو اس کے کتنے ہولناک نتائج برآمد ہوں۔ نہ ڈاکٹر نہ حکیم نہ دید نہ حامل کامل۔ نہ اسپتال۔ نہ مطب نہ چین ہیلتھ سینٹر نہ انڈونیشیا دوا خانے نہ فقیر کی چنگلی نہ جوگی کا عطیہ نہ دوا ساز کمپنیاں نہ جوشاندے خیساندے نہ نیولے نہ سانپ نہ ساندے نہ چھپکلیاں۔ اس وقت دنیا کی آبادی کو دوا حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بیمار ایک معالج۔ ایک چھوٹی سی اقلیت تندرستوں کی بھی ہے۔ لیکن وہ چنداں قابل لحاظ نہیں۔ اگر آدھی آبادی پرہیز کی بدولت بھوکوں مرقی ہے۔ معالج اور دوا ساز وغیرہ تو کون سی ملک اور قوم کی خدمت ہوئی۔ یہ ہو تو میڈیکل سائنس کیسے ترقی کرے۔ نہ صاحب نہ۔

(روزنامہ امروز لاہور۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸)



بیان پالتو جانوروں کا

بھلا ایسا بھی کوئی گھر ہے جس میں ایک نہ ایک پالتو جانور نہ ہو۔ گائے نہیں تو بھینس۔ بھیڑ نہیں تو بکری۔ کتا نہیں تو بلی۔ گھوڑا نہیں تو گدھا۔ جانور پالتا بڑی اچھی بات ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے۔ آپ نے یہ کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی طولے نے خرگوش پالا ہو۔ کسی مرغی نے کوئی بلی پالی ہو، یا کسی گدھے نے کوئی گھوڑا پالا ہو۔ گدھا بظاہر کیسا بھی نظر آئے، ایسا گدھا کبھی نہیں ہوتا۔

پالتو جانوروں کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم: دودھ دالے جانور، مثلاً گائے، بکری وغیرہ۔

دوسری قسم: دودھ پینے والے جانور مثلاً بلی۔ کبھی سامنے کبھی چوری چھپے۔

تیسری قسم: جو نہ دودھ دیتے ہیں نہ دودھ پیتے ہیں۔ مثلاً مرغی مثلاً کبوتر۔ مثلاً طوطا۔

چوتھی قسم ہم بھول گئے ہیں لہذا اسے نظر انداز کرتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا حال ان جانوروں کا لکھتے ہیں۔

بھینس

یہ بہت مشہور جانور ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ چوپایوں میں یہ واحد جانور ہے کہ موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔

کسی اور جانور کے آگے نہیں بجاتے۔

بھینس وودھ ویتی ہے لیکن ووکافی نہیں ہوتا۔ باقی گوالا (دودھ والا) دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون اچھی چیز ہے لیکن وودھ کو چھان لینا چاہیے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

بھینس کا گھی بھی ہوتا ہے۔ بازار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آلوؤں، چربی اور وٹامن سے بھرپور۔ نشانی اس کی یہ ہے کہ پیپے پر بھینس کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل میں نہ جانا چاہیے۔

آج کل کی بھینسیں انڈے نہیں دیتیں۔ مرزا خالب کے زمانے کی بھینسیں دیتی تھیں۔ حکیم لوگ پہلے ردھن گل بھینس کے انڈے سے نکالا کرتے تھے۔ پھر دوا جتنی ہے کل بھی نکال لیا کرتے تھے۔ بہت سے امراض کے لیے مفید ثابت ہوتی تھی۔

گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی ☆ جس نے ہماری گائے بنائی

یہ شعر مولوی اسماعیل میرٹھی کا ہے۔ شیخ سعدیؒ وغیرہ کا نہیں یہ بھی خوب جانور ہے۔ وودھ کم ویتی ہے۔ عزت زیادہ کر داتی ہے۔ پُرانے خیال کے ہندو اسے ماتا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ویسے بیلوں سے بھی اس کا یہی رشتہ ہوتا ہے۔

صحیح الحیال ہندو گائے کا دودھ پیتے ہیں۔ اس کے گوبر سے چوکا لیتے ہیں لیکن اس کا کاٹنا اور کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں جو گائے کو کاٹتا ہے اور کھاتا ہے۔ سیدھا نرک میں جاتا ہے راستے میں کہیں دم نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ گائے دودھ دینا بند کر دے تو ہندو اسے قصاب کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ قصاب مسلمان ہوتا ہے اسے ذبح کرتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کو کھلاتا ہے تو یہ سارے نرک میں جاتے ہیں۔ بیچنے والے کو روحانی تسکین ہوتی ہے، پیسے الگ ملتے ہیں۔

جن گائیوں کو قصاب قبول نہ کریں انہیں گوثالاؤں میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں وہ بھوکی رہ کر تپیا کرتی ہیں اور کوؤں کے ٹھونگے کھاتی پر لوک سدھارتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح ان کے فوٹو کھینچتے ہیں۔ کتابوں میں چھاپتے ہیں۔ کھالیں برآمد کی جاتی ہیں۔ زر مبادلہ کمایا جاتا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ دنیا گائے کے سینگوں پر قائم ہے۔ گائے خود کس چیز پر کھڑی ہے۔ اس کا گوبر کہاں گرتا ہے اور پیشاب کہاں جاتا ہے۔ یہ تفصیلات شاستروں میں نہیں لکھیں۔

بکری

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی، لیکن دودھ یہ بھی دیتی ہے۔ عام طور پر صرف دودھ دیتی ہے لیکن زیادہ مجبور کریں تو کچھ میٹگنیاں بھی ڈال دیتی ہے۔

جن بکریوں کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے ان میں ایک گاندھی جی کی بکری تھی اور ایک اخفش نامی بزرگ کی۔ روایت ہے کہ وہ بکری نہیں بکرا تھا، معقول صورت۔ یہ جو شاعری میں اوزان اور محروں کی بدعت ہے، یہ اخفش صامب ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ بیٹھے فاعلاتن فاعلات کیا کرتے تھے۔ جہاں شک ہو تصدیق کے لیے بکرے سے پوچھتے تھے کہ کیوں حضرت ٹھیک ہے نا؟ وہ بکرا اللہ اسے جنت میں یعنی بہشت والوں کے پیٹ میں جگہ دے، سر ہلا کر ان کی بات پر صا و کرویتا تھا۔ اس بکرے کی نسل بہت پھیلی، پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ سوتے جاگتے اس کے منہ سے لیس، لیس، سر، سر، بی، حضور، بی، جناب، بجا فرمایا وغیرہ نکلتا رہتا اسے بات سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔



ایک سپاسنامہ ایک بے لوٹ کارکن کی طرف سے

جناب والا۔ پاکستان کے بے لوٹ کارکنوں کی جماعت انجمن بے لوٹ کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ)۔ دل سے جناب والا کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جناب والا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محبت وطن پاکستانی مل کر حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ انجمن ہذا بھی غلوں دل سے موجودہ حکومت کے ہاتھ اسی طرح مضبوط کرنے کو تیار ہے۔ جس طرح پیش ازیں صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ صدر یحییٰ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ بلکہ ہر حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔

جناب والا! ہماری انجمن کی ایک خصوصیت حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے علاوہ میدان میں کود پڑنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم اپنے محبوب صدر کے ادنیٰ اشارے پر میدان میں کود پڑنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ میدان میں یہاں سے وہاں تک روٹی کے گدے نہالے اور غالیچے بچھا دیے جائیں۔ ان کے بغیر میدان میں کوونا گزند کا باعث ہو سکتا ہے۔ چوٹ آ سکتی ہے۔ جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہے۔

جناب والا۔ انجمن ہذا یعنی انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) کے وروازے سب پر کھلے ہیں کیونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ پہلے تھا۔ لیکن اس کو کارکنان مذکور ہاتھوں ہاتھ اٹھالے گئے۔ اب فقط وروازے کا ساکن بورڈ باقی ہے جسے انجمن ہذا بخوشی قوم کی نذر کرنے کو تیار ہے۔ یہ مضبوط شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر دھوبی کپڑے پٹخ سکتے ہیں جو دھوبی نہیں وہ سر پٹخ سکتے ہیں۔ غسل مروے نہلا سکتے ہیں بلکہ مردے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت آپ نہلا سکتے ہیں۔

جناب والا۔ انجمن ہذا کے سب ہی کارکنان پر لے ور جے کے بے لوث کارکن ہیں۔ ان سے کوئی ان کی خدمت کے سہلے کی بات کرے تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ خاکسار میاں فقیر محمد سیکریٹری جنرل انجمن ہذا بالخصوص فقیر مناش آدی ہے۔ اسے آپ سے کوئی خواہش نہیں ہے۔ سوائے عہدے کی خواہش کے، اور کسی قسم کا لالچ نہیں سوائے روپے کے لالچ کے۔ گزشتہ حکومتوں نے خاکسار کو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں خرید سکے۔ پہلے وزارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر لات ماردی۔ پھر سفارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر بھی لعنت ماردی۔ خاکسار دولت پر لات مار چکا ہے۔ ثروت پر لات مار چکا ہے۔ شہرت پر لات مار چکا ہے۔ اور بھی کئی چیزوں پر لات مار چکا ہے جو اس وقت یاد نہیں۔ افسوس اب یہ لات اس قابل نہیں رہ گئی کہ مزید کسی چیز پر ماری جاسکے۔ لات مارنے کی عاوت سے مجبور ہو کر اس خاکسار نے ایک کتے کے بھی لات ماردی تھی۔ وہ محاورے نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اس جذبہ ایثار کی قدر نہ کی۔ جواب میں دانت مار دیے۔ آدمیت سے بعید حرکت کی۔

جناب والا۔ جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا خاکسار کو آپ سے یا حکومت سے کسی قسم کی غرض نہیں ہے۔ تاہم خاکسار کو شہر کی مین مارکیٹ میں جو زیر تعمیر ہے۔ کونے والی بڑی وکان الاٹ کروئی جائے تو خاکسار کا قوم کی بے لوث خدمت کا جذبہ روز افزوں

ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ انھن ہذا کی عہدے داروں کے علاوہ جسے خاکسار ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جرم سمجھتا ہے۔ خاکسار کا چھوٹا سا ذاتی کاروبار یعنی فقیر اسٹون ورکس کے نام سے ہے۔ ہمارے محبوب صدر نے پچھلے دنوں فرمایا ہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر یعنی محنت کرنی چاہیے۔ لہذا خاکسار کی فرم نے لوگوں کو پیٹ پر باندھنے کے لیے پتھر بارحایت نرخوں پر سپلائی کرنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ پتھر منگھو پیر کی پہاڑی کے ہیں لہذا مضبوط ہونے کے علاوہ روحانیت سے بھرپور اور خیر و برکت سے معمور ہیں۔ یہ پتھر پیٹ پر باندھنے کے علاوہ اور یعنی کئی کام آ سکتے ہیں۔ محبوب لوگ ان سے سنگ آستیاں بنواتے ہیں اور اس پر عاشق لوگوں سے جیس گھسواتے ہیں۔ ناک رگڑواتے ہیں۔ ناک اور جیس کے علاوہ ان پر ہلدی اور مرچ بھی بہ خوبی پیس سکتے ہیں۔ خود کشی کے لیے بھی ہمارے ہاں کے پتھر آزمودہ ہیں۔ جو کوئی ان کو اپنے ساتھ باندھ کر دریا میں کودا پھر پانی کی سطح پر نہ ابھرا۔ ظالم سماج ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خود کشی کرنے والوں کے بے شمار تصدیقی سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہم کو ایک ہی پتھر سے فائدہ ہوا۔ قید حیات و بند غم سے نجات مل گئی۔ اب چند پتھر فلاں فلاں حضرات کو ہماری طرف سے بھیج دیجیے۔ دکان سے دریا کے پل تک پتھر پہنچانے کا خرچ ہم اپنے پلے سے دیتے ہیں۔ گاہک سے چارج نہیں کرتے۔



جناب والا۔ جانے کس شاعر نے کہا ہے لیکن خوب کہا ہے کہ اس رزق سے موت اچھی، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ واقعی ساری خرابیوں کی جز رزق یعنی غلہ وغیرہ ہے۔ اس وقت ہماری قوم کو غلے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پتھروں کی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جن کا نام جس اس وقت بھول رہا ہوں، دانہ گندم کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے۔ آج تک کوئی پتھروں کی وجہ سے نہیں نکالا

گیا۔ شاعر مذکور نے جو رزق سے موت کو بہتر بتایا ہے تو اس کی وجہ ہے مرنے والے کے مزار پر ہماری دکان کے مضبوط اور خوبصورت پتھر لگائے جاسکتے ہیں، کسی زندہ آدمی کے مزار پر نہیں۔ جس نے ایک بار اپنی قبر پر ہمارے ہاں سے پتھر کی تختی لگوائی ہمیشہ کے لیے ہمارا گردیدہ ہو گیا۔ جناب والا! ایک لوح مع قطعہ تاریخ ہم آپ کے نذر بھی کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کام آئے گا۔ گر قبول افتد۔



آگئے قوم کے بے لوث خدمت کرنیوالے

جوں جوں الیکشن قریب آرہے ہیں لوگوں میں بے لوث خدمت کا جذبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہم نے بعض جاننے والوں سے کہا بھی کہ حضرت آپ اپنا گھریا دیکھیے۔ کاروبار دیکھیے۔ اتنے ایشار کی کیا ضرورت ہے لیکن جواب یہی ملتا ہے کہ ہم قوم کی ناؤ کو منجھدار میں کیسے چھوڑ دیں۔ الیکشن میں کون کون کھڑا ہو رہا ہے فی الحال معلوم نہیں۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم کھڑے نہیں ہو رہے۔ کم از کم فی الحال ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ ہم نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ البتہ اگر دوسرے امیدوار موزوں نہ ہوئے جس کا ہمیں اندیشہ ہے تو شاید پبلک کے اصرار سے مجبور ہو کر قوم کی خدمت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کے لیے میدان میں آنا ہی پڑے کیونکہ بے جا ضد ہماری طبیعت میں نہیں۔ ہماری ذات اور خدمت محتاج تعارف نہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ہر طرح سے آپ کے قیمتی ووٹ کے مستحق بلکہ حقدار ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیا جائے جو جلد ہی اروو میں کیا جائے گا۔

ہمارے محترم بزرگ ڈاکٹر ایم اے خان زادہ نے البتہ ابھی سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اور ہمارے پاس ان کا ایک کتابچہ پہنچا ہے جس کا عنوان ہے ”قرآن کریم کی ایک ہزار آیات“ ڈاکٹر صاحب جامع کمالات آدمی ہیں۔ عام ڈاکٹر دکن کی طرح نہیں کہ صرف آدمیوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان کا فیض عام ہے۔ انشاء اللہ شفا یاب ہو کر واپس آئے گا۔ پہلے تو خود کو فقط ڈاکٹر ایم اے خان زادہ ہی لکھا کرتے تھے۔ پھر شاید کوئی پرانا شجرہ اپنا یا کسی اور کا ان کے ہاتھ آ گیا اور یہ خود کو نواب لکھنے لگے۔ اب کے سردرق پر جگہ زیادہ خالی پائی تو اپنی ذات پر سے تصوف و سلوک کے کچھ پردے بھی اٹھا دیے ہیں اور ہم ان کا نام یوں لکھا پاتے ہیں۔

”ڈاکٹر نواب ایم اے خان زادہ حنفی نقشبندی بریلوی۔“ اتنی نسبتیں مشخص ہونے کے باوجود ان کی وجہ شہرت کچھ اور ہے۔ آپ ہمارے کالموں کی رونق ملکہ تغزل، شعلہ سخن، موجد صوت واحد مس بلبل کے نفس ناظرہ یعنی دزیرا عظیم اور وزیر خارجہ ہیں۔ چونکہ اتنے بڑے منصب کے لیے فی زمانہ قریبی عزیز ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لہذا واضح ہو کہ یہ مس صاحبہ موصوفہ کے والد گرامی بھی ہیں۔

یہ بات پشتے تک محسوس نہیں، بعض اور لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب قصدِ خوں کو آئیں تو پہلے پکار دیں۔ سرورق پر جس طرح پرانی کتابوں میں ”حسب فرمانش“ ہے۔ ایسے سنت سنگھ، وغیرہ لکھا رہتا ہے۔ یہاں بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب مستطاب، بعون صنایع مکین دھکان جس کی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کیا جاسکتا ہے۔ ملکہ تغزل مس بلبل، احید دار قومی اسمبلی پاکستان الیکشن کی خصوصی درخواست پر لکھی گئی ہے۔ ورق الیئے تو معلوم ہوگا کہ خان زادہ صاحب سے لوگوں نے

کہا تھا کہ ”آپ ۱۹۱۴ء سے سیاست کے میدان میں آچکے ہیں خود کھڑے ہو جائیے کیونکہ آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن یہ نہ مانے اور اپنی جگہ بہ قول خود اپنی سب سے ذہین اور فہیم اولاد مس بلبل کو کھڑا کیا۔ قارئین کرام ہم سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ کیونکہ اظہر من الشمس ہونے کی وجہ ہم خود نہیں جانتے۔ اتنی تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جانے کے باعث کوئی کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں ان کو یہ شرہہ دیتے ہیں کہ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام عمر مس بلبل کو مشورہ دیتا رہوں گا اور جب کبھی قربانی کی ضرورت پیش آئے وہ مجھے سب سے آگے پائیں گی۔“ چونکہ لوگ قربانی کا نام سنتے ہی کھال لینے پہنچ جاتے ہیں۔ لہذا ہم واضح کرویں کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ لفظ یہاں استعارتا استعمال کیا ہے۔



دستور بنانا خصوصاً اسلامی دستور بنانا ہمارے ہاں گھریلو دستکاری بن چکا ہے۔ جہاں دو آدمی بیٹھ گئے اسلامی دستور بنانا شروع کر دیا۔ صدر مملکت کا اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اور مس بلبل نے ہمیں اور ہم ایسے ہی ددایک اور صاحبان علم و فضل کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ اب کی اتوار ہمارے ہاں آئیے۔ کھانا ہوگا اور کھانے کے بعد پاکستان کا دستور بنا کر صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ افسوس کہ ہم نہ جا سکے اور دستور بننے میں اتنی دیر ہو گئی کہ مس کے لیے ہم قوم کے آگے شرمندہ ہیں۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے کے لیے چلے جاتے اور دستور بنا آتے تو ڈاکٹر صاحب کو یہ کتابچہ نہ چھاپنا پڑتا مس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ مقصد اس کا بھی ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کرنا ہے۔



اس الیٹن نامے کا نام ہم بتا چکے ہیں۔ ”قرآن کریم کی ایک ہزار آیات۔“ انداز

اس کا یہ ہے کہ پہلے آیت۔ پھر ترجمہ۔ پھر توضیح۔ توضیح میں لامحالہ مس بلبل کی زبردگی اور خدمات اور عزائم کے حوالے اور اشارے آگئے ہیں۔ مثلاً آیت تو یہ ہے۔ (ترجمہ) اور بس نے جہاد کیا خدا کی راویں پھر قتل ہو گیا یا غالب آ گیا۔ توضیح میں یہ بشارت دی گئی ہے۔ کہ مس بلبل اپنی بزم نعت و ادب کی بس کی دوبانی اور مستقل صدر ہیں۔ سارے اسلامی ملکوں میں شاخیں قائم کریں گی۔ پھر آیت ہے (ترجمہ) ”اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو اور یوں اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک“ توضیح میں ارشاد ہوتا ہے کہ ”صدر ایوب کو نالائق کہنے والا خود نالائق ہے۔“ ایسے ہی ایک آیت کی توضیح میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ وزیر خارجہ نے یک طرفہ معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کر کے غلطی کی۔ مس بلبل کو ”انتخاب مل گیا“ تو یہ کشمیر اور حیدر آباد دونوں کے معاملات اقوام متحدہ میں ایک ساتھ پیش کریں گی۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ قومی اسمبلی کا ممبر؟ ہوتا ہے وہیں نشستن، گفتن اور برخاستن کر کے گھر چلا آتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذکر کا کیا محل ہے؟ ایسے ہی کم فہم مگس کے باغ میں جانے پر معترض ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پردانے کے خون کا کیا تعلق ہے۔ بات میدھی صاف ہے۔ مس بلبل اسمبلی کی ممبر بن گئیں تو ہم پاکستان کے تین کروڑ شاعروں کی طرف سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو وزیر یعنی وزیر خارجہ بنایا جائے۔ اس لیے نہیں کہ ہم چاہتے ہیں۔ یہ ملک کے باہری رہیں، کبھی یہاں نہ آئیں بلکہ اس لیے کہ یہی ہیں جو اقوام متحدہ میں کشمیر اور حیدر آباد کے مسائل کو منظوم کر کے پیش کر سکتی ہیں۔ اتنی لمبی لمبی نظمیں سننے کی کس میں تاب ہے۔ اقوام متحدہ کہے گی کہ بابا جاؤ کشمیر لے جاؤ اور حیدر آباد بھی لے جاؤ اور ہاں یہ جو نا گڑھ بھی رکھا ہے۔ اپنے سوٹ کیس میں ایک طرف کو اسے بھی ڈال لو۔



ڈاکٹر خان زادو صاحب کا یہ پمفلٹ ”پیرا گر نہ تواند پدر تمام کند“ کی تعریف میں

آتا ہے کیونکہ کچھ دنوں پہلے خود مس صلیبہ نے جو اپنا منشور انتخاب نظم میں چھاپا تھا۔
اس میں فقط یہ لکھا تھا کہ۔

۔ میں چاہتی ہوں قومی اسمبلی میں پہنچ جاؤں
نغموں سے سارنی سوئی ہوئی قوم کو جگاؤں

ارادہ یہ مبارک ہے لیکن مس بلبل نے ذہین اور فہیم ہوتے ہوئے بھی یہ شاید نہیں
سوچا کہ کسی کو کچی نیند جگا دیا جائے اور وہ بھی نغموں سے یعنی غریلیں وغیرہ گاکر تو وہ کتنا
شور مچاتا ہے۔ فیل مچاتا ہے۔ جگانے والے کی جان کو آجاتا ہے۔ اسی لیے رات کے
وقت ریڈیو پاکستان والے اعلان کرتے ہیں کہ اپنا ریڈیو آہستہ بجائیے۔ جب ایک
آدمی فساد پھیلا سکتا ہے تو پوری قوم کو جگانے کا نتیجہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ اور قوم
بھی کون سی۔ پاکستانی قوم؟

☆☆☆

حکیم بقل بطورا

آج صبح ہم نے اخبار کھولا تو اس میں کئی خوشی کی خبریں نظر آئیں۔ ایک تو یہ کہ کراچی کے اسپتالوں کو نکتے کے کانٹے سے بچاؤ کی دوا یعنی میرم نومبر سے ملنے لگے گی۔ دوسری یہ کہ کراچی کارپوریشن نے پبلک کے پُر ذرا صرار پر دسمپتمبر سے شہر کی صفائی کی مہم شروع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے کیونکہ اکتوبر میں دس سالہ ترقیات کے جشن منائے جانے ہیں۔

ایک اخبار میں کے ڈی اے کی سرگرمیوں کے متعلق چار صفحے کا ضمیمہ بھی دیکھا، جس میں کے ڈی اے کے محکمہ پانی کے انجینئر کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہر کی شادابی کے لیے پانی از بس ضروری چیز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ خود کو کتوں سے کٹوانا چاہتے ہیں، وہ نومبر تک انتظار کر لیں۔ اس کے بعد اپنا شوق جتنا جی چاہے پورا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعلان کی نقلیں کٹوں میں بھی تقسیم کر دی گئی ہوں گی تاکہ اپنا منہ بند رکھیں۔ دہن سگ بہ اعلان دوختہ بہ۔

کورنگی سے ایک صاحب کٹوں کے لیے ”مٹا گزٹ“ نکالنا چاہتے تھے اور اس کی کثیر الاشاعتی کے بارے میں بڑی امیدیں رکھتے تھے، اگر وہ نکل آیا ہو تو یہ اعلان جلی

حروف میں اس میں چھاپ دینا چاہیے، ورنہ ہم اہل شہر کو مشورہ دیں گے کہ آج کا اخبار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کریں۔ جونہی کوئی ٹکٹا اُن کی طرف لپکے، اُسے ڈانٹ دیں کہ دُور مومے۔ یہ دیکھ اعلان آ گیا ہے کہ نومبر تک کا ٹکٹا منع ہے، کیونکہ ابھی وہاں نہیں بنی ہے، ٹیلی ویژن پر بھی اس کی تشہیر ضروری ہے کیونکہ بڑے گھروں کے تو گنتے بھی باقاعدگی سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔

اب رہی کراچی کا رپورٹیشن کی صفائی کی مہم۔ کارپوریشن والے سیدھی انگلی یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ انہیں اس کا خیال ہمارا کالم پڑھ کر آیا ہے اور عشرہ ترقیات محض بہانا ہے۔ ہم نے لاہور کا ذکر کیا تھا کہ وہاں جا بجا کوڑے کے ڈھیروں میں بالنس کھڑے کر کے بینرز پھیلا دیے گئے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔

تفصیلات پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس مبارک اور ضروری مہم کے لیے کارپوریشن کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ، انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور باغبانی ڈپارٹمنٹ کو کچی نیند سے جگا کر کہا جائے گا۔

”ہاں تو صاحبو! دکھاؤ ذرا اپنے جوہر۔ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔ اس کا کچھ اشارہ بھی اس اعلان میں ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو نوٹس دے گا کہ اپنے اپنے گھروں پر سفیدیاں کراڈ، جونہیں کرائے گا اس کے..... وغیرہ وغیرہ۔“

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے محکمے بھی نوٹس دیں گے، لیکن کس بات کے، اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہمیں ڈر ہو گیا ہے کہ ہم نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی، کہیں اُدپر کے لیے نہ مل جائے۔ ہم نماز بخشوانے کی فکر میں ہیں، کارپوریشن روزے ہمارے گلے میں ڈالنے کی سوچ رہی ہے۔ ہم نے پوری خبر کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کہ لوگ بھی چاہیں تو کارپوریشن کو نوٹس دے سکتے ہیں کہ اٹھو! کوڑے کے ڈھیر۔ کرو صاف نالیاں شہر کی۔

ایک صاحب نے تو ابھی سے یہ قال بد زبان سے نکال دی ہے کہ دیکھنا یہ کارپوریشن شہر والوں کو ہسٹنگی بنا کے چھوڑے گی۔

پچھلے دنوں اخبار میں اس قسم کی خبر بھی دیکھی کہ آئندہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلدیہ کا چیئر مین مقرر کیا جایا کرے گا۔ ہر چند اس خبر میں یہ ذکر نہیں کہ موجودہ چیئر مین اور وائس چیئر مین وغیرہ کسی اسپتال میں ڈاکٹر لگا دیے جائیں گے۔ تاہم اس تجویز کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ آخر اتنے سارے ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔ ان سے کچھ کام تو لینا ہی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا منظر آتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ایم بی بی ایس خان (محمد باقر بن سلطان خان) بلدیہ کے دفتر میں چیئر مین بنے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سننے کے لیے اسٹیتھو سکوپ ہے اور دوسرے میں تھرما میٹر..... جس سے اپنا کان کھجا رہے ہیں اتنے میں ایک اہل کار فائل بغل میں دابے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے چہرہ اسی کو آرڈر دیتے ہیں کہ ددکپ کو نمین مکچر کے بنا کے لاؤ۔

وہ صاحب عذر کرتے ہیں کہ میں ابھی پی کے آیا ہوں، لیکن ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک اور میں کیا حرج ہے۔ مکچری تو ہے چائے تو نہیں کہ نقصان کرے۔ آپ کو کو نمین مکچر پسند نہیں تو فلو مکچر بھی ہے۔ اچھا تو کیا بات ہے؟“

”جناب پر انمیری اسکول چاہیے رنچھوڑ لائن میں اس کے لیے پیسے منظور کیے جائیں۔“

”کیا علامات ہیں؟“

”جناب بچے نا تعلیم یافتہ ہیں۔“

”ایکسرے کرایا؟“

”جی کس چیز کا؟“

”کس چیز کا؟ اسکول کے بچوں کا“

”جی وہ تو نہیں کرایا، کرائیں گے۔“

”دیکھے صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

”اسکول کے لیے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فی الحال سارے بچوں کو جمع کر کے ایک ایک ٹینکہ بیٹے کا لگا دیجیے۔ بہت دوا ہے ہمارے پاس اور اسکول جہاں بنانا مقصود ہے، وہاں فی الحال ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑک دیجیے۔“

وہ صاحب دوسری فائل آگے بڑھاتے ہیں۔

”ابدالی ردڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بعضوں کی تو ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”ہاں، ہاں ابدالی ردڈ کی حالت واقعی خراب ہے۔ جا بجائے فریکچر ہے۔ اُس کا بھی ایکسرے کرانا ضروری ہے۔ فی الحال تو پولیس کی تہ جہا کر پٹی باندھ دی جائے۔“

”جی سڑک کے؟“

”ارے نہیں، زخمی ہونے والوں کے۔“

اس مسند پر ڈاکٹر دوں کا حق ثابت ہے تو حکیموں کا کیوں نہیں۔ ہمارے مہربان فاضل طب حکیم بقل بطور ا صاحب بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں مسند چھٹی ہے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔

جو شخص فائل لے کر اندر آتا ہے، پہلے اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ اسے جو شانددے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد احوال سننے ہیں۔

اہل کار یہاں بھی دبی بات دہراتا ہے کہ پرائمری اسکول چاہیے اور سڑک مرمت طلب ہے۔

حکیم صاحب فکر مند ہو کر فرماتے ہیں۔

”جی ہاں، میں نے بلدیہ کے مسائل کا قارورہ دیکھا ہے۔ واقعی بڑی خراب حالت ہے۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ سارے عملے کو جلاب دینا پڑے گا۔“

اب رہا پانی، تو گویا ریسرچ اور تحقیقات کے بعد کے، ڈی، اے کے انجینئروں نے بھی یہ راز پالیا ہے کہ شہر کی شادابی سے پانی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ بات ہم نے بھی کہی تھی، لیکن ہم ٹیکنیکل آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اس دعوے کے لیے ثبوت میں شواہد اور دلیلیں نہیں تھیں۔

بہر حال اس اہم انکشاف کے بعد کیا ہم توقع کریں کہ ہماری ٹنکی میں پانی آیا کرے گا۔ اور حلامہ اقبال ٹاؤن کے پارک کی طرف توجہ کی جائے گی جس میں گتے لوٹتے ہیں بلکہ اب تو وہ بھی لوٹتے لوٹتے تنگ آ جائیں۔“



ذکر دردازدں کا، کرسیوں کا

ادر بورے کا

آج کل یہ پیشکش سب ہی سیاسی جماعتوں کی طرف سے سننے میں آرہی ہے کہ ہمارے دروازے سے بھی محبت وطن لوگوں پر کھلے ہیں۔ بعض جماعتوں نے تو اب محبت وطن کی شرط بھی اڑا دی ہے۔ کیونکہ اتنے سارے محبت وطن لوگ کہاں سے آئیں گے۔ بعض جماعتوں نے کوئی نہ کوئی اصول بھی رکھے تھے۔ ان کی شرط بھی اڑا دی گئی تاکہ لوگوں کو خواجواہ کسی قدغن یا گھٹن کا احساس نہ ہو۔ سیاسی فلسفوں اور اصطلاحوں کو بھی فی الحال اٹھا کر طاق پر رکھ دیا گیا ہے کہ لوگ ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے نہ ہچکچائیں۔ اصل میں یہ زمانہ مقابلے کا ہے۔ لوگ تھوڑے ہیں سیاسی جماعتیں زیادہ ہیں۔ جس طرح بعض مہذب ملکوں میں آبادی کے ہر پچیس آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں ہر پچیس آدمیوں کے پیچھے ایک جماعت ہے یا یوں کہیے ہر جماعت کے پیچھے کم بیش پچیس آدمی ہیں گویا ہم بھی مہذب ملکوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اطرس کی طرح تھوڑا سا جی کڑا کر کے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی مہذب ہیں۔ ہم بھی ترقی یافتہ ہیں۔ الحمد للہ۔

جس طرح اسکولوں کے دروازوں پر ایک زمانے میں لکھا رہتا تھا۔ ”داخلے جاری ہیں۔“ اکثر جماعتوں کے دروازوں کی پیشانی پر بھی یہی لکھا ہے۔ ”داخلے جاری ہیں۔“ اگرچہ ایک آدھ جماعت نے ندرت بھی دکھائی ہے، داخلے کو خار بے لکھا ہے۔ ”خار بے جاری ہیں۔“

پچھلے دنوں بہت سے لوگ بلکہ نائب صدر اور سکریٹری وغیرہ اس جماعت کے خار بے والے دروازے سے نکلے اور کسی اور جماعت کے ”داخلے جاری ہیں“ والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ بعض جماعتیں رضا کاری پر یقین نہیں رکھتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عوام کو اپنے بڑے بھلے کی کیا تمیز ہے۔ وہ لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دھکیل دھکیل کر، ہلکے ہلکے کر ان دروازوں میں داخل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بعض دروازوں میں تو آمد و رفت دھکا چیل کو پہنچ گئی ہے۔ دروازوں پر بھی اس کا اثر پڑا ہے اور وہ چوکھٹ سے الگ ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے دو ایک ماہ بعد کو اڑ بالکل ہی اتار کر رکھ دیے جائیں۔ اڑدھام اور زیادہ ہوا تو کیا عجب خالص الخالص لوگوں کو چھت کے موکھوں سے بھی اندر لٹکانا پڑے۔ پرانی ڈیوڑھیوں، خصوصاً محبوباؤں کے دولت کدوں کے دروازوں پر ایک زمانے میں دربان کھڑے رہا کرتے تھے۔ آنے والوں کی ساری دھائیں عموماً صرف دربان ہو جایا کرتی تھیں۔

خائب جیسے ان کے قدم بھی لیتے تھے کہ ذرا داخلہ مل جائے۔ دربان رکھنے کا یہ رسم آج بھی ہے لیکن ان کا کام آنے والوں کو رد کنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کہیں کوئی دوبارہ باہر نہ نکل جائے۔ ان دولت کدوں کو ایک طرح کے چوہے دان کہہ سکتے ہیں کہ چوہا اندر تو با آسانی دندانہ تار جز گاتا چلا جاتا ہے۔ بس ذرا باہر نکلنے کی پرابلم ہے۔ ایک زمانے میں پارٹیوں میں آگے پیچھے دونوں طرف دروازے رکھنے کا رواج تھا۔ اس میں بڑی

خرابی ہوتی تھی۔ بعض اوقات ہوا تیز چلتی ہو تو آدمی اوھر سے داخل ہوتا تھا اوھر سے باہر نکل جاتا تھا۔ ہمارے مرحوم دوست اے ڈمی اطہر کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ ان دنوں پیپلز پارٹی نئی نئی بنی تھی۔ بہت زیادہ محفوظ اور امن کی جگہ بھی نہ تھی۔ وقت کی سرکار لانچی چارج بھی کرتی رہتی تھی۔ بس ایک دن سنا کہ آپ پیپلز پارٹی میں داخل ہوئے۔ دوسرے دن سنا کہ خارج ہو گئے۔ جھونکا ہوا کا آ یا اور آ کر گزر گیا۔

پس جماعتوں والوں نے سب سے پہلا کام تو یہی کیا کہ عقبی دروازے بند کیے۔ بلکہ مقتول کیے کہ اب یہاں سے کوئی نہیں، کوئی نہیں جائے گا۔ اب ہوا اور آندھی سے کسی خطرے کا موسمہ بھی نہ رہا۔ بس کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ ان سے ہوا آتی رہتی تھی۔ سانس ہی تو لینا ہوتا ہے۔ پھر کچھ لوگ نکلنے کے لیے ان کی سلاخیں اکھاڑنے لگے۔ بعض ان کے پیچھے سے تاک جھماک بلکہ آنے جانے والوں سے ساز باز بھی کرنے لگے۔ پس وائش مند سیاسی جماعتوں نے یہ درپچے بھی بند کیے۔ اب روزانہ اور روشن دان رہ گئے۔ جب یہ دیکھا کہ اتنی ردشنی بھی نقصان دہ ہے۔ بعض لوگوں کی آنکھوں کو نقصان دیتی ہے ان کو بھی بند کیا۔ لکڑی کے دروازوں کی چولیس ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اور جماعتوں کی بھی۔ اس لیے بعض ودر اندیشوں نے چوبی کواڑوں کے بجائے مشناطیسی لوہے کے کواڑ لگا دیے ہیں۔ جو شخص ان کے دروازے کے پاس سے گزرتا ہے، بس ٹھاہ کر کے آن لگتا ہے۔ اور لگتے ہی اس میں سے آواز نکلتی ہے کہ میں گمراہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو اب حقیقت کا پتا چلا ہے۔

عمار توں کا ذکر ہے تو فرنیچر کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ کرسی آج کل تہذیب کا لازمہ ہے۔ ہر کسی کو کرسی کی ضرورت ہے اور تلاش ہے۔ کسی گھر کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پوچھ لیتا ہے کہ وہاں کرسی بھی ملے گی؟ یہ غالب کا زمانہ نہیں کہ لوگ بوریا بچھا کر آنے والوں کا انتظار کرتے تھے اور غالب کے ہاں تو وہ بھی نہ ہوتا

تھا۔ بعض لوگ جب تک ان کے پاس گُرسی رہتی تھی، قیام فرماتے تھے۔ جب کسی ضرورت سے صاحب خانہ گُرسی خالی کر لیتا تھا یا نیچے سے کھینچ لیتا تھا۔ تو فوراً کسی اور گھر کا راستہ دیکھتے تھے۔ اور ان کو طرح طرح کے ضمیر کے تقاضے یاد آ جاتے تھے۔ اور ناخوب، خوب ہو جاتا تھا۔ بعض جماعتیں گُرسیوں کے علاوہ تخت بھی رکھا کرتی تھیں۔ یہ بھی بڑی آرام دہ چیز ہے۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ اس فرنیچر کو کبھی کبھی ہائے ہنوز ہو جاتی ہے۔ تخت کا تختہ ہو جاتا ہے۔ لہذا فی زمانہ اس کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ گُرسیاں بھی آج کل بڑی بڑی بننے لگی ہیں۔ ایک آوی بیٹھتا ہے دوسرا اس کی گُو میں بیٹھ جاتا ہے۔ ایک دو کو اس کے ہاتھوں پر بیٹھا لیتا ہے اور ایک آوہ پیچھے لٹک بھی جاتا ہے۔ اٹا البتہ اس میں بھی ہے کہ اس کو ٹانگ سے پکڑ کر کوئی کھینچے تو پھر بھی ایک ساتھ گرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر۔ بورے پر بیٹھنے والا اس لحاظ سے اچھا رہتا ہے کہ وہ گرتا نہیں اور گرے تو اس کے زیادہ چوٹ نہیں آتی۔

(بقلم خود مورخہ ۶-۳-۲۱ روزنامہ امروز)



قصہ آب رواں کا اور مچھلیوں کا

لاہور میں زمانہ پولیس کے ٹریفک سنبھالنے کی خبریں کراچی پہنچی ہیں اور سنو بھائی کے کالم کے باوجود بہت سے لوگ لاہور جانے اور اپنا چالان کرانے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ بلکہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ کراچی میں بھی ایسا ہی کیا جائے تاکہ لوگوں کو چالان کرانے اور مار کھانے کے لیے دور کا سفر نہ اختیار کرنا پڑے۔ لاہور کے اخباروں میں یہ آیا ہے کہ جہاں زمانہ پولیس کو ٹریفک کنٹرول کے لیے تعین کیا گیا وہیں ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ تماشائی جھوم کر آئے۔ ٹھٹ لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیبیاں اس ٹریفک کو کنٹرول کرنا جانتی ہوں گی اور کر لیں گی لیکن ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

آب رواں کے اندر مچھلی چائی تونے

مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

ٹریفک کنٹرول کرنا بلکہ کسی طرح کا بھی کنٹرول عورتوں کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ یہ تو سڑک کی آدروفت ہے۔ اس ویسے رنگ و بو میں..... کوئی ان کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے جب نیستی سے ہستی کے راستے پر کنٹرول کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے لیے منصوبہ بندی کے محکمے بنتے ہیں تو عورتوں ہی

سے پہل کی جاتی ہے کہ کسی کو آنے نہ دیں۔ بہت رعایت کی تو ایک یاد دہکا کوہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی قطرہ قطرہ بہت ہو جاتے ہیں۔ رات کو دیر سے گھر آنے والے بہت سے صاحبان بھی خواتین کی ٹریفک کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں کا تجربہ رکھتے ہوں گے۔ بعض تو دروازے پر لال تھی دیکھ کر دیوار پھاندنا مستحسن سمجھتے ہیں یا اپنے ساتھ کسی نوحہ گر کو رکھتے ہیں تاکہ بیلن یا جھاڑو کا چھلا دار اسی پر ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ”قصہ ایک کنوارے کا“ میں دل خوش خان کا احوال۔



لاہور سے اس قسم کی خبریں بھی آئی ہیں کہ اگر کسی چوک پر ٹریفک کی چھتری کے نیچے کوئی ایسی سپاہن کھڑی کر دی گئی کہ بک سٹک سے درست کچھ طرح داری بھی رکھتی ہو تو بعض موٹروں والے اس چھتری ہی کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ برابر وہیں گھوم رہے ہیں۔ سنا ہے ان کو نظر بد سے بچانے کے لیے یہ بھی لے کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد کانٹیل بھی رہے جو لوگوں کو ہٹو بچو کرتا رہے۔ چونکہ بعض مرد کانٹیل وغیرہ بھی طرح دار ہوتے ہیں اس لیے اس جوڑے پر ایک اور سنتری کو متعین کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ یوں ٹریفک کا مسئلہ حل ہونہ ہو، لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ..... بڑی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ برٹنی باروٹ نے چور پکڑا۔ برٹنی باروٹ کو سبھی جانتے ہیں قتالہء عالم ہے۔ یہ خبر فرانس کی ہے اور راوی یوں بیان کرتا ہے کہ مس باروٹ نے ایک شخص کو چھت پر فرار ہوتے دیکھ کر سختی سے ڈانٹا۔ اس شخص نے حکم کی تعمیل کی اور اس کی خواب گاہ سے پڑائی ہوئی رقم اور زیور اس کے حوالے کر دیے۔ مس باروٹ کو چاہیے تھا کہ چور کی اس اوپر خود قربان ہو جاتیں یعنی اپنے گھر سے خود ہی چلی جاتیں لیکن انہوں نے پولیس کو فون کر دیا اور اس نے اس نامعلوم شخص کو آ کر گرفتار کر لیا۔ مس

باردوت کا تعلق فلموں سے ہے۔ ان کو چور بھی فلمی ملا۔ یوں لگتا ہے کہ بے چارے پہلے ہی موصوفہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ پولیس کی گرفتاری کو قند مکر سمجھنا چاہیے۔ عام زندگی میں لوگ ایسے سدھے ہوئے نہیں ہوتے۔ کوئی روکے یا لٹکارے تو چاقو یا پستول سے جواب دیتے ہیں۔ پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت تو جہاں تک ہمارا خیال ہے کوئی بھی نہیں دیتا۔ ہمیں تو یہ سارا افسانہ لگتا ہے۔ اک ذرا پلاٹ اس میں کمزور ہے۔

☆☆☆

چوری کے ساتھ کوئی اور قافیہ باندھتے متو بھائی سے ڈر لگتا ہے لیکن بندہ بشر ہے، خواہ دروی ہی میں کیوں نہ ہو۔ ہمیں ڈر ہے، یہ پیپیاں کہیں سماج ہی کو لال تتی نہ دکھانا شروع کر دیں اور یہ منظر نہ ہو کہ سماج تو آکر لال تتی پر ٹھٹک گیا۔ اور انہوں نے ہری تتی کے رخ سڑک پار بھی کر لی اور کسی راغبیر کا ہاتھ پکڑے پکڑے قاضی کے ہاں راضی ہونے پہنچ گئیں۔ جن لوگوں نے لاہور میں زمانہ پولیس کا ڈول ڈالا ہے۔ انہوں نے شاید لگس کے باغ میں جانے اور پروانے کا خون ناحق ہونے کا قصہ نہیں سنا۔ بس اتنا دیکھا کہ جہاں کسی لیڈی کا ٹیبل نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ٹھہرو۔ وہاں دس آدمی ٹھہر گئے بلکہ پوچھنے لگے کہ محترمہ آگے کیا حکم ہے۔ کھڑے رہیں یا چلے جائیں۔ اس کا باعث قانون کے احترام کے علاوہ کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

گھر آئے چور کو پولیس کے حوالے کرنے کی بات بھی پسند نہیں آئی۔ ویسے جو چاہے بڑی باردوت کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اس چور سے ہمیں ادھنری کے ایک قصہ کا چور یاد آیا جو ایک شخص کے ہاں چوری کرنے گیا تو پستول دکھا کر کہنے لگا۔
”ہاتھ کھڑے کرو۔“

اس شخص نے ایک ہاتھ کھڑا کیا۔ چور نے کہا۔ ”دوسرا بھی۔“ اس شخص نے معذرت کی کہ گھٹیا ہے۔ اس ہاتھ کو میں جنبش نہیں دے سکتا۔ چور نے پوچھا۔ ”درم بھی ہے۔“ اس شخص نے کہا ”پہلے تھا۔ اب نہیں ہے۔“ اس پر مکالمہ بازی شروع ہو گئی۔

”کوڑیا لے سانپ کا تیل استعمال کیا؟“

”بہت کیا۔“

”بقراطی گولیاں استعمال کیں۔“

”پانچ مہینے متواتر۔ ان کے علاوہ لوب کبیر۔ معجون فلاسفہ اور اطریفل جالینوس بھی استعمال کر دیکھے حتیٰ کہ لعوق خراسانی بھی کھاتا ہوں۔“ اب چور اپنا کام تو بھول گیا، مشورے دینے لگا اور بولا۔

”مجھے بھی یہ مرض رہا ہے۔ ڈاکٹری علاج کرایا؟“ مریض نے کہا۔ ”بہت کرایا۔ سیرے نزدیک تو ڈاکٹر سب کے سب چور ہیں۔“

اس چور نے ڈاکٹر جتنے ہوئے اسے ایک دو نسخے اور بتائے۔ فاسفورس کا تیل وغیرہ۔ مریض نے کہا۔ ”کچھ افادہ نہیں ہوا۔“ اس پر اس نے کہا۔ ”پھر تو ایک ہی دوا ہے۔ شراب کے دو گھونٹ جو کام کرتے ہیں وہ ان تیلوں اور معجونوں کے بس کی بات نہیں۔ چلو ذرا کپڑے پہنو، باہر کوئی شراب خانہ کھلا ہو تو دو گھونٹ پی آئیں۔ تکلف مت کرو پیسے سیرے پاس ہیں۔“



اُ بھی کل کی بات ہے

اسکول کے زمانے میں فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی قیمتوں کا پڑھا کرتے تھے تو تعجب کیا کرتے تھے کہ ہیں گیہوں بھی روپے کا چار من ہو سکتا ہے؟ گھی بھی روپے کا چھ سیر ہو سکتا ہے، چنے کی دال دو پیسے کی سیر ہو سکتی ہے۔ یقین نہیں آتا تھا۔ اب جو ہم بیس پچیس برس پہلے کی قیمتوں کا احوال پڑھتے ہیں تو اس سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ روز نامہ امروز لاہور کے ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں اکبری منڈی کے بھادڑ چھپے تھے۔

مونگ دس روپے من
ماش ۱۲ روپے من
موٹھ ۱۲ روپے ۹ من
مسور نور روپے من
چنے سفید سو اسات روپے من
گرز دس روپے من
شکر تیرہ روپے من
تیل سرسوں ۵۴ روپے من

تیل بنولہ ۵۲ روپے من

گھی ویسی ۱۴۵ روپے من

گویا ابھی ۱۹۵۰ء میں گھی پونے چار روپے سیر تھا اور وہ خالص پنجاب کے گھی یا پنجاب کے خالص گھی کی بات تھی۔ نقلی میں بنا سیتی گھی ضرور ڈیڑھ دو روپے سیر ہوگا۔ اب تو وہ بھی ساڑھے سات روپے سیر ہے، اور اس قیمت پر بھی سیدھی انگلی نہیں نکلتا۔ اصلی گھی کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اصلی گھی سونے کے کشتے سے بہتر ہے یعنی اس سے زیادہ طاقت لاتا ہے۔

پھر ایسا زمانہ آیا کہ بنا سیتی گھاؤکان سے لینے کے لیے سونے کے کشتے کی طاقت ور کار ہونے لگی۔ اصلی گھی کا تو ہم نے پوچھنا بھی بند کر دیا ہے۔ سوچنا بھی بند کر دیا ہے، بیس روپے سیر کے آس پاس ہوگا۔ اب ہم کھائیں گے بھی تو ہمیں نقصان کرے گا جس طرح ہم خالص آنا کھالیں، خالص وووہ پی لیں، خالص ہلدی اور سرج استعمال کر لیں تو پیٹ میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے جو انجن ڈیزل سے چلتا ہو اُسے پیٹرول سے چلانے کی کوشش غلط ہے۔

مسور کی وال اُن دنوں نور روپے من لیتی۔ چار پونے چار آنے سیر کہتے۔ اُس زمانے میں یہ منہ اور مسور کی وال کا محاورہ سمجھ میں نہ آتا تھا، اب آتا ہے اور بہت آتا ہے۔ گڑ کا بھاؤ بھی آپ نے پڑھ لیا؟ پیار آنے سیر یہ بھی تھا۔ اب تین چار روپے کا سیر ہوگا۔ وہ بھی ایسا کہ جتنا گڑ ڈالے اتنا ہی پھیکا۔

مُرے زمانے میں ایک محاورہ ہوتا تھا کہ جو گڑ دینے سے مر جائے اُسے زہر کیوں دیا جائے۔ یہ سستے زمانے کی باتیں ہیں اب تو زہر وینا سستا رہے گا، جو زہر دینے سے مر جائے اُسے گڑ کیوں دیا جائے۔ گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز بھی اُسی زمانے کا محاورہ ہے، اب تو شاید گلگلے ہی سستے ہوں گے۔



شکر بھی اُن دنوں تیرو روپے من تھی۔ تیرہ روپے کو چالیس سیر پر تقسیم کرنا ہمیں نہیں آتا۔ میڑھا سوال ہے۔ چھ سات آنے سیر کا اندازہ کھجیے۔ اسی لیے اس زمانے میں شکر لبوں کی وہ قدر نہ تھی جو آج کل کے زمانے میں ہے۔ خواباں کا بھی یہ حال تھا کہ بولتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے شیرینی بانٹ رہے ہوں۔ ہم ریوڑیاں بانٹ رہے ہوں بھی کہہ سکتے تھے، لیکن محاورے میں ریوڑیاں لینے والے کا اپنا ہونا ضروری ہے۔ نہ ہم خواباں کو یہ کہہ سکتے ہیں، نہ ہمیں کسی کا اپنا ہونے کی کبھی سعادت حاصل ہوئی۔



بس اب تو یہی رہ گیا ہے کہ تاریخ میں فیروز شاہ تغلق کا باب نکالیں، پُرانے اخباروں میں منڈیوں کے بھاؤ تلاش کریں اور اُن کو شہد لگا کر چائیں، لیکن صاحبو! اب تو شہد بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ یہ نہیں کہ مٹھیاں مہنگی ہو گئی ہوں اور انہیں پھولوں سے رس چوسنے کے لیے پہلے سے زیادہ پیسے دینے پڑتے ہوں۔ ابھی تک پھول بھی مفت، ان کا رس بھی اور کھیاں بھی، لیکن چینی تو مہنگی ہے۔ جو شہد کا جزو اعظم ہوتا ہے ہم نے سوات میں، سیدو شریف میں سب سے مشہور کمپنی کے صدر دفتر سے شہد کی بوتل خریدی تو اُس سے بھی چینی کا ڈلا نکلا۔ پتا نہیں کمپنی والے بے ایمانی کرتے ہیں یا مٹھیاں۔ نئی زمانہ سب ہی کچھ لکھن ہے۔

(باتیں انشاء جی کی انبار جہاں ۷۴/۶۶-۲۶)



کیا پانی بھی برادر

۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں جب کہ ہم اپنے مکان میں آئے نہیں تھے، اسے شوق سے دیکھا کرتے تھے، پانی کی آمد کا یہ حال تھا کہ دڑاتا ہوا چڑھتا تھا، جیسے شاعر نے بحرِ ظلمات میں گھوڑوں کے دوڑانے کی کیفیت بیان کی ہے اور ٹنکی کو بھر کر کناروں سے باہر گرنے لگتا تھا، حتیٰ کہ ہمیں بھاگ کر والو بند کرنا پڑتا تھا۔ اُدھر ہم مکان میں آئے، ادھر کسی نے کڈی اسے والوں کو خبر کر دی کہ یہ شخص اہل بیت سے عقیدت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں تیمم کرنا پڑا۔ نماز تو خیر تیمم کے ساتھ ہو جاتی ہے، لیکن کھانا پکانا، نہانا دھونا تو از روئے شرع بھی تیمم کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم نے زرخیر خرچ کیا اور آنگن میں کنواں بھی حوض بنوایا اور مزید زرخیر سے ایک مشین لگوائی۔ لیکن چند دن میں اس بے زبان مشین نے بھی شکایت شروع کر دی کہ حضرت میں پانی چڑھاسکتی ہوں، بنا نہیں سکتی، کے ڈی اے والے پانی چھوڑیں۔ وہ اس حوض میں آئے، تب میں اسے اوپر چڑھاؤں۔ ہم نے اسے آکسیجن اور ہائیڈروجن سپلائی کرنے کا وعدہ بھی کیا، لیکن اس نے اپنی پُر امن عدم تعاون کی تحریک جاری رکھی۔

☆☆☆

بہت دن ہم ٹیکس تو کے ڈی اے کو دیتے رہے اور پانی باہر سے بالٹیوں میں منگاتے

رہے، کیونکہ وہ دن حُب الوطنی کے تھے۔ جس چیز کی قلت اور گرانی کی شکایت ہم کرتے، جواب ملتا کہ اُسے یہ دن ملک برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جا رہا ہے۔ چادل کے ساتھ یہ ہوا تھا، ہم نے یہ سمجھ لیا کہ پانی بھی برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جاتا ہوگا۔ لہذا شکایت کرنی ٹھیک نہیں۔ ٹھیک کے علاوہ شکایت کرنا قرین مصلحت بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک بارگی جو بھی نظام حکومت بدلا، اور لوگوں نے نئے سرے سے پانی مانگا۔ تو حکومت نے لوگوں کے گھروں کے باغیچے کٹوا دیے۔ انعام دزانی صاحب کچھ دن خوب لڑے، انتظامیہ کے کالموں اور نظموں کی قزولیاں بھونکتے رہے۔ آخر ہار کر بیٹھ گئے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی آ کے مکان بھی ڈھا دے کہ اس کی وجہ سے پانی کی قلت ہے۔ یہ وہ زریں دور تھا جب دودھ دہی کی دکانوں پر جالیاں لگائی جا رہی تھیں، اور جمعداردن کی فوج ظفر موج سڑکوں پر نمودار ہوئی تھی، حتیٰ کہ ہمیں اپنے اور پڑوسی کے محلِ وقتی جمعدار گھسینا مسیح کے متعلق پہلی بار معلوم ہوا کہ دراصل کارپوریشن کا تنخواہ دار ہے۔ لیکن یہ چاردن کی چاندنی تھی، اس کے بعد وہی ہوا، جو چاردن کی چاندنی کے بعد ہوتا ہے۔



ہمارا وہ گمان تو جس کا تعلق عقیدے اور مذہب سے تھا، غلط ثابت ہوا۔ تحقیق پر پتا چلا کہ کے ڈی اے کے سبھی افسران مجاز بحمد اللہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ محرم کے دنوں میں پانی کا بالخصوص بند ہونا محض امرِ اتفاقی ہے، یا زیادہ سے زیادہ کے ڈی اے کی نالائقی کہا جاسکتا ہے۔ مگر آج کل کون محکمہ ہے جو نالائقی نہیں دکھاتا۔ پھر بشارت ہوئی کہ اڑن کھٹولا آئے گا، اک لال پری کو لائے گا۔ معاف فرمائیے ہم پر بھی ان دنوں فلموں کا اثر ہونے لگا ہے۔

معلوم یہ ہوا تھا کہ آبِ رسانی کا نیا منصوبہ مکمل ہو رہا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جا

بجائے کس گھدر ہی ہیں، ٹریفک بند ہے اور پائپ پڑ رہے ہیں۔ اب کہ پانی کا وہ ریلا آئے گا، کہ شاید ابوسمبل کے مندروں کی طرح کراچی کو بھی کہیں اور آباد کرنا پڑے گا۔ یہاں تو بس ایک بڑی سی جھیل ہوگی، جس کے کنارے بیٹھ کر کراچی والے مچھلیاں پکڑا کریں گے، یا رویا کریں گے کہ کاش ہم نے یہ آرزو نہ کی ہوتی، اور ہم نے کی بھی تھی تو اتنا پانی تھوڑا مانگا تھا۔

☆☆☆

ہم پاکستانی لوگ حادثہ اس نوکر کی طرح ہو گئے ہیں، جس نے آقا سے کہا تھا کہ میری تنخواہ بڑھا دو بیچے ورنہ..... اور جب آقا نے پوچھا ورنہ کیا.....؟ تو وہ سہم کر بولا۔
”ورنہ میں اسی تنخواہ پر کام کرتا رہوں گا۔“

پس قلت آب اور گرانی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھی ہم اس تنخواہ پر کام کرتے رہے، حتیٰ کہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے کے ڈی اے کے چیئرمین سومر و صاحب نے بشارت دی کہ لوگو انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، اب اپنے اپنے گھرے تیار رکھو، پانی آیا کہ آیا، اور ہاں ٹوٹی پوری مت کھولنا، ورنہ پورے گھر میں پانی بھر جائے گا۔ اور کے ڈی اے..... ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس کے مقابلے میں ہوا یہ کہ پکانے ریندھنے کو بھی پانی مشکل سے دستیاب ہونے لگا۔ اب ہم حیران تھے کہ سومر و صاحب کا پانی کہاں گیا، وہ سیلاب بلا کسی اور کے گھر جانے کے بجائے ناظم آباد کی طرف آیا ہوتا۔ بارے مستفیض احمد صدیقی صاحب کا بیان آیا جس سے اس پانی کا مصرف معلوم ہوا۔ خبر ملی ہے کہ کے ڈی اے نے وہ سارا پانی شہریوں کی امیدوں پر پھیر دیا ہے۔

☆☆☆

اب یہ بحث تو ناظم آباد کی مجلس ہائے کے سکتر مستفیض احمد صدیقی صاحب

اور کے ڈی اے کے سومرو صاحب کے درمیان ہے کہ کس نے کتنا پانی لیا اور کس نے کتنا ٹیکس دیا۔ ہم ادھر مستفیض صاحب کی ہاں میں ہاں ملائیں گے کہ پھر کہتے کہ ہاں کیوں ہو.....؟

ادھر سومرو صاحب نے کوئی جواب دیا، یا عذر کیا کہ زیادہ پانی کیا کرو گے۔ تم ہندو تھوڑا ہی ہو کہ صبح صبح اشان کرنے بیٹھ جاؤ۔ مسلمان تو جمعے کے جمعے نہاتا ہے، تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ بے شک آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر کسی نے کہا کہ مستفیض صاحب اور سومرو صاحب..... دونوں بہ یک وقت کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ تو اس حالہ ہم کہیں گے کہ ہاں آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے امن عدم تعاون والے تھوڑا ہی ہیں۔ ویسے ہم جانتے ہیں کہ جو وہ کہیں گے جواب میں۔ یعنی سومرو صاحب ایک صاحب کسی نشانے پر تیر مار رہے تھے، سارے تیر ادھر ادھر لگ رہے تھے۔ نشانے پر کوئی نہ بیٹھتا تھا، آخر بولے ”تعب کی بات ہے۔ یہاں سے تو تیر بالکل ٹھیک جاتا ہے، نشانے کے قریب جا کر جانے اے کیا ہو جاتا ہے۔“ سومرو صاحب بھی شاید یہ فرمائیں کہ یہاں سے تو پانی ٹھیک جاتا ہے، اور بہت جاتا ہے۔ اس انشا صاحب کے گھر پر جا کر جانے اے کیا ہو جاتا ہے۔

(وخل در معقولات۔ روزنامہ جنگ ۱۸/۳/۱۸)



واپسی چھر خان کی!

”السلام علیکم“

”علیکم السلام۔ آج بھی چھر خان۔ روزہ ہے یا لوگوں کا خون چوستا پھر رہا ہے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے خود روزے سے ہوں۔“

”تجھے ہم سے کیا مطلب، ہمارا عمل ہمارے ساتھ۔ دیکھ عالی صاحب نیک ہو گئے،

ہم بھی ہو جائیں گے، جب سے وہ عمرہ کر کے آئے ہیں، روزہ، نماز، تراویح وغیرہ

سب کا اہتمام ہے۔ ہم بھی اللہ نے چاہا تو عمرہ کرائیں گے۔“

”تو کیا عمرہ ادا کرنے سے پہلے روزے نماز کی ممانعت ہے؟“

”ارے تو کیوں مذہبی بحثوں میں پڑتا ہے اندیشہ شہر میں مبتلا ہوتا ہے، بتا تیری کیا

خاطر کردں۔ تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے، جیسا کہ ملیریا کے اعداد و شمار سے

ظاہر ہے۔“

”شکریہ، ابھی سامنے حلوائی کے کوئڈے پر سے چکھوتیاں کر کے آیا ہوں۔“

”تو کیا اس نے جالیاں ہٹا دیں۔“

”جالیاں۔ اجی حضرت وہ تو لوگوں نے دد دن کو اس ڈر سے لگائی تھیں کہ مارشل لا

والے دھر لیں گے۔ جب دیکھا کہ یہ معاملے سول حکام بھی گارپوریشن وغیرہ پر

چھوڑ دیے گئے ہیں، تو اتار پھینکیں۔“

”اچھا آج کوئی کہانی سنانے آیا ہے۔ ہمارا قصور معاف کر۔“

”جی نہیں۔ کہانی سنانے نہیں۔ بتادلہ خیالات کرنے آیا ہوں۔“

”تو پھر جلدی سے کر، ہمارے خیالات ٹولے لے اپنے خیالات ہمیں دے دے۔“

”ہم پہلے ہی اپنے خیالات سے تنگ ہیں۔“

”میرا خیال تھا۔ آپ کچھ دن یونٹ وغیرہ ٹوٹنے کے مسئلے پر رائے زنی کریں

گے۔ اب تو خوش ہیں ناں آپ۔“

”تجھے ہمارے خوش ناخوش ہونے سے مطلب تو تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ پنجابی نہ

مہاجر۔ نہ نیا سندھی نہ پُرانا سندھی۔“

”جی یہ تنگ نظریاں آپ اشرف المخلوقات کو سبارک ہمارے ہاں ایسی تفریق نہیں،

ہم تو چھوڑنا بنائیں گے ایک ہی۔“

”کیا پڑی کیا پڑی کا شور بہ، ارے تو تو پڑی بھی نہیں ہے۔“

”پڑی دوی کی باتیں بہت ہو چکیں، یہ جمہوریت کا زمانہ ہے بندوں کو کرنا کرتے

ہیں تو لائیں کرتے۔“

”کیا مطلب۔ تو بھی ایکشن کی سوچ رہا ہے۔ سر ذائقہ الحسن کے رجسٹر میں نام

لکھائے گا۔“

”جی ہاں جب آبادی کی بنا پر ہی سب کچھ ہونا ہے تو ہم بھی ہیں۔“

”تو بھی اے فرزند کتہاں اپنی خودی پہچان۔“

”آپ لوگ تو پورے ملک میں بارہ کروڑ ہوں گے یہاں ایک جو ہڑ پر ہماری اتنی

آبادی ہوگی، یہ جو آپ کے سامنے کی سڑک پر کوڑے کا ڈھیر ہے، اور بسے آپ کے

دس کالم بھی نہیں اٹھوا سکے، کوئی دس لاکھ چھوڑنا اس پر آباد ہوں گے۔“

”اچھا بابا! جو تیرا جی چاہے کر۔ ہم سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ آج ہفتے کا دن ہے ہمیں اپنا کالم لکھنے دے۔“

”پھر آپ ڈاکٹر دوں پر لکھیں گے؟“

”ارے نہیں، وہ تو ایک ڈاکٹر صاحب پر لکھ دیا تھا۔ سب کو ناراض کر لیں تو ہماری بیماریوں کا علاج کون کرے گا؟ بہت بیماریاں ہیں ہم میں بن کا فارما کو پیا جس ذکر ہے اور نہیں بھی ہے۔“

”آپ تو وہی آدمی ہیں۔“

”نہیں دہمی نہیں ہوں، سائنس کی ترقی کے ساتھ دواؤں میں بھی ترقی ہوئی ہے، بیماریوں میں بھی ہوئی ہے، ڈاکٹروں کی فیسوں میں بھی ہوئی ہے۔ پہلے ایسی رنگارنگ ٹھنڈی میٹھی چار چار انچ لمبے ناموں والی بیماریاں کہاں ہوتی تھیں۔ لوگوں کو کھانسی بخار وغیرہ ہوتا تھا۔ حکیم کی دد پیسے کی ددا سے ٹھیک ہو جاتے تھے، اب تین منٹ کے ڈیڑھ سو روپے ویٹے ہیں اور مر جاتے ہیں۔“

”یہ تو زیادتی ہے۔ بعضے بچ بھی جاتے ہیں۔“

”ہاں، بعض قسمت والے بچ بھی جاتے ہیں، بسے اللہ رکھے اُسے کون ڈاکٹر چکھے۔ آپ نے اکثر ڈاکٹر دوں کی زبان سے یہ قول سنا ہوگا کہ آپریشن کامیاب ہوا۔ مریض مر گیا۔“

”لیکن اب تو دواؤں میں بہت ریسرچ ہوئی ہے، کیمسٹ کی دکان پر جا کر دیکھیے۔ طرح طرح کی رنگ برنگی گولیاں۔ کیپسول۔ شربت۔ جو دوا آج ہے کل نہیں ہے، جو کل ہے پر مومن نہیں ہے۔“

”ہاں بے شک سائنس کی ترقی کے تو ہم بھی قائل ہیں کہ اینٹی بائیوٹک دوائیں بنا کر دس لاکھ کی جان بچاتے ہیں اور ایک بم پھینک کر بیس لاکھ کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور

دواؤں کا یہ حال ہے کہ جس طرح پہلے زمانے میں بعض مرض ایسے مرض ہوتے تھے، جن کی کوئی دوا نہ ہوتی تھی۔ اب سنا ہے ایسی دوائیں ہوتی ہیں، جن کے لیے کوئی مرض ابھی تک نہیں نکلا۔“

”جی یہ سب باتیں کیمپیشن کی ہیں۔ فرنی انٹرپرائز کی ہیں۔“
 ”خیر، یہ لمبی بحث ہے، خدا کرے یہ بیماریاں ختم ہوں اور کوئی شخص بیمار نہ ہو۔“
 ”ایں دعا ازمن داز جملہ جہاں آ میں باو۔“

”آپ نے چور کی وُحاشی ہے؟“
 ”چور کی وُحا؟ راجہ مہدی علی خان کی نظم جس میں چور دست بدعا ہے کہ ”بندے پہ تیرے دقت عجب آن پڑا ہے یا مولا گئے کو سلاوے، چوکیدار کو بے ہوش کر دے، درد ازے کی گندمی کھول دے۔“

”لیکن میں تو ڈاکٹروں کی بات کر رہا ہوں، آج ایک ڈاکٹر کے گھر سے گزر ہوا۔“
 ”کوئین پینے گیا ہوگا۔ یا ڈی ڈی ٹی کا پھنکا مارنے گیا ہوگا۔ ارے بڑا چٹورا ہے تو مچھر خان۔“

”آپ بات تو سنیے۔ ڈاکٹر..... کی بیٹی ثقاضا کر رہی تھی کہ ڈیڈی میرے کمرے میں الگ ٹیلی ویژن ہونا چاہیے، جس میں صابن تیل کے اشتہار دل جمعی سے دیکھ سکوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا اچھا بیٹے ملیں یا پھیل رہا ہے ایک نہیں دو لادوں گا۔ اب ان کی بی بی نے کہا کہ مجھے مرنے کا جزاؤ سیٹ چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب بولے انفلوئنزا کے لیے دھا کرو۔ اللہ سب کی سفا ہے، اب صاحبزادے بولے مجھے کار چاہیے ابا جی! سب ڈاکٹر دں کے بچوں کے پاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اچھا بیٹے۔ یہ تو رمضان ہی جس لے دوں گا۔ لوگ تھالیاں بھر بھر افطاری کھاتے ہیں، پھر پیٹ پکڑے دوڑے آتے ہیں۔“

ہم نے کہا ”دیکھو میاں پھر ایہ بحث ختم کرو۔ اس میں ڈاکٹروں کی فیسوں کا ذکر آئے گا۔ اور مریضوں کی غربتی کا ذکر آئے گا۔ جو دس پانچ روپے خرچ نہیں کر سکتے، میں کہوں گا علاج کا ذمہ حکومت لے، لوگ کہیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔“

”یہ سارے مسائل آپ کو مبارک ہوں! ہاں ڈاکٹر دل کا علاج البتہ ہو سکتا ہے، میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔“

”شاباش ہے ہمیں بھی دینا وہ کتاب۔ لیکن کل، اب بھاگ کہ ہمارے کالم کا وقت ہے، اور پھر ہمیں لکھ لینے جانا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”ارے دن یونٹ ٹوٹا ہے ناں، چراغ جلائیں گے اصلی گھی کے نہ سہی مامتا دالے کے سہی۔“

(دُخل در معقولات جنگ مورخہ 2/12/69)

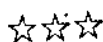


ہم دعوت نامہ لے کر گئے تھے

ایک زمانے میں ہمارے ملک کے ایک مشہور صوفی بزرگ نے ایک ”رُغن“ گیسو دراز“ ایجاد کیا تھا۔ جس کی تعریف یہ سنی تھی کہ ایک قطرہ اس کا ایک بلی پر گر گیا اور دیکھتے دیکھتے اس پر بالوں کی ایسی گٹھا چھائی کہ منہ سر چھپ گیا، اسی پر بس نہیں، پاس ہی بوٹ پالش کا برش پڑا تھا، چند چھینے اس پر بھی پڑ گئے۔ اس کے بال جو بڑھنے لگے تو چھت کی خبر لانے لگے۔ اس کو استعمال کرنے میں بڑی احتیاط لازم تھی۔ ایک آدھ بار کسی نے ہتھیلی سے سر میں مل لیا اور اس کے بعد ہر روز ہتھیلی کی شیو کرانا لازم ہو گیا۔ اس کے لگانے کے لیے ربڑ کے دمٹانے پہننے کی ہدایت تھی۔ بال اس پر بھی اُگ آتے تھے، لیکن اسے پھینکا جاسکتا تھا۔

بعض لوگوں کو شاید اس تعریف میں مبالغے کی بو آئے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی گولیاں ایجاد ہو چکی ہیں، جن کے کھانے سے قد لمبا ہو سکتا ہے، اور ایسے رُغن نکل آئے ہیں جن کے استعمال سے رنگ گورا اور بال کالے ہو جاتے ہیں۔ تو قطعاً تعجب کی گنجائش نہیں رہتی۔ بال گھٹکھریا لے بنانے والے تیل کا اشتہار ہم ایک مدت سے پڑھ رہے ہیں لیکن اب اخبار خواتین کے ایک مضمون سے پتا چلا کہ فیشن بدل رہا ہے۔ اب خواتین نے بالوں کے بل نکالنے اور ان کو تھکے کی طرح سیدھا کرنے کے لیے

بالوں پر استری کرانا شروع کرادیا ہے۔ یہ فیشن چلا تو دلالت سے تھا، لیکن اب یہاں بھی آگیا ہے، کل جو ہم اپنا سوٹ استری کرنے کے لیے تاج پنجاب اپ ٹوڈیٹ لانڈری رجسٹرڈ میں گئے، تو ماسٹر اللہ دتہ نے کہا کہ جناب آپ کے سوٹ کی باری کل آئے گی۔ آپ دیکھتے ہیں کتنی خواتین انتظار کر رہی ہیں، پہلے ان کے بالوں پر استری کر لوں، گویا ہمارے دیکھتے دیکھتے دھویوں کی چاندی ہو گئی اور ہیمز ڈریسر حضرات کا کاروبار چوہٹ ہوا۔ خیر امید کی جاتی ہے کہ اب لانڈریوں کا کاروبار اتنا بڑھے گا کہ ان صاحبوں کی اس میں کھیت ہو جائے گی۔ جہاں آپ نے گھر آ کر پوچھا کہ بیگم کہاں گئی ہیں۔ بچوں نے بتایا کہ ذرا لانڈری تک گئی ہیں ابھی آتی ہیں۔



ہیمز ڈریسروں کے روزگار پر فقط دھویوں کی طرف سے چوٹ نہیں پڑی، مالیوں کی طرف سے بھی پڑی ہے۔ کل ایک صاحبزادے ملے آئے جن کے بالوں کی اوپری سطح ایسی میدانی اور مسطح تھی کہ اس پر غالیچہ بچھا..... کر بیٹھ کر حقہ پینے کو جی چاہتا تھا۔ ہم نے پوچھا تو نہیں لیکن ظاہر ہے وہ اپنے بالوں پر لان کی گھاس کاٹنے والی مشین چلو کر آئے تھے۔ بعض لوگ سر کو اُسترے سے صفا چٹ کر وانا بھی پسند کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ پھر گھر میں آئینہ رکھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اس پر ذرا سا تیل لگایا، اور جس نے چاہا جب ذرا گردن جھکائی اور (اپنی صورت) دیکھ لی۔ ایک صاحب نے یہ رجحان دیکھ کر صفا چٹ ہیمز آئل کے نام سے اپنے تیل کا اشتہار دینا شروع کر دیا اور وہ خوب چل نکلا ہے، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا یہ دہی تیل ہے جس سے جناب مشہر گنجوں کے سر پر شرطیہ بال اُگانے کی گارنٹی دیا کرتے تھے۔ چونکہ اشتہار کی عبارت میں ضروری تبدیلی کر دی گئی ہے، اس لیے نسخے میں تبدیلی کی قطعاً حاجت نہیں رہی، بات یہ ہے کہ دواؤں کا اتنا سارا اسٹاک کون ضائع کرے، عبارت بدلنا اس سے کہیں

زیادہ سہل اور کم خرچ ہے۔ ترکیب استعمال کو الیہ مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ وہ یوں کہ اگر کسی کو مالش کے لیے اُس کی یوناگو اور محسوس ہو تو اس کے دو تھپچھپ ہمار منہ پی لے۔ اثر یکساں ہوگا۔ کیا اثر ہوگا اس کی اشتہار میں پوری طرح وضاحت نہیں کی گئی ہے۔



ہمارے قصبوں کے پرانے ڈاکٹر بڑے جامع العلوم ہوتے تھے دانت کے ورو سے لے کر امراض چشم، امراض معدہ، امراض ناک، کان، گلا، (اضافت کے لیے معاف فرمائیے) حتیٰ کہ تپ دق اور کتے کے کالے کا علاج بھی خود ہی کر لیا کرتے تھے شہروں کی طرح نہیں کہ ہر ڈاکٹر کا علم بس اپنے شعبے تک محدود ہے۔ ہمیں کھانسی تھی اور معمولی تھی، لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر اظہر ماہر امراض چشم نے بھی دیکھتے ہی سر ہلادیا کہ کھانسی کے ماہر کے پاس چاؤ، عینک، لگوانی تھی تو ڈاکٹر سردر ماہر امراض معدہ ہماری کوئی مدد نہ کر سکے۔ پچھلے دنوں ہمارے گھنے پر چوٹ آئی تو ہم قریب ترین دندان ساز کے پاس گئے، اس نے دیکھتے ہی دانت نکال دیے کہ میں تو گھنے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ ہاں کہو تو تمہاری بیٹی کھڑے کھڑے نکال دوں۔ اور تو اور شہر میں ہم نے مویشیوں اور آدمیوں کے جدا جدا ڈاکٹر دیکھے، دیہات میں ایسا کوئی امتیاز نہیں بکری بیمار ہو تو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جاؤ، خود کو لیریا ہو جائے تو سلوتری صاحب کے پاس چلے جاؤ، شہروں والے تو ہر بات میں باریکی دکھاتے ہیں۔ مین میکھ نکالتے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹروں کو نہ سہی، دو اساز دل کو اس بات کا احساس ہوا کہ امراض کتنے بھی ہوں ان کے لیے الگ الگ دوائیں بنانا خواہ پریشان مریضوں کو اور پریشان کرنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں جب کبھی کچر اور پڑیاں اور گولیاں دی گئی ہیں کہ یہ فلاں دقت پیڑیہ اتنے گھنے بعد پھا نکو اور گولی اس کے دس منٹ بعد نگو تو ہمارا سارا حساب گڑبڑ ہو گیا۔ اور ہم یہ موقع ان جب دواؤں کو ایک ہی وقت معدے یا نالی میں ڈالتے

رہے خیر ہم نے اوپر ایک دوا کا ذکر کیا ہے جسے گنبے لگائیں تو دو دن میں یہ ماجرا ہو کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو جائے۔ اور بالوں والے لگائیں تو آئینہ دکھائیں۔ ایک اور دوا ہمارے ایک کرم فرمانے لکائی ہے جو لیریا، تپ دق، تپ محرقہ سب کے لیے اکسیر ہے۔ آنکھ میں ڈالنے سے عینک چھوٹ جاتی ہے اور دانتوں پر لگائی جائے تو نئے دانت آ جاتے ہیں ایک صاحب اس کی یوں توجیہ کرتے ہیں کہ بیٹائی جاتی رہے تو عینک کی کہاں حاجت رہ جاتی ہے اور جب دانت ہی جھڑ جائیں تو دندان ساز کے ہاں سے نئے دانت کیوں نہ آئیں گے۔ خیر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ یہ قبض کو دور کرتی ہے اور اسہال میں مفید ہے۔

جوڑوں کا درد، کان کا درد، ڈاؤ جنبل، پھوٹے، بچکی آنے، یرقان، بانجھ پن اور دماغی کمزوری کا یہ حتمی علاج ہے۔ اس کی ہمہ گیر افادیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ چار پائی پر چھڑکی جائے تو کھٹل فوراً مر جاتے ہیں۔ ہاں کوئی بڑا جانور ہو مثلاً آدمی تو اسے متواتر کئی خوراکیں دینی پڑیں گی تب ہی کما حقہ اثر دکھائے گی۔



خاتون نے اپنی ڈائری میں ذکر کیا ہے کہ دو کسی ڈاکٹر کے پاس گئیں ان سے دوائی لی اور باہر آ کر نالی میں پھینک دی گھر پہنچنے تک وصحت یاب ہو چکی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ڈاکٹروں کی دوائیں ایسی ہی سرلیج الاثر ہوتی ہیں۔ ہم نے خود ہمیشہ یہی کیا اور عموماً دو تین خوراکیں نالی میں پھینکنے سے کلی طور پر صحت یاب ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے مطبوں کے باہر بڑی بڑی نالیاں اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں لیکن بعضے نوہشت مریض پھینکنے کے بجائے دوا گھر لے جاتے ہیں اور اسے پی لیتے ہیں۔ اور پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ انجکشنوں کے تو ہم اور بھی زیادہ قائل ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ ایک انجکشن لگا اور چہرے پر خون کی لہر دوڑ گئی۔ مریض کے چہرے پر نہیں ڈاکٹر

کے چہرے پر۔ پھر یہ ایسی چیز ہے کہ مریض ہونہ ہوا انجکشن ہر حال میں فائدہ کرتا ہے۔ مریض کو نہیں ڈاکٹر کو۔ ابھی اس اتوار کو جب ہم نے اپنی نئی غزلیں سنانے کے لیے اپنے گھر پر مشاعرہ کیا (کوئی اور اس کا اہتمام کرنے پر راضی نہ ہوا) تو ہم دعوت نامہ لے کر اپنے پڑوسی ڈاکٹر زبیری کے ہاں بھی گئے دو اس وقت مصروف تھے لہذا ہم بھی ایک بیچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ یکا یک کسی نے ہماری آستین اٹھائی اور ہم نے سوئی کو تپ دیکھا جب دو ہمارے گوشت میں سے نکل رہی تھی۔ ہم نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب میں تو دعوت نامہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ شام کو تشریف لائے“ ماہر تباہ فرمائیے اور تازہ کلام سنئے۔۔۔“ بولے ”ضرور حاضر ہوں گا“ لیکن اس انجکشن کے تین روپے کمپونڈر کو دیتے جائیے گا اور خوراک میں کھٹی چیزوں بڑے گوشت اور چاولوں سے پرہیز لازم ہے۔ یکل اسی وقت پھر آئیے گا اور مکچر کے لیے خالی شیشی ساتھ لائیے گا۔“



میر صاحب سے آغا صاحب تک

میر حسن اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ وجہ شہرت ان کی مثنوی سحرالبیان ہے عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہے۔ باقی جو کچھ لکھا ہے وہ محققین کے کام کا ہے کہ اس پر مقالے لکھیں اور ڈگریاں میٹیں۔ پچھلے دنوں پشاور کے قصہ خوانی بازار سے گزرتے ہوئے کچھ پرانی خستہ و خراب کتابیں نظر آئیں۔ انہی میں ایک تھی غزلیات حسن۔ اب پتا نہیں روپیہ دیا تھا یا ڈیڑھ روپیہ۔ بہر حال زر کثیر خرچ کر کے ہم نے اسے حاصل کر لیا۔ کیونکہ ٹائیکل پر غیر مطبوعہ لکھا تھا۔ خیر جس زمانے میں یہ کتاب چھپی ہے۔ اتنی زیادہ پرانی بھی نہیں۔ ۱۹۳۷ء میں یہ غیر مطبوعہ ہی ہوں گی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہر چند دیباچہ نگار نے ان غزلوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ دیباچہ نگار کا تو یہ فرض منصبی ہوتا ہے لیکن یہ تبرک ہیں۔ دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میر حسن کا بہت سارا کلام گھر میں آگ لگنے سے نذر آتش بھی ہو گیا تھا۔ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے۔

اس نادر مجموعے میں سے سنا تو آپ کو ایک غزل ہے جس سے معلوم ہو کہ ای جی کے زمانے میں ہمارے بزرگ کس قسم کی غزلیں اور کس قسم کا کلام کہا کرتے تھے۔ تاہم کچھ متفرق اشعار بھی سن لیجیے۔ ترتیب اس مجموعے کی ردیف وار ہے۔ یعنی آخری حرف (الف) ہے تو پہلا اور آخری حرف (ی) ہے۔ تو آخر میں پیناںچہ الف کی تختی کی

پہلی غزل یہ ہے۔

کبھی زلفوں سے ہے اس کی کبھی گیسو سے مٹھ بھیڑا
مرے دل کے لیے رہتا ہے! الجھیڑے پہ الجھیڑا

☆☆

ایک شعر سے معلوم ہوا کہ کھیزا کا لفظ جو پنجابی میں گاؤں یا بستی کے معنی میں آتا ہے
اور دارث شاہ کے ہاں بہت آیا ہے۔ اس زمانے میں اردو میں بھی تھا۔

اسی دل میں ہے عیش و غم، اسی میں شادی و ماتم
سہانی سی یہی بستی ہے اجڑا سا یہی کھیزا
ہائے کتنا اچھا لفظ تھا جسے اردو والوں نے مترک کر دیا۔ ایک اور شعر سنئے۔

عجب پیدا کیے ہیں یار تم نے اپنی صحبت کے
کوئی لنگڑا کوئی لولا کوئی کانا کوئی ڈھیرا

☆☆

بچ بچ سے کچھ اور نمونے کلام بلاغت نظام کے دیکھیے کیسی کیسی رونقیں ڈھونڈتے
تھے۔ کس کس طرح کی مشق اپنے آپ سے لیتے تھے۔

عہ میں جوہن کے جوہے وہ ہٹ بے باک پڑھا
گل بھی لیتا ہے تو ہاتھوں سے مرے ناک پڑھا

☆☆

کبھی یہ تھا کہ ہم کو دیکھتا تھا تند خو چھپ چھپ
ادا کرتا تھا خاموشی میں کیا کیا گفتگو چھپ چھپ

☆☆

جس طرح سے شرر کے لیے سنگ ہے وسیع
جلوے کو تیرے مرا دل تنگ ہے وسیع

قافیوں کی سنگلاخی دیکھیے۔

نہ مینا ہے نہ مے ہے سب یہ اے ساتی تکلف ہے
اسی کی ذات اک باقی ہے اور باقی تکلف ہے
نہ آتے ہو نہ ملتے ہو نہ ہنتے ہو نہ کھلتے ہو
تکلف برطرف آگے بد اخلاقی تکلف ہے
شرر ریزی تو پلکوں کی اس اشک گرم سے دیکھو
رکھے ہے کون یہ بندوق چھماتی تکلف ہے

اہ راب وہ غزل پہلو دار

میں کہا مجھ سے ملا کر تو لگا کہنے اونہوں
پھر کہا کچھ تو دفا کر تو لگا کہنے اونہوں
میں کہا مہر نہیں تجھ میں تو وہ بولا کہ بدوں
بسب کہا رم کیا کر تو لگا کہنے اونہوں
سب سے ملتا ہی تھا وہ عید کے دن میں بھی گیا
مجھ سے بھی نک تو مل آ کر تو لگا کہنے اونہوں
میں کہا تجھ سے نہ بولوں تو لگا کہنے کہ ہوں
بیضا بسب منہ میں بنا کر تو لگا کہنے اونہوں
جب کہا میں کہ اونہوں ہی یہ رہے یا ہوں ہی
کچھ تو قصہ یہ ادا کر تو کہنے لگا اونہوں
میں حسن سے جو کہا اس کی تو باتیں ہیں یہی
مل نہ اب اس سے تو جا کر تو لگا کہنے اونہوں

اگلے وقتوں کے لوگ اس قسم کا کلام کہا کرتے تھے اور اگلے وقتوں کے لوگ اس کو پسند بھی

کرتے تھے۔ لیکن پچھلے دنوں ایک بزرگ کا کلام نظر پڑا۔۔۔ جو اس زمانے کے ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔ لکھنؤ کی موٹی موٹی مٹی کی نشانی ہیں۔ ان کی کتاب دس بارہ سال ادھر جوش ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی مرحوم اور بہن ادا لکھنوی مرحوم کے تحسینی دیباچوں کے ساتھ چھپی تھی۔ فرماتے تھے۔

بتادوں کسے کہتے ہیں زندگانی
 جوانی جوانی جوانی جوانی
 بتادوں ابھی تم کو کیا ہے بڑھاپا
 کہانی کہانی کہانی کہانی
 بتادوں ان آنکھوں پہ کیا ہے طلائی
 کمائی کمائی کمائی کمائی
 بتادوں تمہیں ان کے وعدے ہیں کیسے
 زبانی زبانی زبانی زبانی
 بتادوں نہیں ان کی کیا شے مرے پاس
 نشانی نشانی نشانی نشانی
 بتادوں کہ سے تیز ترکوں سی ہے
 پرانی پرانی پرانی پرانی
 بتادوں غریبوں کو کھلتی ہے کیا شے
 گرانی گرانی گرانی گرانی
 بتادوں مذہب ہے جو سب سے بہتر
 قرآنی قرآنی قرآنی قرآنی

کیا جامع غزل ہے جس میں عاشقی بھی آگئی ہے۔ اسلام بھی آگیا ہے۔ سوشلزم

بھی۔ جانے فی زمانہ اس شعر کی قدر کیوں نہیں۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اسی رنگ میں۔

نیشلی نگاہیں قدم لڑکھڑائے
 وہ آئے وہ آئے وہ آئے وہ آئے
 جوانی کی آنکھوں میں صہبا کے ڈورے
 وہ ہائے رے ہائے رے ہائے رے ہائے
 بہ مشکل انہیں میں نے افسانے دل کے
 سنائے سنائے سنائے سنائے
 نہ آنے کے اس شوخ نے سوہانے
 بنائے بنائے بنائے بنائے
 دو مائیں نہ لیکن رقیبوں کے ہیں تو
 پڑھائے پڑھائے پڑھائے پڑھائے
 سفر میں برابر رہی فکر دل کو
 گھر آئے گھر آئے گھر آئے گھر آئے
 چنے میں نے چاہت میں لوہے کے آغا
 چبائے چبائے چبائے چبائے

ظاہر ہے کہ جو شخص خود چنے چبائے گا دوسروں کو بھی چبوائے گا۔ ایک نظم ہے بہ عنوان شیخ دیرہمن دیکھیے کیسے کیسے قافیوں کو کس خوبصورتی سے باندھا ہے۔

سورگ سے میں جس دم نکلا گیا ہوں
 بہت اپنے جی میں اُداسا گیا ہوں
 جو کعبہ گیا ہوں تو احرام باندھے

میں مسجد میں باندھے منڈا سا گیا ہوں
 سنا ہے جو نانا بنارس گئے ہیں
 تو میں پیچھے پیچھے نواسا گیا ہوں
 میں ڈھولک لیے ساتھ قوال بن کر
 عرس میں شرکت کو بانسا گیا ہوں
 طبیعت جو میری رہی سیدھی سادی
 تو بس کھا کے جھانسون میں جھانسا گیا ہوں
 میں ہر بار اپنے کو خود دفن کرنے
 رکھے روش پر اک گڑانا گیا ہوں
 جہاں سینکڑوں مجھ سے پہلے گڑے تھے
 اسی قبر میں لا کے ٹھانا گیا ہوں
 سمجھ میں آئے تو آغا سمجھ لو
 میں ہستی کا کرتا خلاصہ گیا ہوں
 اور آغا صاحب کے اس خلاصے کے ساتھ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔



قصہ ایک بہت بولنے والے کچھوے کا

یہ قصہ ہے ایک کچھوے کا، بہت بولنے والے کچھوے کا جو بحر ہند میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر رہتا تھا۔ چونکہ بہت بولنے والے بے موقع بولنے والے، خواہ مخواہ بولنے والے کچھوے کسی بھی ملک میں ہو سکتے ہیں، اس لیے یہ کہانی غور سے سنائی جائے بچوں کو بھی۔ ان کو بھی جو اپنے کو بچہ نہیں سمجھتے۔

ہر چند کہ یہ کچھوہ جواں عمر ہی تھا، بھی مشکل سے اس نے اپنی زندگی کے پہلے سو سال پورے کیے تھے۔ لیکن بڑھوں کی طرح بک جھک کی عادت اسے ہو گئی تھی۔ اور سر پر اپنی عظمت کا سودا سوار ہو گیا تھا۔ سبھی ملنے جلنے والوں کی جان اس سے زچ تھی۔ سب سے زیادہ اس کی بیوی کی۔ آخر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ نیک بخت فلاں دلدل کے پاس ایک سیانا لم ڈھینگ کھڑا ہے، بہت وانش مند ہے، اس سے جا کر اپنے میاں کی اصلاح کا نسخہ پوچھ۔



لم ڈھینگ نے اس بی بی کی بات گمبھرتا سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بی بی کا کہنا تھا کہ میاں کے سر پر کوئی آسب سوار ہو گیا ہے۔ اس کو یہ ٹاپو بہت چھوٹا نظر آنے لگا ہے۔ پدرم سلطان بود کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ اس کے کسی پڑکھے نے کسی خرگوش کو

دوڑنے میں رک دی ہوگی۔ یہ بھی کسی خرگوش کے ساتھ دوڑنے لگا اور اسے ہرانا چاہتا ہے۔

”کچھوا اور خرگوش کو رک؟“

”اجی آپ نے وہ حکایت لقمان نہیں پڑھی کیا؟ اس میں یہ قصہ ہے۔ یہ اسی اللہ ماری کتاب کو پڑھتا اور چاٹتا رہتا ہے۔“

”اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔ لیکن بی بی وہ تو جانے کون جگ کی بات ہے اور لقمان کے قصے تو پھر لقمان کے قصے ہیں۔ ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آئے تو۔“ کچھون نے روٹکھی ہو کر کہا۔

لم ڈھینگ نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ کتابیں پڑھ کر تمہارے میاں کا مغز الٹ گیا ہے، خیر دیکھو۔ کوئی علاج سوچتے ہیں۔ کوئی نسخہ نکالتے ہیں۔“

یہ کہہ کر لم ڈھینگ نے اپنی چونچ کو اپنے پروں میں لے لیا، اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ جو اشارہ تھا اس بات کا کہ انٹرویو ختم۔ اب تخیل۔ چنانچہ کچھون اپنے گھر چلی گئی۔ صاحبو! ابھی لم ڈھینگ منقار زیر پر ہوا بنی تھا اور اس نے پوٹا بند کیا ہی تھا کہ اسے کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے آنکھ کے کونے سے دیکھا کہ وہی جھکی کچھوا ہے اور اسی سے مخاطب ہے۔

”اے میاں لم ڈھینگ ایک ٹانگ پر کیوں کھڑے ہو۔ اماں تھک جاؤ گے۔ اور یہ گروں کیوں پروں میں اڑس رکھی ہے۔ دم گھٹ جائے گا۔ ذرا باہر نکالو تو اپنی چونچ۔“

لم ڈھینگ نے اپنی گردن میدھی کی۔ اور اپنی دوسری ٹانگ زمین پر ٹکائی اور کہا ”حکم؟“

کچھو۔ نے کہا۔ ”حکم کی کیا بات ہے باتیں کرو۔ ادھر ادھر کی سناؤ بڑے میاں۔“

لم ڈھینگ نے کہا۔ ”ابھی تمہاری بی بی آئی تھیں۔“

کچھوے نے کہا۔ ”اچھا؟ ارے میں تو اسے کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ کسی بیانیے کے پاس جادو اسے تو چپ لگی ہے، جانے کیا ہو گیا ہے۔ بولتی ہی نہیں۔ کوئی نفسیاتی ناراضہ ہے۔ شاید۔ اس ناپو پر تو نفسیاتی علاج کا بندوبست بھی نہیں ہے۔“

کچھوے نے کوئی آدھ گھنٹے اس مسئلے پر تقریر کی کہ اس کی بیوی نارمل نہیں ہے اس کو کچھ ہو گیا ہے۔ کوئی کمپلیکس ہے جو چپ لگی ہے۔ اس کے لاشعور میں کوئی گزربڑ ہے۔ وغیرہ۔ اس آدھ گھنٹے میں وہ ایک لمحے کو بھی نہ رکا۔ لم ڈھینگ بے چارا ہونکا را بھرتا رہا۔ کچھ اپنی بیوی کی شکایات کا دفتر مکمل کر کے بعض ہمسایوں کے بارے میں رطب اللسان ہونے کو تھا کہ لم ڈھینگ نے موقع پا کر کہا۔

”یہ خرگوش کے ساتھ دوڑ لگانے کا کیا قصہ ہے حضرت۔“

کچھوے نے کہا۔ ”ہوں یہ بات میری بی بی نے کہی ہوگی۔ عورت ذات کو باتیں بنانے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے، ہاں میں کہتا ہوں خرگوش کیا چیز ہے جو میرے سامنے آئے مجھ سے دوڑ لگائے ایک بار مڈ بھڑ ہو تو۔“

لم ڈھینگ نے کہا۔ ”یہ ہو تو کیسے ہو۔ اس ناپو پر تو کوئی خرگوش ہے نہیں۔“

کچھوے نے کہا۔ ”رونا تو اسی بات کا ہے میں سوچتا ہوں۔ تیر کرسمندر پار کہیں۔ افریقہ یا ہندوستان جاؤں۔ اس چھوٹے سے ناپو پر تو میری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ ہے نا؟“

اسے اس ہے نا؟ کا جواب نہ ملا۔ کیونکہ اسی دوران میں لم ڈھینگ نے اپنی ایک ٹانگ پھراٹھائی تھی۔ اور اپنی گردن کی کنڈلی ہمالی تھی۔ کچھوے نے ایک دوبار لٹکا را پھر چلا گیا۔



اگلے روز کچھون پھر لم ڈھینگ کے پاس کئی جو اپنی دونوں ٹانگیں مضبوطی سے زمین

پر جمائے اس کا منتظر تھا۔ لم ڈھینگ نے کہا....

”اے خاتون! کل تو نے لقمان کا ذکر کیا تھا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو مہاتما بدھ سے منسوب ہے اس میں ایک حل بتایا گیا ہے۔“

”کیا اس سے میرے میاں کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا؟“ کچھون نے بے صبری سے کہا۔

”ہاں۔ اس سے یا تو مرض نہیں رہے گا یا مریض نہیں رہے گا۔ ایک بات تو بہر حال ہوگی۔“ یہ کہہ کر لم ڈھینگ اپنے بے ڈل پر پھڑپھڑاتا اڑ گیا اور ایک سارس سے جا ملا۔ اور پھر یہ دونوں بزرگ اسی چٹان پر جا اترے میاں کچھوے میاں الکسا رہے تھے۔

”لو بھی تمہارے دل کی مراد پوری ہوئی جا رہی ہے میں اور سارس تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں کوئی خرگوش ہو تاکہ تم اس سے دودھ لکا سکو اور اپنی حسرت نکال سکو۔“

”یہ تو مزے آگئے۔“ کچھوے نے خوش ہو کر کہا۔ ”لیکن تم مجھے لے جاؤ گے کیسے؟“

”یہ کچھ مشکل نہیں البتہ تمہیں تھوڑی دیر کو چپ رہنا ہوگا۔ اپنی غرور کو بند رکھنا ہوگا۔ چپ رہ لو گے کیا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“ کچھوے نے کہا۔ ”رہ لیں گے۔ چپ بھی۔“



لم ڈھینگ کسی درخت کی ٹہنی ڈھونڈ کر لایا۔ اور کچھوے سے کہا۔ ”لو اس کو مضبوطی سے اپنے دانتوں میں تھام لو۔“ کچھوے نے اس پر دانت جمائے۔ ایک طرف سے لم ڈھینگ نے اسے اپنی چونچ میں تھاما دوسری طرف سے سارس نے اور اسے لے

اڑے۔

چند گھنٹے کی اڑان کے بعد یہ لوگ کسی ساحل پر... آن اترے، کچھ بچوں نے دیکھا تو تالیاں بجائیں۔ ”واہ جی واہ! اچھا تماشا ہے۔ دو پرندے ایک کچھوے کو لیے اڑے جارہے ہیں۔“

کچھوے سے ضبط نہ ہو سکا۔ منہ کھول کر بولا۔

”ارے چپ رہو شیطان کے بچو۔“

شہنی اس کے منہ سے نکل گئی۔ اور کچھوے نے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے زمین کا رخ کیا۔

لم ڈھینگ نے چیچ چیچ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نسخہ تو ناکام ہو گیا۔ مرض کے بجائے مریض چلا گیا۔ نیچے پتھر ملی زمین ہے، ابھی اس کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ کھوپڑی چیخ جائے گی۔“



وہ بے چارے تو افسوس کرتے ہوئے لوٹ گئے۔ اب کچھوے کا ماجرا سنو۔ کچھوہ زمین کے بجائے ایک نرم جھاڑی پر گرا۔ اور وہاں سے لڑھکتا ہوا... غراپ سے پانی کے اندر۔

یہ ایک اس کے کان میں آواز آئی، خوش آمدید۔ جی آیاں نوں۔ شاہی شور بے کے جوہڑ میں آمد مبارک ہو۔ ”یہ کسی مینڈک کی آواز تھی۔“

”کیا کہا؟ کیا بکواس کی تم نے، کیا جوہڑ؟“ کچھوے نے ڈانٹ پلائی۔

”شور بے کا جوہڑ۔“ مینڈک ٹرایا۔ ”اس ملک کے بادشاہ کو طرح طرح کے شور بوں کا شوق ہے، اس کے خاندانوں نے یہ جوہڑ بنا رکھا ہے، اس میں سب طرح کے جانور ہیں۔ صبح کو خاندان آتا ہے اور جال ڈالتا ہے، لیکن تم کو ڈرنے کی کوئی بات

نہیں۔ اس وقت ایک کونے میں وبک جاؤ۔ میں بھی تو کئی برس سے یہ ترکیب کیے پڑا ہوں۔ گھڑی بھر کو دم ساوہ لیتا ہوں اور مزے کرتا ہوں، تین وقت کھانا ملتا ہے اس جو ہڑ میں جانوروں کو۔“

☆☆

کچھو منہ سے تو کچھ نہ بولا اور جی ہی جی میں کہا۔

”پچھلی بار تو جان ہی چلی گئی تھی۔ اب کے نہیں بولوں گا۔“

اگلی صبح خانساں بہادر جو ہڑ پر آئے اور اپنا جال پھینکا کچھوے میاں ایک کونے میں وبک رہے۔

خانساں بہادر بڑبڑا رہے تھے ”بادشاہ نے تو کچھوے کے شوربے کی فرمائش کی ہے، لیکن کچھو کہاں سے لاؤں۔ بام مچھلی مل جائے تو اس کا شوربہ بنا لوں، وہ بھی اچھا ہوتا ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کچھوے کے شوربے سے ہزار گنا زیادہ لذیذ ہوتا ہے، بادشاہ ایک بار پی لے گا تو کچھوے کا نام بھی نہ لے گا۔“

کچھوے سے ضبط نہ ہو سکا، کمین گاہ سے نکل آیا اور بولا۔ ”وماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ ساری دنیا کا سب سے اچھا شوربہ۔۔۔“

☆☆☆

کچھ انڈوں کی طرف واری میں

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرغیہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہیے۔ ملت بیضا کا ایک فرد جاننا چاہیے۔ ہمارا عقیدہ اس بات میں یہ ہے کہ اگر آدمی تھانے دار یا مولوی یعنی فقیہ شہر ہو تو اس کے لیے مرغی پہلے اور ہم ایسا غریب شہر ہو تو اس کے لیے انڈا پہلے اور غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا اس کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی بقا کو ان چیزوں سے پہلے جاننا چاہیے مقدم رکھنا چاہیے۔



ایک زمانے میں ہمارا دھیان کبھی کبھی مرغی کی طرف بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے بکری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی بکری کے دام پانے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاء و دستیاب ہونے لگا ہے ہمارے لئے انڈا ہی مرغی ہے۔ ہم وحدت الوجود کی منزل میں آگئے ہیں۔ انڈا یوں بھی بڑی خوبیوں کی چیز ہے۔ اس میں سفیدی ہوتی ہے۔ اس میں زردی ہوتی ہے۔ اس میں چونا ہوتا ہے۔ اس میں پروٹین

ہوتی ہے۔ اسے دانہ نہیں ڈالنا پڑتا۔ یہ بیٹ نہیں کرتا۔ بلیاں اس کی جان کی خواہاں نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے ڈر با نہیں بنوانا پڑتا۔ اس کے خول پر رنگ کر کے اسے گھر میں سجا سکتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ گند ضرور نکل جاتا ہے۔ سوائے آسانی سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینکا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب نئی تہذیب کے کسی گندے انڈے کو دیکھتے تھے۔ یہی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ پرانی تہذیب کے گندے انڈوں کے متعلق انہوں نے اپنے کلام میں کوئی واضح ہدایات نہیں چھوڑیں۔ اس لیے ان کے عقیدت مندان کو سنبھال سنبھال کر رکھے جا رہے ہیں۔



اقبال کے ایک شارح نے تو اس شعر کی مدد سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر بھی پورا مقالہ لکھ دیا ہے۔ آج کل دستور یہی ہے کہ غالب کی زندگی معلوم کرنی ہے۔ تو اس کے دیوان سے اخذ کرو کہ وہ شہر میں بے آبرو پھرا کرتے تھے۔ دھول دھپا اور پیش دستی کیا کرتے تھے۔ در کعبہ سے الٹے پھر آیا کرتے تھے۔ سیدھے نہیں۔ اور مرنے کے بعد بھی بولا کرتے تھے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
وغیرہ غیرہ۔ ان صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ایک روز بازار سے نئی تہذیب کے کچھ انڈے لے کر آئے۔ ان کی بیوی آلیٹ بنانے بیٹھیں تو انہیں دوسرا مصرع پڑھنا پڑا۔

ع نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اس پر علامہ موصوف نے ترکی بہ ترکی یعنی مصرع بہ مصرع ہدایت کی کہ ان کو۔
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں



یہ تحقیق یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ اتنی سی بات کو ہر عا ی بھی سمجھ سکتا ہے۔ شارح موصوف کا کہنا ہے کہ شاعر کا گھر کسی گلی میں تھا۔ یہ شعر لا زمان دنوں کا ہے۔ مب علامہ مرحوم نے میور وڈ پر ابھی اپنی کوٹھی نہیں بنائی تھی۔ ورنہ وہ یہ فرماتے کہ اٹھا کر پھینک دو باہر سڑک پر۔ جناب محقق نے علامہ اقبال کی زبان میں نقص بھی دریافت کیا ہے کہ باہر کا لفظ زاید ہے کیونکہ گلی گھر کے اندر نہیں ہوتی۔ مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر معاملے میں خوا مخواہ اپنی رائے دینے کی عادت تھی ورنہ گندے انڈے کو گلی میں پھینکنے کا فیصلہ ان کی بی بی خود بھی کر سکتی تھیں۔



شارح موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال مرحوم کے ابتدائے جوانی کا ہے۔ جب انہیں پہلوانی اور کسرت اور کرب بازی سے دلچسپی تھی۔ وہ بھاری بھاری وزن کو اٹھا کر دو چار بار گردش دیتے تھے۔ پھر پھینکتے تھے۔ یہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لیے کہا ہے کہ اٹھا کر پھینک دو۔ صرف ”پھینک دو“ کہنا کافی نہیں سمجھا۔ معاملہ انڈوں ہی کا کیوں نہ تھا۔ ہمارے خیال میں اس شعر سے ابھی اور معنی نچوڑنے کی بھی گنجائش ہے۔ علامہ مرحوم کو اپنے باطن کی صفائی کی طرف زیادہ دھیان رہتا تھا۔ باہر کی صفائی کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی نہ فرماتے کہ انڈے سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا چاہیے تھا۔ باہر کسی بھلے آدمی کی اچکن پر گر جاتے تو بڑا فضاحتا ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو علامہ مرحوم کی ہر ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اپنی عقل کا دا جبی استعمال بھی کر لینا چاہیے۔ تھوری احتیاط بھی لازم ہے۔ ہر خوشہ گندم کو جلانے، مرم کی سلوں سے ناخوش و بیزار ہونے اس رزق سے موت اچھی ہونے اور گندے انڈے گلی میں اٹھا کر پھینک دینے کے متعلق اشعار اس کی محض چند مثالیں ہیں۔

آج انڈوں کی طرف رہ رہ کر ہمارا دھیان جانے کی کئی دہائیاں ہیں۔ ایک تو سردی دوسرے حکومت کا یہ اعلان کہ گوشت اور دودھ کی طرح انڈوں کی بھی قیمتیں مقرر کی جا رہی ہیں تاکہ مقررہ قیمتوں پر نہ ملیں۔ تیسرے شاد عارفی مرحوم کا ایک نادارہ کار شعر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ صیاد اور قفس اور نشیمن کے مضمون بہت شاعروں نے باندھے ہیں۔ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے بھی باندھے ہیں۔ خود علامہ اقبال مرحوم نے بھی ایک بلبل کی فریاد لکھی ہے۔ لیکن اس مضمون کے جملہ تعلقات پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ فرماتے ہیں شاد عارفی رام پوری۔

انہیں بھی ساتھ لیتا جا کہیں نکلیاں بنا لینا
ارے صیاد دو انڈے بھی رکھے ہیں نشیمن میں

☆☆

انڈے کا مضمون تو ختم ہوا لیکن اپنے دوست عنقا کے شکریے کے ساتھ شاد عارفی مرحوم کے چند اور اشعار۔

☆☆

تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

☆☆

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کے
وہ دن گئے کہ کسی بزمین پہ چوٹ کردں

☆☆

ستم گر کوئی چارہ گر کہہ رہا ہوں
غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

☆☆

آج ایک سبق جغرافیہ کا..... گلیلیو کی حرکت کو لمبس کی غلطی پنڈت جی کے آسن!

جغرافیہ میں سب سے پہلے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا گول ہے، ایک زمانے میں بے شک یہ چبٹی ہوتی تھی، پھر گول قرار پائی۔ گول ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ مشرق کی طرف سے جاتے ہیں، مغرب کی طرف جا نکلتے ہیں۔ کوئی ان کو پکڑ نہیں سکتا۔ اسمگلروں، بھرموں اور سیاست دانوں کے لیے بڑی آسانی ہو گئی۔

ہٹلر نے زمین کو دوبارہ چپنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

پرانے زمانے میں زمین گل محمد کی طرح ساکن بھی ہوتی تھی۔ سورج اور آسمان وغیرہ اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ شاعر کہتا ہے۔ ”رات دن گردش میں ہیں سات آسمان، پھر گلیلیو نامی ایک شخص آیا“ اور اس نے زمین کو سورج کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ پادری بہت ناراض ہوئے کہ یہ ہم کو کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ گلیلیو کو تو انہوں نے قرار واقعی سزاوے کر آئندہ اس قسم کی حرکات سے روک دیا، زمین کو البتہ نہیں روک سکے۔ برابر حرکت کیے جا رہی ہے۔

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے، لوگ خاصے امن چین کی زندگی بسر کرتے

تھے۔ پندرہویں صدی میں کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔ اس کے بارے میں دو نظریے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا قصور نہیں۔ یہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ غلطی سے امریکہ کو دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں کولمبس نے جان بوجھ کر حرکت کی یعنی امریکا دریافت کیا۔ بہر حال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی کولمبس تو مر گیا، اس کا خیا زہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

مشق

ذیل کے پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں وغیرہ پر مختصر نوٹ لکھو، کووندا، بحر مل، دریائے فصاحت، دشت جنوں، تنگنائے غزل، اب ایک دو ملکوں کا احول۔

پاکستان

حدود اربعہ: پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے، مغرب میں سنٹو۔ شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی یعنی جائے سفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پر ہیں، کتنے بڑے فاصلے پر ہیں اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے، ان کی سرحدیں حسب ذیل ہیں۔

مغربی پاکستان کے شمال میں پنجاب، اور جنوب میں سندھ، مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں۔ یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے، اور واقع ہے بھی کہ نہیں، اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔

پر جمائے اس کا منتظر تھا۔ لم ڈھینگ نے کہا۔۔۔

”اے خاتون! کل تو نے لقمان کا ذکر کیا تھا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی جو مہاتما بھگے منسوب ہے اس میں ایک حل بتایا گیا ہے۔“

”کیا اس سے میرے میاں کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا؟“ کچھون نے بے صبری سے کہا۔

”ہاں۔ اس سے یا تو مرض نہیں رہے گا یا مریض نہیں رہے گا۔ ایک بات تو بہر حال ہوگی۔“ یہ کہہ کر لم ڈھینگ اپنے بے ڈول پر پھڑپھڑاتا اڑ گیا اور ایک سارس سے جا ملا۔ اور پھر یہ دونوں بزرگ اسی چٹان پر جا اترے یہاں کچھون نے میاں الکسا رہے تھے۔

”لو بھی تمہارے دل کی مراد پوری ہوئی جا رہی ہے میں اور سارس تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں کوئی خرگوش ہو تاکہ تم اس سے دوڑ لگا سکو اور اپنی حسرت نکال سکو۔“

”یہ تو مزے آگئے۔“ کچھوے نے خوش ہو کر کہا۔ ”لیکن تم مجھے لے جاؤ گے کیسے؟“

”یہ کچھ مشکل نہیں، البتہ تمہیں تھوڑی دیر کو چپ رہنا ہوگا۔ اپنی نر کو بند رکھنا ہوگا۔ چپ رہ لو گے کیا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“ کچھوے نے کہا۔ ”رہ لیس گے۔ چپ بھی۔“



لم ڈھینگ کسی درخت کی ٹہنی ڈھونڈ کر لایا۔ اور کچھوے سے کہا۔ ”لو اس کو مضبوطی سے اپنے دانتوں میں تھام لو۔“ کچھوے نے اس پر دانت جمائے ایک طرف سے لم ڈھینگ نے اسے اپنی چونچ میں تھاما دوسری طرف سے سارس نے اور اسے لے

مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔

بھارت

یہ بھارت ہے۔ گاندھی جی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ان کو مہاتما کہتے تھے، چنانچہ مارکر ان کو یہیں دفن کر دیا اور سادھی بنادی، دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اگر گاندھی جی نہ مرتے، یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کے لیے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لیے بھی تھا۔ ہمیں قائد اعظم کا ممنون ہونا چاہیے کہ خود ہی مر گئے اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی، ورنہ شاید ہمیں بھی ان کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔ امن اور شانتی اور شیخ شیلاد وغیرہ کا اسے ایسا پاس ہے کہ کوئی زبردست آئے تو فوراً صلح کر لیتا ہے، کوئی کمزور ہو تو اور بات ہے۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔ اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا اشوکا ہوٹل یادگار ہیں، اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے، جو اشوک کی تمام یادگاروں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ راجہ نہرو بڑے دھرماتا آدمی تھے صبح سویرے اٹھ کر شیرشک آسن کرتے تھے یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے، رفتہ رفتہ ان کو ہر معاملے کو الٹا دیکھنے کی حادث ہو گئی۔ حیدرآباد کے مسئلہ کو انہوں نے رعایا کے نقطہ نظر سے دیکھا اور کشمیر کے مسئلہ کو راجا کے نقطہ نظر سے۔ یوگ میں طرح طرح کے آسن ہوتے ہیں۔ ناواقف لوگ ان کو

قلا بازیاں سمجھتے ہیں۔ نہرو جی نفاست پسند بھی تھے۔ ون میں دو بار اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

☆☆

بھارت ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں ہر مذہب کو آزادی ہے۔ کہ اپنے کو ہندومت میں مدغم کر دے۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے۔ بھارتی اسی کا دودھ پیتے ہیں۔ اسی کے گوبر سے چوکا لیتے ہیں اور اس کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں کیونکہ خود وہ گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔ آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا، فقط جانور گنا جاتا ہے۔

☆☆☆

اس کو چے میں

دنی کے سوداگروں کے ایک طبقے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جوتا بیچتے ہیں تو گاہک سے قسم کھاتے ہیں کہ اس میں ان کا منافع فقط آٹھ آنے ہے۔ یہ لوگ عموماً متشرع وضع کے ہوتے ہیں، اکثر حاجی بھی، نماز کا بھی بالعموم التزام، خلاف شرع تھوکتے بھی نہیں۔ پھر یہ آٹھ آنے کے معمولی منافع کا کاروبار کیسے چلتا ہے۔

وہ یوں کہ دکان دار نے موچی سے جوتا دس روپے میں خریدا۔ اس میں ایک روپیہ منافع لے کر اپنی بی بی کے ہاتھ بیچ دیا۔ بی بی نے ایک روپیہ نفع پر بیٹے کے ہاتھ بیچا۔ بیٹے نے بھی ایک روپے سے زیادہ نفع چارج کرنا پسند نہ کیا اور جوتا باپ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یعنی ہر پھر کے وہیں آ گیا۔ لیکن اب لاگت تیرہ روپے ہو چکی تھی۔ اب کیا لینے والا اس پر آٹھ آنے بھی نفع نہ لے۔ اب اسی کاروبار پر کہیں انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔ قسم بھی سونی صدی سچی۔ لیجیے احتیاط پسند صداقت شعار قسم کھاتے ہوئے اشارہ کر کے کہتے ہیں قسم ہے اس کتاب کی (جو جزوان میں لپٹی طاق میں رکھی ہوئی ہے) اب گاہک میں تو اتنا تجسس نہیں ہوتا کہ جزوان کھول کر اس میں سے مولوی عبد الحق کی ڈکٹری نکالے لہذا اگر قسم جھوٹی بھی ہے تو ڈکٹری کی ہے۔ اس سے کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔

اب کے عصمت میں بہلول قادری صاحب نے ایمان کی سوداگری کے عنوان سے خدا کے ساتھ بندوں کی ٹھگلی کرنے کی کچھ مثالیں دی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

”بہ ظاہر ہمارا رجحان مذہب کی طرف ہوتا ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں ہمیں یہ تلاش رہتی ہے کہ کہاں تک چیزیں جائز کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ایک ایرانی نے کہا ہے کہ آپ کے یہاں شراب کا استعمال بہت کم ہے حالانکہ یہ حرام نہیں صرف نجس ہے۔ اور نجس کوئی چیز منہ میں چلی جائے تو تین بار کلی کرنے سے منہ پاک ہو جاتا ہے۔

بعض بزرگ کہتے ہیں کہ جنت کے ساز و سامان اور انتظامات کی جھلکیاں تو دنیا میں بھی موجود ہیں مثلاً مودة الرحمن میں لکھا ہے کہ خیموں میں حوریں بیٹھی ہیں۔ اب اس منظر کی تلاش میں ہم دل میں نیک نیت لیے کراچی میں سینڈس پٹ ہاؤس بے کا چکر لگاتے ہیں تو وہاں خیمہ نما جھونپڑوں میں واقعی حور پیکر ہستیوں کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر ہمارا نفس اس کا قائل نہیں رہتا کہ نامحرم کو دیکھنا منع ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی نفس کو چھٹی دے کر آزاں چھوڑ دینے کے بارے میں بھی کتابوں میں لکھا ہے۔

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسان عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ مان لیجیے کہ حساب سے ساٹھ ہزار روپے ہوتے ہیں مگر یہ رقم تو بہت بڑی ہے۔ اور یہ کسی کو کیسے دے دی جائے۔ بہت موچنے کے بعد ایک تدبیر سوچھی ہے جو ناجائز معلوم نہیں ہوتی۔ آٹے سے بھری ہوئی ایک بوری منگائیے اور ساٹھ ہزار روپے کا نوٹ آٹے کے اندر چپکے سے دبا دیجیے۔ اب کسی غریب کو بلا کر کہیے کہ یہ ایک بوری آٹا زکوٰۃ گا ہے اسے لے جاؤ۔ اگر یہ بوری تمہارے لیے بھاری ہے اور تم میرے ہاتھ بچنا چاہو تو اس کی قیمت لے لو۔ ظاہر ہے وہ غریب روپے لینے

کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اس کو ایک بوری آنے کی قیمت دے کر رخصت کیجیے اور اپنے ساتھ ہزار روپے کے نوٹ نکال لیجیے۔ اس طریقے سے واجب الادا زکوٰۃ کا فریضہ بھی پورا ہو گیا اور روپے بھی بچ گئے۔ اگر کوئی کہے کہ اس غریب کو یہ بتایا نہیں گیا کہ آنے کے اندر ساتھ ہزار روپے چھپے ہیں تو ہم یہ کہہ کر بچ جائیں گے کہ اس غریب نے پوچھا ہی نہیں کہ آنے کے اندر کیا ہے ورنہ ہم بچ بچ ضرور بتا دیتے۔ اس معاملے میں کوئی گناہ سرزد ہوا بھی تو وہ گناہ صغیرہ ہی ہوگا۔

جب ہم کوئی بڑے افسر بن جاتے ہیں تو سارے محلے میں جتا دیتے ہیں کہ رشوت ہم بالکل نہیں لیتے۔ ہاں تحفے تحائف لینے میں کچھ حرج نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہنشاہ روم نے بہت قیمتی تحائف بھیجے تھے۔ انہوں نے لینے سے انکار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اتنے اعلا سرتب خلیفہ تھے کہ زندگی ہی میں ان کو جنتی ہونے کی بشارت ملی تھی۔ اگر انہوں نے شہنشاہ روم کے تحائف کا ذاتی استعمال نہیں کیا اور تمام چیزوں کو بیت المال میں جمع کر دیا تو یہ بات ان کے شایان شان تھی۔ ہم ان کی ریس کر سکتے ہیں؟ اور پھر یہاں کوئی بیت المال تو ہے نہیں اتنے سارے تحفوں کا سامان گھر میں نہ رکھیں تو کہاں رکھیں؟ کس کو دیں؟“



ایک سوالنامے کا جواب نامہ

آج ہمیں ایک بڑا ساجہازی سائز کا کارڈ ڈاک میں ملا ہے جس کے ایک طرف تو ہمارا پتہ لکھا ہے۔ مکرئی معظمیٰ وغیرہ القابات کے ساتھ دوسری طرف کارڈ چھاپے اور بھیجنے والے کا نام ہے۔

خدمت عوام پارٹی۔ (غیر سیاسی)

اس کے نیچے چند سوالات بھی درج ہیں۔

۱۔ کیا آپ اورے یا محکمے کا سامان اسٹیشنری وغیرہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر تو نہیں لے جاتے؟

۲۔ کیا آپ اپنے دفتری اوقات کو خوش گپیوں یا دوستوں کی خاطر تواضع میں تو ضائع نہیں کرتے؟

۳۔ کیا آپ دفتر کا کام ختم ہو جانے سے پہلے کھسک تو نہیں جاتے؟

۴۔ کیا آپ اپنے دفتر کا کام جان بوجھ کر تاخیر سے تو نہیں کرتے؟

۵۔ کیا آپ کسی عزیز یا محترمہ کو اپنے سرکاری ٹیلی فون سے مفت کال کرنے کی اجازت تو نہیں دیتے؟

۶۔ کیا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو اس نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں

جیسے اپنی خواتین کو؟

۷۔ کیا تنخواہ لیتے وقت آپ کا ضمیر تو کبھی ملامت نہیں کرتا؟

بعض لوگ منفی ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ چنانچہ پہلے پانچ سوالات کی حد تک ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بے شک اپنے ادارے کی اسٹیشنری لے جاتے ہیں لیکن اس پر ذاتی استعمال کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ زیادہ تر بچوں کے کام آتی ہے۔ یا اس پر دھوبی کا حساب لکھتے ہیں۔ سودھوبی کی ذات اور ہماری اپنی ذات میں فرق ہے۔ اگر اس اسٹیشنری سے خطوط لکھتے بھی ہیں تو ہر چند کہ خود لکھتے ہیں لیکن وہ جاتے تو دوسروں کے نام ہیں۔ دوسرے لوگ ہماری ذات کی تعریف میں کیسے آ سکتے ہیں۔

دوسرے سوال میں لفظ ضائع کے استعمال پر ہمیں اعتراض ہے۔ بلکہ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خوش گپیوں اور دوستوں کے لطف صحبت سے دماغ تازہ ہوتا ہے۔ اور اگلے روز کام کرنے کے لیے آدمی تازہ دم اور مستعد آتا ہے۔ اگر اگلے روز بھی وہ احباب آ جاتے ہیں تو اس سے اگلے روز سمجھیے۔

۸۔ اے ذوق کسی ہمد ویرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

تیسرے سوال کا جواب تو اثبات ہی میں ہے لیکن کھسنے کا لفظ یہاں بے محل ہے۔ ایک سینما میں کوئی صاحب فلم دیکھ رہے تھے وہ تھی کوئی تعمیری قسم کی۔ چنانچہ خراٹے لینے لگے۔ پاس والے نے منعقد ہو کر ان کو جگایا اور ملامت کی کہ بھلے مانس خراٹے لے کر دوسروں کی نیند میں خلل کیوں ڈالتا ہے۔

چپکے سے نکل جانے میں بھی کچھ اسی قسم کی مصلحت ہے۔ کوئی دیکھ لے اور پوچھ لے اور باز پرس کرنے لگے تو خود ہی سوچیے اس میں کتنا وقت ضائع ہوگا اور وہ سرکاری وقت

ہی ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب بھی ہاں ہے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اگر جھٹ پٹ کام کرویا جائے تو پھر دفتر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاخیر میں کئی فائدے ہیں ایک آدمی کا کام کرنے کے لیے پانچ آدمی رکھے جاتے ہیں ملک میں بے روزگاری کم ہوتی ہے۔ تاخیر کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیشن بیٹھتا ہے۔ اس میں نیا عملہ دملہ بھرتی ہوتا ہے اس سے بے روزگاری مزید ختم ہوتی ہے۔ پانچویں سوال کے جواب میں ہم کہیں گے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب کسی محترمہ کو ہم خود مفت کال کرتے ہیں اگر وہ خود آ کر مفت کال کر لے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب رہا سوال نمبر ۶ دفتر میں کام کرنے والی عورتیں اگر معمولی صورت کی یا سمن ہیں تو اخلاق کے تقاضے سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو مائیں بہنیں بیٹیاں سمجھا جائے ویسے آج کل گھر گھاٹ یعنی گھر اور دفتر میں چنداں فرق نہیں رہا۔

مغرب میں تو حامی بات ہے۔ کہ اگر کوئی سیکریٹری خوبصورت ہے تو مستقبل قریب میں اپنے افسر کی گھر والی بن جاتی ہے اور گھر اور دفتر کے پروے اٹھ جاتے ہیں۔ ساتویں سوال کا جواب ہے کہ جی نہیں۔ ملامت نہیں کرتا۔ کیا مجال ہے کہ کرے۔ البتہ تنخواہ نہ لیں تو ضرور ملامت کرتا ہے۔



یہ سوالات تو ضمنی ہیں کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز خدمت عوام پارٹی ہے۔ بلکہ اس کا غیر سیاسی ہونا ہے۔

ع ویسے ہستی کے مت فریب میں آ جاؤ اسد

ہم نے بہت سی پارٹیوں اور جماعتوں اور تحریکوں کو غیر سیاسی سے شروع ہو کر سیاست کا پنچا پکڑتے دیکھا ہے۔ خود اس موالنا سے میں سیاست کے جراثیم بہت

ہیں۔ کل انہی لوگوں کے پاؤں جم گئے تو جھنڈا لے کر نکل آئیں گے کہ دفاتروں میں کاہلی اور بے ایمانی اور عدم کارکردگی دور کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیے اور عوام کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اگلے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے۔ الیکشن کی بات آئے گی تو دائیں بازو اور بائیں بازو اور اسلام اور سوشلزم کا قضیہ ضرور اٹھے گا۔ ہم نے تو اس سوالنامے کے بے سوپے سمجھے جواب دے دیے۔ قارئین کو احتیاط چاہیے کیونکہ بات سے بات نکلتی ہے۔ اور غیر سیاسی سے سیاسی بنتی ہے۔ سرچشمہ باید گرفتن بہ میل۔ ایک بزرگ بازار میں جارہے تھے۔ ایک نوجوان نے انہیں سلام کیا۔ وہ چپ رہے اور جواب نہ دیا۔ بزرگ کے ساتھیوں نے کہا۔ ”بھلا آپ نے یہ غیر شرعی حرکت کیوں کی۔ سلام کا جواب دینا چاہیے تھا۔“ بولے ”تم نہیں سمجھتے۔ میں سلام کا جواب دیتا تو وہ اپنا تعارف کراتا اور کہتا، حاجی صاحب آئیے چائے خانے میں چل کر چائے پیجیے۔ اس کی چائے پی کر اسے چائے پلانا میرا فرض ہو جاتا۔ اس کی میرے گھر میں آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ میری.... ایک جوان بیٹی ہے۔ میں ایسے اوباش نوجوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دے سکتا۔“



کام نے نکما کر دیا

ہمارے ہاں چھٹی کا مطلب اتوار ہے۔ چھ دن کام کے ایک دن آرام کا۔ امریکا میں اور بعض دوسرے ملکوں میں دو دن کی چھٹی کا رواج ہے۔ ہفتہ اور اتوار۔ لیکن امریکا میں تازہ رواج یہ چلا ہے کہ تین دن چھٹی رکھی جائے تاکہ آدمی چار دن کام کرے۔ تین دن اینڈ تار ہے یا تاش کھیلے اور جمعرات کا گیا پیر کو کام پر حاضر ہو جائے۔ امریکا والے اس پر بھی زیادہ خوش نہیں اور سوچ رہے ہیں کہ چار دن بھی کام کے لیے کچھ زیادہ ہی ہیں۔



اس وقت سینکڑوں کارخانے اور فرمیں ہفتے میں چار دن کا معمول اختیار کر چکے ہیں۔ امید کرنی چاہیے کہ جلد ہی تین دن کا ہفتہ رائج ہو جائے گا۔ تین دن کام۔ چار دن آرام۔ چار دن کے آرام والے کو کوئی دن میں یہ تین دن بھی گراں گزرنے لگیں گے اور کچھ عجب نہیں سال دو سال تک صرف دو دن کا کام رہ جائے۔ اور پھر ایک ہی دن کی نوبت آئے۔ ایک دن فی الحال ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یورپ اور امریکا میں ہفتہ وار اجرت اور تنخواہ کا رواج ہے۔ بس پیر کے دن گئے۔ تنخواہ لی۔ کام پر ایک نظر ڈالی۔ کچھ دیر بیٹھے گھڑی دیکھتے رہے کہ کب دفتر کا وقت پورا ہوتا ہے اور ہنستے کھیلتے گھر

آگئے اور لیٹ گئے تصور جاناں کیے ہوئے۔ سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ ایک دن کا ہفتہ بھی کھلتا ہے کھڑاک کی معلوم ہوتا ہے۔ کام کا کیا ہے ہوا نہ ہوا جو کارخانے اتنا حوصلہ دکھاسکتے ہیں، وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایک چپراسی نوکر رکھ لیں جو لوگوں کے گھروں پر تنخواہ دے آیا کرے۔ دفتر کا بہت سا خرچ بچ سکتا ہے۔ میز کرسی کا خرچ۔ بلب کی بجلی پتکے کی بجلی۔ پنسل۔ قلم دوات کا صرفہ غرض یہ کہ خاصی کفایت ہو سکتی ہے۔ ہمیں سواری الاؤنس نہیں ملتا لیکن اگر ملتا بھی تو ایسے حالات میں بخوشی چھوڑ دیتے۔ اپنے سیٹھ یا فرم کے لیے زیادہ نہیں تو اتنا اثر تو کرتے ہی۔



صاحبو۔ کام نے ہم کو نکما کر دیا۔ درندہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے۔ چھ دن کام۔ اور ساتواں دن کون سا فراغت کا ہوتا ہے۔ اسی سوچ میں گزر جاتا ہے کہ کل پھر کام پر جانا ہے۔ مشقت بھی رہتی ہے صبح اٹھ کر اپنا اور جمیل الدین عالی کا کالم اخبار میں پڑھنا پڑتا ہے۔ سارا مزہ کر کر رہا ہو جاتا ہے۔ ہمارا اصول زندگی بھر یہ رہا ہے کہ جو کام کل ہو سکتا ہے وہ آج کیوں کیا جائے۔ بلکہ کل کیا تخصیص ہے۔ کیا ہی کیوں جائے۔ اب رہی کسائی۔ کسائی کر کے کھایا تو کیا کھایا۔ ایسے تو سب ہی کھا سکتے ہیں۔ پیسہ لے تو چھپر پھاڑ کر ملے اور چھپر بھی ہمیں نہ پھاڑنا پڑے۔ قدرت یا قسم ازل یہ تکلف بھی خود ہی کرے۔



استاد ذوق نے جو شعر تکلف کے بارے میں کہا ہے۔

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

ہم۔ بے خیال میں اس میں تکلف کے بجائے کام کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔ استاد ذوق کو شعر کے وزن کی مجبوری تھی۔ مس بلبل یہی شعر لکھتیں تو اس میں کام کا لفظ

باندھتیں۔ یہ شعر استاد امام دین گجراتی کے ہاتھ آتا تو وہ اسے ایسے بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیتے۔ انہوں نے کام کو اپنے کلام میں کئی جگہ کم باندھا ہے۔ الف کی بچت کرنی ہے۔ اس میں مجبوری کا سوال نہیں تھا، پنجابی میں کام کو کم ہی کہتے ہیں۔ استاد امام دین نے ایک قصیدہ بہ خدمت سمندر خاں سپرنٹنڈنٹ دفتر کمشنر اوپنڈی لکھا تھا جو ان کے دیوان میں شامل ہے (سمندر خاں کے دیوان میں نہیں، استاد امام دین گجراتی کے دیوان میں)

سمندر خاں کی خدمت میں پڑا ہے ایک کم سیرا
اگر وہ ہو گیا جلدی تو مٹ جائے گا غم سیرا
اگر پہلے مصرعے میں کام لکھا جاتا تو دوسرے میں عام لکھنا پڑتا اور شعر بے معنی ہو جاتا اور مطلب تو کام سے ہے۔ سمندر خاں بھی استاد کے ہم زبان تھے، مطلب سمجھ گئے اور ان کا ”کم“ کر دیا۔

زاں بیشتر کہ کام کے بارے میں اس قسم کی رائے رکھنے سے کوئی صاحب ہمارے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم علامہ اقبال مرحوم کو اپنی کمک پر لاتے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ہر غلط صحیح کام کے لیے علامہ مرحوم کے کلام سے گواہی ڈھونڈنے کا دستور ہے۔ خود تو جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں۔ یہ ہمیشہ اپنی چار پائی پر پڑے حقہ پیتے اور شعر کہتے رہتے تھے۔ جب دلایت گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہر شخص کام میں مبتا ہوا ہے۔ کسی کو فرصت نہیں کہ بیٹھ کر ان کے شعر سنے۔ دو چار آدمیوں کو رد کر انہوں نے کہا بھی کہ حضرت ابھی ابھی دو شعر کہے ہیں سامت فرمائیے۔ آپ کا جی خوش ہوگا۔ وہ دامن چھڑا کر چل دیا کہ نا صاحب گام پر جا رہا ہوں۔ آخر جھنجھلا کر انہوں نے اپنے دوست شیخ عبدالقادر کو شکایت نامہ لکھ بھیجا۔

مدیر مخزن کو جا کے اقبال کوئی میرا پیام دے دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں تو میں انہیں مذاقِ خن نہیں ہے

علامہ مرحوم کی تخصیص نہیں۔ ہمارا تجربہ یہی ہے کہ جتنے کام کرنے والے ہیں خواہ وہ ٹھیکیدار ہوں یا کارخانہ دار یا دکاندار سب ہی مذاق سخن سے بے بہرہ یا بد ذوق ہوتے ہیں۔ تلاشی لے لیجیے کسی کے ہاں سے ہمارا مجموعہ کلام چاند نگر نہ نکلے گا۔ ہمارے مخدوم حفیظ جالندھری بھی کام کے زیادہ قائل نہیں۔ بلکہ اسے فتنے کی جڑ سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

جاگ کام دیوتا ☆ فتنہ ہائے نوجگا

دیکھیے اقبال اور حفیظ دونوں کتنے اچھے شاعر بنے محض اس لیے کہ کام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کام کرنے والوں کا سانہ تھا۔ میر تقی میر کو بھی ان کے باواہدایت کر گئے تھے کہ بیٹا زندگی بھر عشق کرنا یعنی کام وغیرہ نہ کرنا۔ بیٹے نے یہی کیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک ان کی عظمت کا راز ہے۔ اب غیر شاعروں کی مثال لیجیے۔ اگر نیوٹن کام کرنے والا آدمی ہوتا تو کشش ثقل آج تک دریافت نہ ہوتی۔ کسی باغ میں بیچ پر بیٹھ کر الکسا رہا تھا کہ درخت سے سیب گرا۔ اور کوئی ہوتا تو اسے جیب میں ڈال لیا ہوتا۔ کھانے کے بعد کھاتا اور کسی ڈاکٹر کو بھگا تیا چننی مرے کا کوئی کارخانہ قائم کرنے کی سوچتا اور عمر عزیز اسی میں ضائع کر دیتا۔ نیوٹن بس بیٹھا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اور کشش ثقل ایجاد ہو گئی۔ ایک اور شخص تھا جیمز واٹ نامی۔ کیتلی کے پاس بیٹھا ادھک رہا تھا۔ بھاپ سے ڈھکن جو ہلنے لگا تو موج موج کر اس نے بھاپ کی قوت دریافت کر لی۔ اس کے بجائے کوئی مستعد یعنی کام کا آدمی ہوتا تو کوئی بوجھ رکھ کر ڈھکن کو باد دیتا اور پھر کام کرنے لگتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ ریل ویل انجن دھن وغیرہ کچھ بھی نہ ہوتے۔ گریا ثابت ہوا کہ شاعری کریں تو گام نہ کرنے والے۔ ایجادیں کریں تو گام نہ کرنے والے۔ ارے کسی گام کرنے والے نے آج تک کچھ کیا بھی ہے؟

(یہ کالم ۵ جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھا گیا)

☆☆☆

ایک کالم برستے پانی میں

ایک مسافر کا قصہ مشہور ہے کہ جنگل بیاباں میں چلا جا رہا تھا چلتے چلتے تھک گیا۔ کہاں سے چلا تھا کہاں جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا۔ گھر میں نچلا بیٹھا حقہ کیوں نہیں پی رہا تھا۔ یہ بات قصے میں مذکور نہیں۔ مذکور ہے تو یہ کہ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ کوئی سواری بھیج۔ اب آسمان والوں کو یہی ایک کام تھوڑی تھا۔ ان کے پاس در خواستوں اور فرمائشوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ بہر حال یہ کوئی نیک بندہ تھا۔ اس کی درخواست پر حکم ہوا کہ سواری فی الفور بھیجی جائے۔ مسافر کیا دیکھتا ہے کہ ایک گھڑ سوار چلا آ رہا ہے اور ساتھ اس کے ایک چھوٹا سا بچھیرا ہے۔ اس نے اپنے ہنر سے اس مسافر کو ٹھوکا دیا اور کہا ویل کال آ دی۔ ہمارا بچھیرا تھک گیا ہے اس کو کندھوں پر بٹھاؤ اور ہمارے ساتھ ساتھ بھاگو۔ اس شخص نے تعمیل ارشاد کی لیکن آسمان والوں سے گلہ کیا کہ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ خواجواہ لے سیدھے حکم جاری کر دیتے ہو۔ میں نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی۔ اوپر کے لیے تھوڑا ہی مانگی تھی۔



کچھ ایسا ہی اب کے کراچی والوں کے ساتھ ہوا۔ یہاں ایک پائپ لائن ٹوٹنے سے پانی کا توڑا ہو گیا تھا۔ لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترسے لگے تھے۔ لوگوں نے تیمم

کر کر کے نمازیں پڑھیں اور دعائیں کیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر پاپ لائن کو جوڑ دیتے۔ اپنے پاس سے پانی دینا ہی تھا تو ناپ کر دیتے۔ وہ بھی اعشاری پیمانوں لیٹر وغیرہ سے۔ انہوں نے آسمان کی ٹینگی ہی لٹکھا دی۔ چنانچہ اہل کراچی کے ساتھ وہی ہوا جو کبھی حفیظ جالندھری کے ساتھ ہوا ہوگا بلکہ ہوا تھا۔ جب انہوں نے ایک پیر مرد کے نکاح ثانی پر ایسا ویسا سہرا لٹکھا تھا۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ہم اتفاق سے ان دنوں کراچی سے باہر تھے۔ ورنہ کراچی والوں سے کہتے کہ کوئی دل سے دعائیں مت مانگو۔ دعا کے ساتھ اعداد و شمار بھی دیا کرو۔ یہ کہو کہ معمولی پانی چاہیے۔ بارانِ رحمت نہیں چاہیے۔ ہم نے کچھ برسات لاہور میں دیکھی۔ کچھ پنڈی میں پائی۔ وہاں تو پانی پڑتا ہے۔ سڑکیں دھل جاتی ہیں۔ لیکن پنجاب کے لوگ اس کے عادی ہیں۔ کراچی والوں کو جب بارانِ رحمت کا کئی سالوں کا کوٹا ایک ہی بار ملتا ہے تو ان کے دامن میں نہیں سامتا۔ چھاجوں برستا ہے اور چھتوں کو چھلنی کر دیتا ہے۔ آدمی کچھ مانگے تو اس کا اپنا ظرف بھی کچھ ہونا چاہیے۔ دینے والی سرکار تو ایسی ویسی ہے نہیں۔ جب دیتی ہے تو چھتر پھاڑ کر دیتی ہے۔ بہر حال انتظامیہ کے ہر سال کے اس اعلان کے باوجود کہ بارش کی آفات سے نمٹنے کا معقول انتظام کر لیا گیا ہے، بجا بجا میر جنسی سینئر کھول دیے ہیں۔ پانی کی مجال نہیں کہ غریبوں اور جھگیوں والوں کا بال بیکا کر سکے۔ ہر سال دی دیتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب کے برس بھی یہی ہوا۔

نی الحال یہ کیفیت ہے کہ ایک محلے کا آدمی دوسرے محلے کے آدمی سے خیریت پوچھتا ہے تو ان لفظوں میں کہ میاں آج کل کتنے پانی میں ہو؟ وہ کہتا ہے ہناب ہم تو پانی پانی ہو رہے ہیں۔ یا یہ کہ پانی سرے گزر گیا ہے یا یہ کہ ہماری کمائی پر پانی پھر گیا

ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا کر رہے ہو فی الحال۔ جواب ملتا ہے کہ فی الحال تو آپ کے سامنے پانی بھرتا ہوں۔ مبادا پوچھنے والا سمجھے کہ محاورہ بازی ہو رہی ہے۔ وہ بالائی بھی دکھاتا ہے۔ بے شک کراچی میں محاورے بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے لیکن آج کل پانی کا جتنا کاروبار ہو رہا ہے، لغوی معنوں میں ہو رہا ہے۔

زبان اردو کو اس لحاظ سے بحرنا پیدا کنار کہنا چاہیے کہ اس میں پانی کے محاورے بہت ہیں۔ پانی چڑھتا ہے اُترتا ہے، بہتا ہے اور ملتان تک جاتا ہے۔ لوگ اسے پیتے ہیں اور پی پی کر حریفوں کو کھاتے ہیں۔ اس کی لہر میں گئے کا کاروبار ایک مستقل کاروبار ہے۔ لوگ پانی میں آگ تک لگاتے ہیں۔ پانی مانگتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو پانی تک نہیں مانگتے۔ پانی سب کچھ کر چکتا ہے تو مر بھی جاتا ہے، چنانچہ پانی مرنا بھی ایک محاورہ ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے۔

تیرے دل میں مصری چاہ پوست بیک بھیا کی!

نہ کیوں آنکھیں پڑائے مجھ سے، مرتا تجھ میں پانی ہے

ایک اور استاد فرماتے ہیں۔

آنسو تو دامن سے پونچھوں، بچکی کیوں کر روکوں میں

لاکھ چھپاؤ عشق کو لیکن پانی پھر بھی مرتا ہے

بعض شاعر اور عاشق کہ اندر سے یہ دونوں ایک ہوتے ہیں۔ خود پانی پہ مرتے ہیں۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے

الٹی یہ گھٹا دودن تو برے

ایک اور شاعر اس مضمون کو یوں باندھتا ہے۔

جاسکا پھر نہ مرے گھر جو وہ وہ جانی آیا

رحمت اللہ کی آئی، جو یہ پانی آیا!

پانی کے چلنے کا ایک اور مضمون بھی سنئے۔

غسل حمام کو کب آئے گا، وہ شوخ غفور

پانی جلتا ہے جدا، آگ جدا جلتی ہے

اساتذہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں پانی سستا بھی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اسے روپے کی طرح سے بہایا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح پیسے اور صراحی کے حساب سے بکانہ کرتا تھا۔ کسی کا شعر ہے۔

پیتے ہیں اب جناب میثقت مآب بھی

پانی کے مول بکنے لگی ہے شراب بھی

شعرا کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف کپڑا اور گردن ہی ناپنے کا دستور نہ تھا۔ پانی بھی ناپا جاتا تھا۔ مشہور شاعر قلق کا شعر ہے۔

کچھ پتہ ملتا نہیں عشقِ ذوق کو چاہ کا

پانی ناپا آشنائوں نے بہت اس چاہ کا

ایک شعر راسخ کا بھی سنئے کہ مضمون نکالنے کی حد تک ناسخ کے بھائی تھے۔

ہو گیا ہے مرے جلاؤ کا خنجر پانی!

کم سے کم ناپ کے پیتا ہوں میں گز بھر پانی

قارئین کرام! ہم پانی کے مضمون کو سرید پانی کرتے لیکن اب پھر گھر آیا ہے اور پانی پھر برسنے کے آثار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا سی تاخیر سے ہمارے اس کالم پر پانی پھر جائے۔ جس طرح کسی شاعر نے اپنے نامے کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا ہے۔

آسمان اپنی عداوت سے نہ پانی پھیر دے

لے چلا ہے خط ہمارا نامہ بر برسات میں

☆☆☆

کراچی میں دو عیدیں

کراچی میں اب کے دو عیدیں ہوئیں اس پر سبھی لکھنے والوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن ہم کچھ نہ لکھیں گے کیونکہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے۔ بعض بزرگوں نے اتوار کو عید منانے والوں کی روک تھام کے لیے جو مسجدوں میں تالے ڈال دیے تھے اس باب میں بھی ہم کچھ نہ کہیں گے کیونکہ وہ بھی شرعی مسئلہ ہے جس کی توضیح ایک صاحب ارشاد و ہدایت نے ہم سے یوں کی ہے کہ ہمارا بس چلے تو سارا سال تالے ڈالے رکھیں تاکہ بدعتی لوگ مسجدوں میں نہ آسکیں۔ فساد نہ پھیلا سکیں ہر چند کہ ہم نے سن رکھا ہے۔ شرع میں شرم نہیں لیکن شرع کی اس قسم کی شرح و یکہ کراہیں تو آتی ہے۔



ہم اس لیے بھی اس مسئلے پر کچھ نہ لکھیں گے کہ یہ ایک اقتصادی مسئلہ بھی ہے۔ اگر تالوں کا وسیع پیمانے پر استعمال نہ ہو تو تالے بنانے والے لہو کے مرجائیں۔ علی گڑھ تالے بنانے والوں کی انجمن نے تو علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کے اس فیصلے کو بر ملا سراہا ہے۔

پھر جب آپ کا رخانے داروں کو تالا بندی سے نہیں روکتے تو مسجدوں کی تالا بندی روکنے کا کیا جواز ہے۔ ہمارے ملک میں دین بھی انڈسٹری ہے اور امامت و خطابت بھی کاروبار ہے اور فتویٰ سازی بھی صنعت ہے۔ اگر عید سارے ملک میں ایک ہی دن

ہو جائے جیسے کہ اکثر اسلامی ملکوں میں باتفاق رائے ہوتی ہے تو لوگ سمجھنے لگیں گے کہ رویت ہلال کمیٹی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ مولویوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے براہ راست استمداد کرنے اور رشتہ استوار کرنے کی سوچے گا۔ پر ہوتوں کو غیر ضروری سمجھے گا۔ معاملہ صرف چاند اور عید کا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ بات اور آگے جاسکتی ہے۔

ہم اس لیے بھی اس باب میں کچھ نہ لکھیں گے کہ اس سے ہماری صلح کل طبیعت کے بدنام ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہم نے اتوار کی عید کو صحیح سمجھتے ہوئے بھی خود عید چیرہ می کے دن کی ہے۔ بعض لوگوں نے ہمیں پیر کو ناظم آباد کی جامع مسجد کی صفوں میں دیکھا تو کچھ تعجب بھی کیا لیکن ہمارے علاوہ بھی بہت لوگ تھے جنہوں نے اتوار کو مسجد میں بند پا کر ناچار پیر کو عید کی نماز پڑھی تھی۔ بات یہ ہے کہ عید کی نماز باجماعت ہوتی ہے۔ آدمی تنہا نہیں پڑھ سکتا۔ خصوصاً ایسا آدمی جو دوسروں کو کن آنکھیوں سے دیکھ کر ہاتھ باندھتا اور چھوڑتا ہو۔ ہم نے اتوار کی صبح اپنے دوست جمیل الدین عالی کو فون کیا تو یہ معلوم کر کے رشک آیا کہ وہ تو اطلس کی پھولدار شیر والی پہنے کان میں عطر کا پھونپا رکھوا رہے ہیں۔ کیونکہ سامنے ڈیفنس سوسائٹی کی مسجد میں نماز عید کی صفیں درست ہو رہی ہیں۔ ادھر ہمارے ہاں اس روز روزہ تھا۔ یہ فقر وہم نے جان بوجھ کر مبہم رکھا ہے۔ اگر آپ اس کا مطلب یہ لیں کہ ہمارا روزہ تھا تو یہ آپ کا حسن نظر اور الطاف عظیم ہے اور اگر اس سے یہ مراد لیں کہ گھر کے دیگر افراد کا روزہ تھا، تب بھی حرج نہیں۔ کیونکہ زیادہ قرین حقیقت یہی ہوگا۔

البتہ ۲۹ کو ہمارا روزہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے کتنے روزے رکھے آپ یہ نہ پوچھیں تو اچھا ہے کیونکہ اس طرح بات ذاتیات میں چلی جائے گی۔ اپنے روزے کی پیلیٹی ہم اس لیے نہیں کرتے کہ ایک تو ہم بے ریا آدمی ہیں دوسرے یہ قباحت ہے کہ

لوگ کہیں گے کہ تم نے روزہ رکھا تو ہمیں روزہ کشائی میں کیوں نہیں بلایا اور گلے میں بارڈال کراخبار میں تصویر کیوں نہیں چھپوائی۔ بیماری اور سفر میں روزے معاف ہیں اور اسے اتفاق ہی کہیے کہ ہماری اکثر بیماریاں اور اکثر سفر اس مبارک مہینے میں واقع ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے اس سال کے روزوں کے بارے میں ہم اتنا اشارہ دے دیں کہ انہیں ایک چھانگا آدی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہے۔



بعض لوگ تو ہم سے بھی زیادہ صلح کل نکلے۔ یعنی اتوار کو روزہ بھی رکھا اور عید بھی پڑھی۔ روزہ کراچی کے علمائے کرام کی خوشنودی کے لیے، عید اپنی خوشی کے لیے۔ جو لوگ صبح کو گھر سے عید کی سوتیاں کھا کر نکلے تھے بعض محلوں میں انہیں رمضان المبارک کا احترام کرنا پڑا۔ جو شخص ہمارے محلے میں ڈھول بجا کر سحری کے لیے جگاتا تھا اس نے اتوار کی صبح ہمیں سحری کے لیے بھی جگایا اور اس بچے عیدی لینے بھی آ گیا کہ صاحب عید مبارک۔ بعضوں نے دونوں دن عید کی نماز ادا کی۔

اتوار کو پولو گراؤنڈ میں، پیر کو نشتر پارک میں۔ ہمارے نزدیک تو اس میں حرج کی کچھ بات نہیں۔ محاورے میں تو ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات آیا ہے۔ اگر روزے ۲۹ یا ۳۰ ہو سکتے ہیں تو کیا عید و دن بھی نہ ہو؟ حلوائے خوش است، دیگر بیارید۔

اب کے ہم اپنی عیدی عربوں کو دینا چاہتے تھے جو روزے رکھ کر بے جگری سے لڑے لیکن ان کے پاس سنا ہے خود اتنا پیسہ ہے کہ ہمیں عیدی دے سکتے ہیں پھر ہمیں عیدی امین صاحب کا خیال آیا۔ عربوں کے معاملے میں انہوں نے اتنی دوڑ دھوپ کی ہے کہ ہم نے ان کا ایشیائیوں کا دشمن ہونا معاف کر دیا۔ مشکل یہ ہے کہ انہیں منی آرڈر کس پتے پر بھیجیں کیونکہ وہ آج اس دارالحکومت میں ہیں کل دوسرے میں۔



ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں

ہم تقریر کرنے سے کتراتے ہیں بلکہ مشاعرہ بھی اسی باعث نہیں پڑھتے کہ شعر ارشاد کرانے سے پہلے شاعر کا تقریر کرنا اب قریب قریب آداب میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم تقریر نہیں کر سکتے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے لیے ذرا اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہی کہ ہماری ٹانگوں کو کسی ستون یا کرسی کے پائے سے کس کر باندھنا پڑتا ہے کیونکہ ہمارے دوسرے اعضاء رئیسہ کی طرح یہ بھی ایسی خدا ترس واقع ہوئی ہیں کہ جہاں تقریر کا موقع آیا تھر تھر کانپنے لگیں۔ نرم دلی کے باعث آواز میں بھی رقت آ جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب روئے کہ تب روئے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہمیں دلائل پر قابو نہیں رہتا۔ دلائل ہمارے ذہن میں ایسے با افراط ہوتے ہیں کہ لب تک آنے کے لیے ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں۔ بعض تو موقع محل بھی نہیں دیکھتے اور بلا سیاق و سباق وارد ہو جاتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ کئی ایک نے بیک وقت ہماری زبان پر آنے کی کوشش کی تو ایک گچھا سا بن کر ہمارے حلق میں انک گئے۔

ایسے میں سطحی نظروالوں کو ہماری تقریر اگر الجھی ہوئی معلوم ہو تو وہ قابل معافی ہیں۔ حلق تر رکھنے کے لیے ہمیں پانی بھی بار بار پینا پڑتا ہے پیتے تو اور لوگ بھی ہیں، لیکن

ہمیں اپنی ضرورت کے پیش نظر منتظمین جلسہ سے گزارش کرنی پڑتی ہے کہ اسٹیج پر ناکا لگادیا جائے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو ایسا اہتمام کر سکیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ بزم تاریخ والوں نے ایک مباحثہ کرایا۔ موضوع ایسا تھا کہ ہمیں بے اختیار تقریر کرنے کی خواہش ہوئی۔ ہم نے اس خواہش کا اظہار کیا تو سیکریٹری صاحب بولے۔ ”آپ کا تقریر کرنا ہمارے لیے فخر کا باعث ہوتا لیکن کیا کریں؟ کے۔ ڈی۔ اے۔ والے نہیں مانتے۔ کہتے ہیں شہر میں ویسے ہی پانی کی قلت ہے۔“

خدا جانے ہمارے تقریر نہ کرنے کی شہرت ایک مقامی کالج والوں تک کیسے پہنچ گئی کہ انہوں نے ہمیں ایک مباحثے کا جج بنا دیا۔ ہم نے بہت غور کیا کہ ہم تو خود بولنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ججی کیا کریں گے جواب ملا کہ ابھی پچھلے دنوں فلاں کالج والوں نے بھی تو ایک مشاعرے کی صدارت ایک ایسے صاحب سے کرائی جو شعر کہنا تو درکنار ایک مصرع بھی موزوں نہیں پڑھ سکتے۔

اس پر ہم لا جواب ہو گئے۔ ولائل ان لوگوں کے پاس اور بھی تھے لیکن اندیشہ پیدا ہوا کہ جوں جوں دو سامنے آئیں گے۔ ہمارا ازالہ حیثیت عرفی ہی ہوگا۔ نیک نامی کا کوئی امکان نہیں۔ ہم نے کہا ”اچھی بات ہے لیکن ایک بات کی ضمانت دیجیے کہ فیصلے کے بعد مقابلے میں شریک ہونے والے اور انعام نہ پانے والے ہمیں لتاڑیں گے نہیں۔“ کیونکہ ایک بار تھیو سوفیکل ہال کی چھت پر ہم نے تقریروں کے ایک مقابلے میں منصفی کی تھی۔ ایک صاحب نے جن کے اسکول کو انعام نہ ملا آنکھیں بند کر کے اور منہ کھول کر ایسی تقریر کی کہ اگر وہ ہماری شان میں نہ ہوتی تو ہم پہلا انعام ان ہی کو دیتے۔

ایک موقع پر ایک صاحب زادے کا رد عمل بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کو انعام نہ ملا تو مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

”اب دیکھوں گا آپ کیسے جبکہ لائن میں سے گزرتے ہیں روز چلے آرہے ہیں
ترکی ٹوپی لگائے قوانی سنئے۔“

جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا تصوف سے شغف کم ہو گیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اب
ہم قوانوں کو اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔

ہمیں اسکول سے نکلے (خونکے تھے، نکالے نہیں گئے تھے) اتنے دن ہو گئے ہیں
کہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ زبان اردو کتنی ترقی کر گئی ہے۔ ہم پرانے مولویوں سے پڑھے
تھے جو لب سڑک اور فوق البھڑک وغیرہ تک کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ادب اور صحافت
کے کوچے میں مولانا جبرائیل حسن حسرت مرحوم ایسے سخت گیسروں سے پالا پڑا جنہوں
نے ایک افسانہ نگار کی عظمت کو محض اس لیے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے
زور بیان میں ہیر کی زبان سے یہ کہلوایا تھا کہ ”سہیلی امیر اپیار پہاڑ کی طرح اٹل ہے
اور سمندر کی طرح پایاب ہے۔“

ایک اور مصنف پرو عمر بھراس لیے فخر ہے کہ اس نے کہیں روانی میں لکھ دیا تھا کہ
”اس آگ نے مجھے جلا کر خس و خاشاک بنا دیا ہے۔“

الحمد للہ کہ آزادی کے بعد سے جہاں انگریزوں سے چھٹکارا ملا۔ بات بات پر
گرفت کرنے والوں اور تلفظ اور محاوروں میں سندیں مانگنے والوں کا زور بھی ٹوٹا۔ آج
کل کے اساتذہ اور طلبہ کی وسیع انجیانی کا اندازہ ہمیں اس روز کی تقریریں سن کر ہوا
ایک صاحب نے تقریر کا آخرازی اس جملے سے کیا کہ۔

”جن لوگوں کی زیر نگرانی میں یہ مباحثہ ہو رہا ہے وہ مستحق تحریک ہیں۔“

ہمارے زمانے میں یا تو زیر نگرانی کہتے تھے یا نگرانی میں، غور کرنے پر زیر نگرانی میں
کہنے کی حکمت کھلی، یہ تقریر کوئی فارسی خواں سن رہا ہو تب بھی سمجھ جائے گا اور فارسی سے
نابلد ٹھیٹھ اردو بولنے والے کو بھی مجال اعتراض نہ ہوگا۔ ایک اور صاحبہ غالباً فارسی کی

طالب علم تھیں وہ صدر گرامی قدر گرامی کے نیچے بھی زیر ڈالتی گئی تھیں۔ ان کا صدر گرامی کہنا ہمیں تو بہت بھلا معلوم ہوا۔ متعارف کے معنی میں ہم ایک لفظ روشناس کرتے تھے۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ اس کا تعلق روشنی سے ہے۔ دو تین طالبات کو روشناس کہتے سنا تو صحیح مطلب سمجھ میں آیا۔ رجعت پسند میں ہم ہمیشہ زیر زیر ہی پڑھتے رہے۔ اپنی اس رجعت پسندی کا احساس اس وقت ہوا جب ایک مقررہ سے رجعت پسند سنا۔ اگر اتنے دنوں میں زیر ترقی کر کے پیش تک نہ پہنچے تو زبان کی ترقی ہی کیا ہوئی۔ اسی مباحثے میں ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ صحیح لفظ مدح سرائی نہیں مداح سرائی ہے۔

اسکولوں کی عمارتیں کم ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت سے اسکول فٹ پاتھوں پر قائم ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ ذرا امتداد کلاس سے غائب ہوا اور کوئی بندر بچانے والا یا بلا در دوانت نکالنے والا یا چورن بیچنے والا ان کی جگہ آ بیٹھا۔ یہ بات فائدے سے خالی نہیں اس سے طلبہ کا ذخیرہ اشعار بڑھتا ہے۔

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

اور.....

بشر راز دل کہہ کر ذلیل دُخوار ہوتا ہے

اور.....

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
دغیرہ ایسے ایبات ہیں کہ عمر بھر کام آتے ہیں۔ ان اسکولوں کے طالب علم جب فارغ التحصیل ہو کر رکشا یا بس چلاتے ہیں تو ان اشعار کو رکشا اور بس کی پشت پر لکھواتے ہیں۔ یہاں ایک بی بی نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

دل میں ایک چھپتی ہوئی تقریر ہونی چاہیے
نالہ کیسا بات میں تاثر ہونی چاہیے

تو ہم نے پوچھ لیا کہ آپ کس کالج سے تشریف لائی ہیں؟ فوراً کہنے لگیں ”آپ ان جان بٹے ہیں، جس فٹ پاتھ پر آپ اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے گنڈیریوں کے چھلکے پھینکتے ہیں، وہیں تو ہماری کلاس لگتی ہے۔ آپ نے مجھے ضرور دیکھا ہوگا۔“

اس بحث کا موضوع تھا کہ نئی پود کی بے راہ ردی کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ بعض طالبات نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے انگلیوں سے اوھر اشارے بھی کیے، جدھر ان کے والدین بیٹھے تقریریں رہے تھے، لیکن سب ہی ایسی نہیں تھیں۔ بعضوں نے ان کو بری کرانے کے لیے زور خطاب صرف کیا۔ ایک صاحبہ نے کہا کہ۔

”حضرت آدم علیہ السلام کے تو والدین ہی نہیں تھے، اس کے باوجود آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان سے جنت سے نکالے جانے کے قابل بعض باتیں سرزد ہوئیں۔“ لیکن سب سے موثر استدلال ان صاحبہ کا تھا جنہوں نے کہا۔

”یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے۔ بدر اسی کی حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمہ دار والدین کو ٹھہراتی ہے۔ کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔“

اس پر ہمیں بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آئی اخبار (ڈان) کی ملکیت کا جھگڑا تھا، آرام باغ میں ایک جلسہ ہوا۔ ایک بہت محترم معمر لیڈر نے صدارت کی۔ ایک مقرر نے نہایت غیظ و غضب میں تقریر کی اور آخر میں فیصلہ صادر کیا کہ ڈان بیرے باپ کی ملکیت ہیں، ڈان ایڈیٹر صاحب کے باپ کی ملکیت نہیں۔ ڈان (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) صاحب صدر کے باپ کی ملکیت نہیں، بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔

(فروری ۷۷ء میں لکھا گیا)۔



پریس کلب میں تقریب رونمائی

کراچی کا پریس کلب عجب رونق کی جگہ ہے۔ اس کے اندر تو ہمیں کم ہی جانا ہوتا ہے۔ اس کے احاطے میں البتہ اکثر دیکھا کہ ایک کونے میں قوالی کا جلسہ ہے اگر بتیاں سلگ رہی ہیں اور تالی بج رہی ہے۔ دوسرے کونے میں دھوبلی پنچایت کا سالانہ جلسہ ہے۔ مندوبین کلب لگے کپڑے پہنے اکڑے اکڑے پھر رہے ہیں۔ لان میں سائیکل کے پتھر لگانے والوں کی ایسوسی ایشن کا سیمینار ہے اور چوتھے میں فلسفی لوگ سر جوڑے نطشے کے مابعد الطبعیاتی تصورات پر بحث کر رہے ہیں۔ ایک بار ہم نے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر سنا تو کچھ اس قسم کا غلغلہ سنائی دیا۔

پس ہمارا مطالبہ ہے کہ پتھر لگانے کا سیلوشن سستا ہونا چاہیے کیونکہ نطشے کے سارے تصورات ابن عربی سے مستعار ہیں اور اب جب کہ کاسٹک موڈے کی گرانی نے ہماری کمزوری ہے، میرے مولا بلا لودینے مجھے میرے مولا بلا لودینے مجھے۔“



اس ہرم کو پریس کلب میں عبید اللہ علیم کی کتاب ”چاند چہرہ ستارہ آنکھیں“ کی رونمائی تھا، ہم بھی گیٹ سے داخل ہو کر ایک خالی کرسی پر جا بیٹھے۔ کوئی صاحب تقریر کر اب دھاندلی نہیں چلے گی۔ ہمیں سال میں سترہ مہینے کا بونس اور دس ماہ کی

باتخو اچھی ملنی چاہیے اور چھانٹی بند کی جائے۔ اب ہم نے غور سے دیکھا تو جھنڈے جھنڈیاں اور ان پر نعرے بھی نظر آئے۔ یہ کسی ٹریڈ یونین کا جلسہ تھا۔ دریافت ہوا کتاب کا جلسہ دوسرے کونے میں ہے۔ وہاں گئے تو واقعی شاوی اور بارات کا منظر تھا۔ قاتیں تھیں دریاں تھیں چاندنیاں تھیں جن پر قالین قالینوں پر شہ نشین پر مٹلا مسندیں اور مائیک مصنف اور ناشر اہلہ گہلے پھر رہے تھے۔ پانی کی سبیل لگی تھی۔ جانے کیا سمجھ کر ایک شخص سرخ حلیم اور وہی بڑے کا ٹھیلے لے کر آکھڑا ہوا تھا۔ نسیم ورائی نے کہ کتاب کے ناشر ہیں۔ اسے مشکل سے سمجھا بچھا کر وہاں سے ہٹایا۔ جانتے تھے کہ سب ہی لوگ سرخ حلیم اور چاٹ پر پل پڑیں گے۔ کتاب کوئی نہ خریدے گا۔



پروگرام میں تقریریں شامل تھیں اس کے بعد ٹھنڈی میٹھی بوتلیں اور اس کے بعد موسیقی۔ بادلوں کو معلوم ہوا کہ مہارگائی جائے گی تو پیشگی اندازے بلکہ ٹپ ٹپ بوندیں برسانے لگے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ ایسے جلسوں میں لوگ کتاب کے ساتھ بروشر یعنی ایک کتابچہ مطبوعہ اشتہارات چھاپتے ہیں تو کیوں چھاپتے ہیں۔ گرمی ہو تو لوگ اس سے پنکھا جھلٹتے ہیں اور بوند باندی ہو تو سر پر رکھتے ہیں۔ کرسیوں پر گروہ تو سیٹ پر رکھ کر اس پر بیٹھتے ہیں اور تقریریں زیادہ ہی پر مغز ہوں تو منہ پر رکھ کر قیلولہ کرتے ہیں۔ صدارت تو ہمارے دوست ضیا جاندھری کی تھی لیکن اسٹیج پر زرنگار مسندیں قطار در قطار رکھی تھیں۔ سرشار صدیقی نے لوگوں کو بلانا شروع کیا تو ایک وقت میں ہمیں اندیشہ پیدا ہوا کہ سارے حاضرین اسٹیج پر جا بیٹھیں گے تو پنڈال میں کوئی نہ رہ جائے گا۔ پہلے انہوں نے جناب رئیس اسروہوی کو بلایا۔ پھر عبید اللہ علیم کو بلایا پھر نسیم ورائی کو بلایا۔ ہم بھی تیار ہو رہے تھے کہ چالیسویں پچاسویں نمبر پر ہمیں بھی یاد کیا جائے گا لیکن جمیل الہین عالی کا نام پکارا گیا تو انہوں نے معذرت کر دی اور یوں گیارہ آدمیوں کے اسٹیج

پر بیٹھنے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مجنوں گورکھپوری صاحب ذرا دیر سے تشریف لائے
وہ فوراً اسٹیج پر آن بیٹھے۔



اب تقریریں شروع ہو گئیں۔ بولنے والے زیادہ تر عبید اللہ علیم کے ہم عصر تھے۔ ان
کی تقریریں مختصر تھیں اور ان میں کہنے کی باتیں دلنشین انداز میں کہی گئی تھیں۔ خوشی کی
بات یہ ہے کہ فاضلانہ مقالہ کوئی نہیں تھا۔ لہذا کسی صف سے خراٹوں کی آواز بھی ہم
نے نہ سنی ورنہ بعض مقرر تو اسٹیج پر آ کر مائیک کو چستی کی طرح منہ میں لے لیتے ہیں۔
ان کا دورہ چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذکاء الرحمان صاحب نے تو کوئی اور موضوع پسند
کیا۔ اسد محمد خاں، احمد ہمدانی اور جون ایلیا نے شاعر اور کتاب کا ذکر کیا۔ جون ایلیا کی
تقریر بالخصوص خیال افروز تھی۔ انہوں نے علیم کو ہیجان ذات کا شاعر قرار دیا اور گفتگو کا
مود خور بھی جو ایک سے دو و سول کرتا ہے۔ واقعی علیم لفظ کو برتتے ہیں تو ان کی جان
نکال لیتے ہیں۔ البتہ جون ایلیا کی ایک بات پر ہم چونکے کہ عبید اللہ علیم کو دیکھ کر ہمیں
قلبی کا خیال آتا ہے، ہم سمجھے یہ بے تکلف در دست ہیں۔ اکٹھے جا کر قلیاں کھاتے
رہے ہوں گے لیکن پھر کسی نے بتایا کہ جون ایلیا نے عرفی کہا ہے قلفی نہیں۔ خیر تھوڑی
بہت مٹھاس تو عرفی کے کلام میں بھی ہے۔



مجنوں گورکھپوری ہمارے ادب کی مایہ ناز ہستی ہیں۔ جشہ ایسا کہ مجنوں یعنی قیس
عامری سلمہ بھی دیکھتے تو رشک کرتے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے نہ ہاتھ میں طاقت ہے نہ
آنکھوں میں دم ہے اور بولتے ہیں تو لوگ حیران ہوتے ہیں کہ از کجای آید ایس آواز
دوست۔ لیکن اخلاق ایسا ہے کہ ہر جلسے میں پہنچتے ہیں انکار نہیں کرتے۔ تقریر بھی
کرتے ہیں، علم کا دریا ہیں لیکن یہ دریا بعض اوقات تقریر کے کوزے میں پوری طرح

بند نہیں ہو پاتا۔ بہت سا پانی ادھر ادھر بہ جاتا ہے۔ ہم نے کتابوں کے افتتاح کے کئی جلسوں میں انہیں سنا ہے۔ ان کا پہلا فقرہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی یا پوری نہیں پڑھی۔ یہاں سے جا کر پڑھوں گا۔ اس کے بعد ادب کی ابدی صداقتوں پر آ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی تقریر کی یہی شان تھی۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ بولنے کو کھڑے ہوئے تو اسٹیج پر زلزلہ سا آ گیا۔ کچھ لوگ سمجھے مائیکروفون گر رہا ہے۔ کچھ سمجھے مجنوں صاحب گر رہے ہیں۔ آخر انہوں نے وضاحت کی کہ میں نہیں گر رہا۔ مائیکروفون کو کوئی آ کر سنبھالے۔



ہم بہت دن سے اس کتاب کے پھیلانے اور منظر عام پر لانے میں عبید اللہ علیم کے انتہاک کو دیکھ رہے تھے ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ عبید اللہ علیم نے کوئی چھ مہینے ہوئے عہد کیا تھا کہ جب تک کتاب چھپ نہیں جاتی نہ خود بال کٹواؤں گا نہ جلسے میں تقریر کرنے والے کسی اور شخص کو کٹوانے دوں گا۔ لیکن آپ جانتے ہیں فی زمانہ کتنے بزرگ ہیں جو چھوٹوں کے کہنے میں ہیں۔ ضیاء جالندھری اور نسیم درانی تک نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ہاں ہمارے دوست رئیس امر وہوی نے ضرور ان کا دل رکھا۔ ان کی فرمائش کا پاس کیا۔ دیکھا کہ ان کی جنائیں ان کے شانوں پر سے ہو کر ان کے سینے پر آ رہی ہیں۔ ہم پہلے سمجھے ہوں گے کوئی قدوۃ السالکین، پھر پہچانا کچھ لوگ دنیا کو ترک کر دیتے ہیں۔ کچھ کو دنیا ترک کر دیتی ہے لیکن ہمارے رئیس صاحب کا شمار تو ان دونوں طبقوں میں نہیں۔ وہ جمال و عفت آدمی ہیں۔ بے شک آج کل مابعد الطبیعات اور روحانیت وغیرہ سے ان کو شغف ہے۔ جنوں وغیرہ سے بھی ان کی یاد اللہ ہے۔ جس دم بھی کرتے ہیں۔ صبح کو آدھا گھنٹہ سر کے بل بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بات نہیں۔ مر کے بل ہم بھی کھڑے ہوتے ہیں بلکہ کوچہ رقیب میں اسی شان سے

جاتے ہیں۔ ہم ان کو ان کے اشغال سے نہیں روکتے لیکن یہ گیسو درازی اور جبا اور
بھصوت کی سند نہیں۔ یوں بھی اب عبید اللہ علیم کی کتاب کا افتتاح ہو چکا ہے۔ وہ بال
کنوا لیں اپنی نہیں تو ہماری جمال پرستی کا لحاظ کریں۔ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔



نیکس صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کچھ یوں کیا کہ الیکٹرانکس کی مدد سے ہم بارہ
ارب نوری سال تک دیکھ سکتے ہیں اور ایک نوری سال سات کھرب میل کے برابر ہوتا
ہے اور روشنی کی رفتار ایک لاکھ پچاس ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ ہم سمجھے غلطی سے یہ دو
مقالہ اٹھالائے ہیں جو کل یونیورسٹی کی فزکس سوسائٹی میں ان کو پڑھنا ہے۔ ہمیں
تشویش ہوئی کہ اس کی تلافی کے لیے وہ کہیں سائنس دانوں اور ہیئت دانوں میں عبید
اللہ علیم کی شاعری کا ذکر نہ لے بیٹھیں۔ بے شک کتاب کا نام چاند چہرہ اور ستارہ
آنکھیں ہے اور چاند ستاروں کی نسبت علم ہیئت سے ہے لیکن یہاں اور چاند مراد ہیں
اور دوسری قسم کے ستاروں کی گفتگو ہے۔



بہت بڑا مجمع تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبر نہیں ہوئی ورنہ واقعہ ۱۴۴۱ لگاتے اور پولیس کو
اطلاع نہ پہنچی ورنہ لاٹھی چارج کرنے کا نادر موقع تھا۔ خوشی ہوئی کہ ایک ادبی کتاب کی
پذیرائی کے لیے اتنے لوگ آئے ہیں اور ان میں بہت سے چاند چہرے اور ستارہ
آنکھوں والے بھی ہیں۔ عبید اللہ علیم بہت نازک خیال شاعر ہیں اور ایک خوبی ہم نے
یہ دیکھی کہ انکسار کو عیب جانتے ہیں اور خودی کو بلند کرنے کے حامی ہیں جس کے لیے
وہ انا کا لفظ پسند کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جو شخص اپنی قدر خود نہ کرے گا دوسرے اس کی
قدر کیوں کریں گے۔ بڑے ہو کر یہ بھلے ہی کچھ اور کام کریں۔ اس مجموعے سے معلوم
ہوا کہ محبت ان کا کل وقتی کام رہا ہے۔ میر تقی میر کے والد ماجد نے اپنے بیٹے کو نصیحت

کی تھی کہ اے فرزند ساری عمر عشق کرنا اور کچھ کیا تو مجھ سے برا کوئی اور نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے عبید اللہ علیم بھی کہیں آس پاس ہی تھے۔ یہ سمجھے کہ ان بزرگ کا خطاب مجھ سے ہے۔ ایسی غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے خود ہمیں بھی ہو چکی ہے۔



چاند چہرہ ستارو آنکھیں اندر سے بھی خوب صورت ہے۔ باہر سے بھی خوب صورت ہے۔ اس میں علیم نے زندگی کے عذاب بھی لکھے ہیں خواب بھی لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی کی تازگی اور توانائی ہے۔ حوالے دینے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن پھر کالم مشاعرہ بن جائے گا۔

(دخل در معقولات)

(اپریل 1974ء میں لکھا گیا)



ترقی دھوبیاں کو آپریٹو سوسائٹی

اپنے کپڑوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار!

آپ نے لائڈری میں یا ڈرائی کلینر کے ہاں بہت بار کپڑے دیے ہوں گے لیکن یوں کہ رسید لی اور تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ اگر کہیں آپ اس کی پشت کے نوشتہ پڑھ لیں تو یقین ہے کہ خود ہی غسل خانے میں چھو اچھو کیا کریں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اگر کپڑے کے چھتھڑے اڑ جائیں تو لائڈری فوسے دار نہ ہوگی۔

۲۔ اگر استری کرتے میں کوئلے سے کپڑے جل جائیں تو لائڈری پر فوسے واری نہ ہوگی۔

۳۔ اگر کپڑے پر چاہ بھارنگ یا تار کول کے دھبے پڑ جائیں تو لائڈری فوسے دار نہ ہوگی۔

۴۔ اگر لائڈری کا کوئی ملازم کسی صاحب کے کپڑے پہن کر بارات میں چلا جائے یا انہیں رہن رکھ دے یا بیچ کھائے تو کسی گاہک کو مواءخدے کا حق نہ ہوگا۔

دھوبی آخر دھوبی ہے۔ منطقی نہیں ورنہ محض ایک فقرہ لکھنے سے کام چل جاتا کہ

گا بکوں کے کپڑے لے کر واپس نہیں کیے جاتے۔



ہمارا ارادہ ایک زمانے سے تھا کہ وھو بیوں کے ان سامراجی اصولوں کے خلاف کپڑے وھلانے اور پہننے والوں کو منظم کر کے ایک تحریک چلائیں اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ جس طرح اس نے زمینداروں اور جاگیرداروں کو ختم کر دیا۔ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی لگادی۔ اسی طرح لائڈریوں کے متعلق کوئی قانون بناوے جس سے کپڑے نہیں تو فی الحال کچھ حقوق ہی واپس مل جائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ حقوق ابھی ہمارے ذمے قابل ادا ہیں جن کی وصولی کے لیے انہوں نے پہل کر کے لاہور میں ایک انجمن بھی بنالی ہے۔ ”ترقی وھو بیاں کو اپریٹو سوسائٹی۔“ ہمارے گلی کے کونے پر پانچ سال ادھر میاں تاج محمد دھوبلی کی کوٹھڑی تھی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ ویوار پر سفیدی کرا کے لکھ رکھا ہے۔ دہلی ور بار واشنگ فیکٹری۔ اب وہی کوٹھڑی۔ اپ ٹو ڈیٹ امپیر مل ڈرائی کلیئرز، کے نام سے موسوم ہے اور ایک طرف شیشے کے کیس کے اندر ایک مشین بھی دھری رہتی ہے جو نہ جانے کپڑے وھونے کی ہے یا آئس کریم بنانے کی۔ بہر حال اسے چلتے کسی نے نہیں دیکھا۔ میاں تاج محمد کپڑے اب بھی گانڈھی گارڈن کے گھاٹ پر ٹھنڈے پانے سے ڈرائی کلین کرتے ہیں البتہ ہمارا معیار زندگی انہوں نے بڑھا دیا۔ جس کپڑے کی دھلائی پہلے دو آنے دیتے تھے اب چار آنے وئی پڑتی ہے۔ کلف لگانے کے دو آنے مزید اور استری کرائی کے بھی وہ دوسروں سے الگ لیتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ رعایت کرتے ہیں۔ ایک نئی بات یہ ہے کہ گا بکوں کو رسید بھی دیتے ہیں اور اسی کی پشت سے ہم نے اوپر کی شرائط نقل کی ہیں۔



لائڈری میں جانے کے بعد کپڑے پر کیا گزرتی ہے۔ اب تک یہ ایک راز سر بسجہ تھا لیکن ایک مغربی مصنف نے برسوں کی ریسرچ کے بعد کھوج لگا لی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ کپڑا سب سے پہلے گلانے کے شے میں جاتا ہے جہاں اسے گندھک کے تیزاب میں ڈبوایا جاتا ہے۔ دوسری مشین اس پر گوبر، تارکول اور مختلف رنگوں کے چھینٹے دیتی ہے۔ اس کے بعد کپڑا مشین گن روم میں جاتا ہے جہاں چھید ڈالنے کے لیے گولیوں کی باڑھ ماری جاتی ہے۔ اس کے بعد آرا مشین کا نمبر آتا ہے جس میں پھوسٹرے اڑائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ماہر فن کپڑے کے مٹن نوچتا ہے۔ چونکہ یہ ہاتھ کا کام ہے اور محنت چاہتا ہے لہذا دھلائی کے نرخ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔



ہمیں معلوم نہیں ہمارے ہاں یہ مشینیں رائج ہیں یا نہیں۔ اگرچہ ہمارے دھوبی ان کے بغیر بھی اپنے آزمودہ اور خاندانی نسخوں کی بہ دولت یکساں تسلی بخش نتائج پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن مشینوں سے کام جلدی اور آسان ہو جاتا ہے۔ دلایت کی لائڈریوں میں تو دوسری بار کپڑا لائڈری میں جائے تو اس میں بارود بھر کر اڑا دیتے ہیں اور damaged کا لیبل لگا کر واپس کر دیتے ہیں۔ ہم ابھی پسماندہ ہیں لیکن امید کرتے ہیں ”ترقی دھوبیاں کو اپریٹو سوسائٹی“ کی بہ دولت یہ پسماندگی بھی جلد دور ہو جائے گی۔

ع اپنے کپڑوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار



اگر میاں مجنوں یہ چنتری دیکھ لیتے
مطلوب کو مشتاق بنانے کی ترکیبیں
دلگیر چنتری میں سب کچھ موجود ہے

ع آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج۔ یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ بان لیتے
تھے کہ بہار آئی ہے۔ اب گل کھلیں گے دیوانے اپنے کپڑے پھاڑیں گے اور لڑکے
بالے دیوانوں کو پتھر ماریں گے۔ یہ رسم کچھ ایسی پکی ہو گئی کہ اگر کوئی پتھر نہ مارتا تھا تو
لوگ شکایت کرتے تھے۔

دیوانہ برا ہے زرد و طفلان برا ہے
یاراں! مگر ایں شہر شام سنگ نہ دارد

ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نئے سال کی آمد کی فال چنتریوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا
آغاز دُور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہور عالم، مفید عالم، چنتریاں دکانوں پر آن موجود ہوتی
ہیں۔ بعض لوگ چنتری نہیں خریدتے خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔ اپنی قسمت
کا سال اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ یعنی) کیسے معلوم کرتے

ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خرید لو اور دیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید، اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، وانگی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیائے کرام کی کرامتیں، لکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کے لیے موزوں ہے، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے اعضا پھرنے کے نتائج، کرہ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ گورنمنٹ میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوڑہ۔

بھڑکائے: وہ جو کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فاری

گفتہ خائب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ہم دلگیر جنتری (جیسی) کا ٹریڈ رے رہے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غیر جیسی جنتریاں تو بجز خار ہوں گی۔

عام لوگ تو اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آجائے۔ ایک باب اس میں ہے۔ ”کون سا دن کون سے کام کے لیے موزوں ہے۔“ نمونہ:

ہفتہ : سفر کرنے، بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے۔

اتوار : شادی کرنے، افسردہ سے ملاقات کرنے کے لیے۔

بدھ : نیا لباس پہننے، غسلِ صحت کے لیے۔

جمعرات : حجامت بخانے، دعوتِ احباب کے لیے۔

جمعہ : غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لیے۔

گویا ہفتے میں دو دن شادی کے لیے رکھے گئے ہیں۔ یہ قاعدے پڑانے ہیں۔ اب

صرف ایک شادی کرنے کا قانون ہے چاہے اتوار کو کیجیے، چاہے جمعے کو۔ مرتبین کو چاہیے اگلے ایڈیشن میں ترمیم کر لیں۔

غسل صرف جمعے کو واجب ہے اس لیے تو ہمارے بعض دوست فقط جمعے کے جمعے پنڈے پر پانی پڑنے دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ہر روز یا دوسرے چوتھے کپڑے بدلنے کی لت ہے۔ حالانکہ بدھ کے علاوہ کسی دن ایسا کرنا جائز نہیں۔ غسل صحت کے لیے بھی بدھ ہی کا دن ہے۔ لیکن غسل صحت کی شرائط پوری کرنے کے لیے بیمار کس دن پڑنا چاہیے۔ اس کی صراحت نہیں۔ ہفتہ بچوں کو اسکول داخلہ کرانے کا دن ہے لیکن قباحت یہ ہے کہ کراچی کے بہت سے اسکول ہفتے کو بند رہتے ہیں۔ یہ کسی اور روز بند ہونے چاہئیں تاکہ جنتری کے احکام پر عمل ہو سکے۔ اتوار کے متعلق بھی ذرا اور وضاحت چاہیے تھی کہ شادی کرنے کے بعد افسروں سے ملا جائے یا افراد سے ملنے کے بعد شادی کی جائے۔ ان نکات پر بھی آئندہ ایڈیشن میں تھوڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم رسی قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑی تنوع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بلند رتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکے کی اصل وجہ اب معلوم ہوتی من نہ کردم شامہذربکبید۔

گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے، دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب دکھو ر یہ کے گھوڑے سے نہیں، ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خیر دیکھنے سے مراد ہے سفر پیش آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیے۔ جلی کا پنجہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا دشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھیے موت قریب ہے (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالے لے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے

کا سرد کیکنے کا مطلب ہے عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا تو اس کی عقل جاتے رہنے میں کیا کلام ہے؟ خواب میں سردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے۔ درازی، عمر، خدا جانے یہاں عمر فانی سے مراد ہے یا عمر جادوانی سے ایک بات ظاہر ہے کہ انسان کو خواب سوچ سمجھ کے دیکھنے چاہئیں فقط ایسے کہ دشمن کا مال ملے یا بلند مرتبہ حاصل ہو۔ بے کار قسم کے خواب دیکھنا دانشمندی نہیں۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار شانہ راست، گوش سپ، انکشت چہارم، زبان، گلا، گردن بجانب سپ، ٹھوڑی، بغل راست وغیرہ ان پچاسی اعضا میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہئے۔ ان میں سے بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کر دیں تو فحاشی کی زد میں آجائیں۔ ایک دوا امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے۔ نگہ انتخاب کی پسلی پھڑک اٹھنا امتدادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل بائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے یہ جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

”محبت کے مارے کو چاہیے کہ ۱۲ مارچ کو بدقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف سُنہ کر کے نقش ذیل کو نام مطلوب بمع والدہ مطلوب اُتو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بدقت صبح ایک گھڑی ۲۵ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔“

نام مطلوب مع والدہ مطلوب اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات ہی نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر اُن کو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بہ وقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سایے میں آئے۔ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر حتمی نامی جو کتاب بہ قیمت چھ روپے شائع کی ہے اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

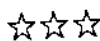
جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں۔ محبت میں اتنا کشٹ نہیں اٹھا سکتے ان کے لیے مرتب جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیے ہیں جن کی بہ دولت محبوب قدموں پر تو آ کر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے پالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیے۔ اور پالیس دن تک یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگا لیا ہے۔ ازراہ کفایت آدھے تو لے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤں دزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جاسکتا ہے۔ بھارت میں تو لوگ دس سیر آٹے کے لیے محبوب کو بھی دریا میں ڈال دینے پر تیار ہو جائیں گے لیکن ہمارے ہاں یہ عمل چنداں دشوار نہیں۔ البتہ جو حضرات اس میں بھی خست کریں اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ”جب بھی محبوب سامنے آئے۔ آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمد، دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں، اس طرح کہ منہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔“

سندہ میں مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی۔“

یہ عمل بہ ظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں اول تو محبوب کو اپنی دیر
سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور دو بھاگے نہیں،
اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے پھر آپ پھونکیں ماریں گے اس کی بنا پر محبوب کیا رائے قائم کرے
گا۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے
”محبت کا سرمہ“ استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا
جادو بھی حائلگیر ہے۔ یہی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے
کہ یہ سرمہ ڈال کر ”جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا۔“

یہ سرمہ بنانے کے لیے ساجت مند کو ۱۹ فردری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روز وہ بہ
وقت طلوع آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمگادڑ کا خون ملائے اور اس
سے یہ نقش بہ وقت صبح ایک گھڑی ۱۵ اہل بعد طلوع آفتاب لکھے اور اس پر سورہ فلق
گیارہ سو بار پڑھے پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تل کا تیل) ڈال کر جلانے اور اس
کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے۔ ایک صاحب نے یہ سرمہ وینالہ وار لگایا تھا اتنا ہم نے
بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹل اور مچھلی مارنے اور
مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر
شکایت کرتے ہیں کہ اردو میں کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں، معلومات کی کتاب نہیں۔
انسائیکلو پیڈیا اور کیا ہوتی ہے۔ ادب شرط ہے منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلو پیڈیا
برٹینیکا وغیرہ دیکھی ہیں۔ الم غلم مضامین کا طومار ہیں۔ اہل دل کے مطلب کی ایک
بات بھی نہیں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے۔ اپنے ہاں
کے مرنے کو بھی مٹی گردانیں گے۔



ان دنوں ہم ٹیکس وینے میں مصروف ہیں میر تقی میر کا انتقال کب ہوا؟

ہمارے دوست فرہاد زیدی بہت دن سے تقاضا کر رہے تھے کہ مضمون دو مضمون دو۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مضمون لکھنا کوئی جوئے شیر لانا نہیں ہے کہ جھٹ سے پہاڑ کا نانا اور لے آئے۔ اس کے لیے بڑی کا دکا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دنوں ہم عدیم الفرصت بھی تھے۔

جب اس عدیم الفرصتی کی یہ ہے کہ آج کل ہم ٹیکس دے رہے ہیں۔ ٹیکس ہم پہلے بھی دیتے تھے۔ لیکن اسے کل وقتی کام کا درجہ حاصل نہ تھا۔ آغاز اس سلسلے کا کوئی دو ہفتے ادھر ہوا۔ صبح صبح ایک انسپکٹر تشریف لائے۔ فرمایا۔ ”آپ نے ٹیکس دیا۔“
”کون سا ٹیکس۔“ ہم نے دریافت کیا۔
”انکم ٹیکس۔“

”کون سی انکم؟“ ہم نے پوچھا۔

اس پر وہ لا جواب ہو گئے۔ آخر یہ طے ہوا کہ جب انکم ہوگی تو انشا، اللہ ٹیکس بھی ضرور دیں گے۔ اس دن سے ہم اس کوشش میں ہیں کہ کوئی انکم نہ ہو جائے۔ در نہ ٹیکس دینا

پڑے گا۔ جو صاحبانِ انکم ٹیکس والوں کے ہاتھوں پریشان رہتے ہیں، انہیں یہ نسخہ آزمانا چاہیے۔



دوسرے دن ایک صاحب تشریف لائے کہ ہاؤس ٹیکس عنایت ہو۔
ہم نے کہا۔ ”کس مکان کا ٹیکس۔“

”اس مکان کا جس میں آپ رہتے ہیں۔“
”یہ تو میرا مکان ہے۔“ ہم نے کہا۔

”کون سے میر کا۔“

”میر تقی میر کا۔“

”تو ان کو بلوائیے۔“

”ان کا تو انتقال ہو چکا۔“

”چچ (افسوس کرتے ہوئے بولے) کب ہوا۔“

”سن وفات میں اختلاف ہے۔ رام بابو سکسینہ کچھ کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کچھ۔
اب تو یہ دونوں صاحبان بھی انتقال کر گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم دکاندار تو نہیں۔ کچھ بھی نہیں بیچتے۔ بکری کا کیا کام۔“
بولے۔ ”کچھ تو ضرور بیچتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ول بیچتے ہیں لیکن اسے آج کل تو کوئی مفت بھی نہیں پوچھتا۔“
فرمایا۔ ”دل و جان کی خرید و فروخت سے ہمیں مطلب نہیں۔ کچھ اور آپ نے بیچا ہوگا۔ یاد کیجیے۔“

”م نے بہت غور کر کے بتایا کہ ”دسمبر میں ڈیڑھ روپے کی اخبار کی روی بیچی تھی۔“
فوراً رجسٹر کھول کر بیٹھ گئے۔ ”بولے۔ لائیے آٹھ آنے۔“



ان کے بعد روڈ ٹیکس والے آئے۔ ہم نے کہا۔ ”ہمارے پاس موٹر ہی نہیں ہے۔“ ٹیکس کیا۔ بولے۔

”آپ خود بھی تو روڈ پر چلتے ہوں گے۔ اس سے بھی سڑک ٹھسٹی ہے۔ ہم نے کہا کہ ایک زمانے میں چلتے تھے۔ لیکن جب سے ہماری باؤی کا ماڈل پرانا ہوا ہے اور معدے کے گیر بکس نے کام بند کیا ہے بس گیر راج میں، بھی گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دفتر ہوا آتے ہیں۔“

”وہ کیسے جاتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”ایک کریں ہے۔ وہ ہمیں اٹھا کر بس کی سیٹ پر رکھ دیتی ہے۔ دوسری بس میں سے اٹھا کر دفتر کی کرسی پر بٹھا دیتی ہے۔ ہمارا دفتر دوسری منزل پر ہے۔“

فرمایا۔ ”بہت ہشیار معلوم ہوتے ہیں آپ۔ اگر کبھی سڑک پر چلتے پکڑے گئے تو اگلا پچھلا سب وصول کر لیا جائے گا۔“



خدا جانے یہ خبر کیسے مشہور ہو گئی کہ یہاں ایک شخص ٹیکس دہندہ رہتا ہے۔ ایک صاحب تو بہ ظاہر چادریں لٹکایا بیچنے والے کا بھیس بنا کر آئے۔ سائیکل کے پیچھے دکھاوے کو ایک گھڑ بھی رکھا تھا۔ ہم نے کہا۔ ”کیا ہے؟“

بولے۔ ”گل ٹیکس بھی ہے۔ نور ٹیکس بھی ہے۔ کریم ٹیکس بھی ہے۔ پیسے نکال لیے۔“

ہم نے کہا۔ بھاگ جاؤ اسی دقت ورنہ کتا چھوڑ دوں گا۔



ایک جگہ ہم نے روزے بخشوانے کی کوشش کی تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ ایک بزرگوار کے ڈی اے کی طرف سے آئے تھے اور گراؤنڈ ٹیکس کا مطالبہ کیا۔

ہم نے کہا۔ ”کس گراؤنڈ کانٹیکس۔ یہ گراؤنڈ تو جناح کالج والوں کا ہے۔ انہی کے طالب علم یہاں لگی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ ہم نہیں کھیلتے۔“
 کہنے لگے۔ اس کی بات نہیں کر رہا۔ اس زمین کانٹیکس چاہیے جس پر آپ کا مکان ہے۔

ہم نے کہا کہ ہم فقط مکان استعمال کر رہے ہیں۔ زمین آپ لے جائیے۔ یہ ہمارے کام کی نہیں۔ عادت سے مجبور ہم نے اقبال کا شعر پڑھ دیا۔ الارض للہ۔

وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
 تیرے آبا کی نہیں تیرلی نہیں میری نہیں
 اس پردہ اور شیر ہوئے۔ بولے گراؤنڈ کانٹیکس تو اپنی جگہ۔ اقبال کا شعر پڑھنے کانٹیکس بھی دیتے۔ آپ کو معلوم نہیں ان دنوں نے نئے کانٹیکس لگے ہیں۔ اقبال کے شعر پر پچیس پیسے کسی اور کا ہو تو پندرہ پیسے۔ اپنے شعر پر البتہ رعایت ہے۔ صرف دس پیسے فی شعر۔

یہ آخری مصیبت اپنے سر لانے میں کچھ ہمارا بھی دخل ہے۔ ایک زمانے میں ہم نے تجویز کیا تھا کہ اقبال کا شعر پڑھنے پر کانٹیکس عاید کر دیا جائے تو اس کی آمدنی سے علامہ مرحوم کا مقبرہ بن سکتا ہے۔ شروع شروع میں لوگ گھبرائیں گے۔ لیکن پھر عادی ہو جائیں گے۔ جس طرح مبینے کے مبینے نائی اور دھوبی کا خرچ برداشت کیا جاتا ہے۔ اس طرح بجٹ میں اقبال کے شعر پڑھنے کے لیے بھی چند روپوں کی گنجائش رکھی جاسکتی ہے۔ پولیس والوں کو ہدایت کر دی جائے کہ جوں ہی کوئی شخص میرے کا سر مہ یا مولیٰ کا نمک بیچنے کے لیے ہانک لگائے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
 یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تو اس سے وہیں چار آنے رکھوائے۔ رکشا کی پشت یا بیکری کی دیوار پر، یا بس کے اندر ”اللہ کے بندوں کو آتی نہیں رو بای“ کا یہ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر۔“ ”مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔“ وغیرہ لکھوانے والوں سے سالانہ فیس لی جائے۔ سب سے زیادہ آمدنی بے شک زید پوہی سے ہوگی۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ علامہ مرحوم اتنے شعر نہ لکھ گئے ہوتے تو ریڈیو والے اپنے موضوعات کے عنوان کہاں سے لاتے۔ تو الیاں کس کی گواتے اور چھپے ہوئے پروگراموں کی جگہ کیا پڑھواتے۔ تو الی میں تو شعر پڑھنے پر چوٹی اور اس کی تکرار کرنے پر (ایک شعر کی تکرار سترہ اٹھارہ بار ہوتی ہے) دو پیسے لیے جائیں۔

جن شعروں کی مانگ زیادہ ہے۔ ان کا نرخ زیادہ اونچا بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ایکشنوں اور سیاسی جلسوں میں لوگ دیگوں جھنڈیوں وغیرہ پر اتنا خرچ کرتے ہیں تو کیا اقبال کے شعروں پر نہیں کر سکتے۔ ایسا ہو جانے پر جلسوں کا بجٹ کچھ اس قسم کا ہوا کرے گا۔

دریاں بچھوانے کا خرچ ۲۵ روپے

حاضرین کو بلوانے کا خرچ ۴۰ روپے

صاحب صدر کے لیے گل دان، اگال دان اور پان ۵ روپے

گیس جتی، مائیکروفون وغیرہ ۵۰ روپے

مولوی صاحب سے تلاوت قرآن مجید کرانے کے ۵ روپے

اقبال کے شعر پڑھنے کا ٹیکس ۳۵ روپے

کسی کو جلسے کی تعریف کرنی ہوئی تو کہا کرے گا۔ تنظیم مہاجرین کے جلسے کی کیا پوچھتے ہو صاحب۔ ساٹھ روپے کے تو دہاں شعر ہی پڑھے گئے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ چھوٹی مدیں ہیں۔ مثلاً اقبال کے شعروں سے تاریکیوں نکالنا

(دوروپے فی تاریخ) انہیں مزاروں اور محرابوں پر لکھوانا (پانچ روپے) وغیرہ۔

☆☆☆

آمدنی کے علاوہ اس ٹیکس کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ اٹھتے بیٹھتے کھانتے چھینکتے سوتے جاگتے اشعار کے بے تحاشا استعمال سے احتراز کریں گے۔ ہم تو کہیں گے کہ ٹیکس بھی ہو۔ اور پابندی بھی ہو۔ یعنی راشن کر دیا جائے۔

بالغ آدمی فی ہفتہ = دس شعر

چھوٹا بچہ = پانچ شعر

شیر خوار بچہ = دو شعر

جب طبیعت کلبلائی راشن کی دکان پر گئے، اپنے حصے کا کوٹا لیا اور استعمال کیا۔ البتہ بیاہ شادی، موت، ختنہ، بسم اللہ، روزہ کشائی، مولود و شریف وغیرہ کے لیے اسپیشل کوٹے کا سسٹم رائج کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے شعروں کے ساتھ یہ پابندی بھی ضروری ہے کہ ان کے نیچے علامہ مرحوم کا نام لکھا جائے۔ ورنہ بسوں اور رکشوں میں ان کا استعمال ایسا حام ہوا ہے کہ لوگ حسب ذیل کلام کو بھی علامہ مرحوم ہی سے منسوب کرنے لگے ہیں۔

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیے

جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اترنا چاہیے

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

سچائی چھپ نہیں سکتی بھاوٹ کے اسولوں سے

کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کانڈ کے مٹھلوں سے

اور اس قسم کے مصرعوں کو بھی ہارن دے کر پاس کریں (فعلن فعلن فعلن)۔

☆☆☆

طریقہ محفل میں بات کرنے کا

..... اور عزیز جہاں ہونے کا

محفل میں اجنبیوں سے کیسے بات کی جائے۔ ہمسایوں پر خوش اخلاقی کا کیسے سکہ جمایا جائے۔ اس کے گریا تو بخشد خدائے بخشندہ ورنہ ذلیل کاریگی کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور کسپ کمال کر کے عزیز جہاں ہونے کی کوشش کیجئے۔ مختصر لفظوں میں مقبولیت کا نسخہ زریں یہ ہے کہ مخاطب کے ڈھب اور دلچسپی کی بات کرو۔ اپنے ذوق یا دلچسپی سے علاقہ مت رکھو۔

شروع میں ہمیں یعنی یہ بھید معلوم نہ تھا۔ ہمارے محلے میں سامنے کے گھر میں غلے اور تیل کے بیجوں کے مشہور آڑھتی ردپیہ بھائی پیسا بھائی جام نگر والے رہتے تھے۔ ہم جب اس مکان میں آئے تو انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کی بی بی یعنی محلے میں ہمارے گھر والوں ہی کو پسند کرتی تھیں اور جب کبھی دونی چونی مانگنی ہو یا گھر میں کچی تیل ختم ہو یا سلائی کی مشین چاہیے ہو تو ہمیں سے رجوع کرتی تھیں۔ ہم یعنی سیٹھ صاحب کی خوشنودی کے لئے اپنی سی ہر کوشش کرتے تھے۔ پہلی اتوار آئی تو ان کو دو غز لیں سنائیں، دوسرے اتوار ایک قصیدہ گوش گزار کیا، تیسرے اتوار ہم نے

ان کے لئے ایک طویل مختصر افسانہ تیار کر رکھا تھا جو ایک طرح سے نفسیاتی تحلیل کا شاہکار تھا لیکن سیٹھ صاحب نہ آئے۔ آخر ہم ان کے گھر جا کر سنا کر آئے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے ہاں آنا بند کر دیا بلکہ ہم جیب میں اپنے ایک عزیز کی شادی کا سہرا رکھ کر ان سے ملنے گئے تو انہوں نے اندر سے کہلوادیا کہ نہیں ہیں سیٹھ صاحب..... لاڑکانہ گئے ہیں۔

کچھ اسی قسم کی واردات ہمارے دوسرے پڑوسی کے ساتھ ہوئی۔ وہ ٹریکٹروں کی ایک کمپنی میں کیمیکل انجینئر ہیں یا شاید فورمین ہیں۔ معلوم ہوا جالندھر کے ہیں جس کو علمی ادبی ذوق کی بنا پر شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ اسی رعایت سے ہم نے علیک سلیک کے بعد پہلے تو جالندھر کے ہندوستان میں رہ جانے پر ان سے تعزیت کی۔ اس کے بعد اپنا تازہ فارسی کلام سنایا۔ ہمارے تعلقات میں سرد مہری تو اسی روز آ گئی۔ لیکن دوسری بار جو ہم نے اقبال کے فلسفہ خودی کے ماخذ پر بحث چھیڑی تو جانے کیا ہوا کہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور پھر سڑک پر ملتے بھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر ہو لیتے۔ ہم نے اپنے اقبال پرست دوستوں سے پوچھا بھی کہ یار فلسفہ خودی میں ایسی کیا بات ہے لیکن کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہم نے ذیل کاریگی کی کتا ہیں پڑھیں۔



یہ قباحات، موضوعات گفتگو کی، اصل میں ہم مردوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ خواتین میں تو اسیر ہوں یا غریب۔ پی ایچ ڈی یا ان پڑھ، پنجابی کہ کوئی۔ گفتگو کے بندھے نکلے اصول آداب اور موضوعات ہیں۔

اے، بہن یہ ٹیکا بہت خوبصورت ہے کتنے کا بنا؟
اے آپا، یہ کپڑا کتنے کا ہے، لنڈنی کو تل سے منگایا ہوگا۔
ماشاء اللہ کتنے بچے ہو گئے۔

آپ بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہیں۔

یہ نیل پالش کون سی ہے باجی۔

اری رضیہ تم نے 'مسٹر اللہ دتہ' دیکھی۔ اس میں نیلو کا کام پسند آیا؟

ہائے اللہ کتنے اچھے سیلر ہیں کہاں سے لیے۔

کاش مردوں میں کچھ اسی قسم کی مفاہمت ہوتی۔ اب تک تو بالعموم ہی دیکھا کہ دو بھلے مانسوں میں تعارف ہوا اور وہ مزاج شریف کہہ کر رہ گئے۔ پھر سگریٹ پینے لگے وہ بھی یوں کہ یہ اپنا دھواں مشرق کی طرف منہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ وہ مغرب کی طرف۔ اس کے بعد اخبار دیکھنے لگے۔ یہ بھی ہو چکا اور خاموشی زیادہ ہی ناگوار معلوم ہوئی تو ذہن پر زور ڈال کر کوئی سوال سوچا۔

آپ کہاں کام کرتے ہیں؟

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں۔

یہی سڑکیں کھودنے والا حکمہ ہے۔

جی ہاں۔

پھر طویل خاموشی، یہ کم آمیزی اور کم گوئی مشرقی نہیں بلکہ انگریزی اثر کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی تباہ شدہ جہاز سے جان بچا کر دو انگریز کسی خالی جزیرے میں جا نکلیں تب بھی ایک دوسرے سے کلام نہ کریں گے تا آنکہ باقاعدہ تعارف کی رسم ادا نہ ہو جائے۔ وہاں کی ریل گاڑیوں میں بھی جس کو دیکھیے اچی جگہ دوسرے سے بے تعلق اور بیزار بیٹھا ہے۔ آنکھیں نہیں ملاتا۔ ہمسایے کے اخبار کے بیچ کے درق نہیں کھینچتا۔ اس سے بال بچوں کی تعداد نام اور پتے نہیں پوچھتا۔ اپنے نہیں بتاتا۔ ہم نے یہ کیفیت دیکھی تو وطن عزیز بہت یاد آیا جہاں کراچی سے ٹنڈو آدم تک دو بھلے مانس جا کیں تو ایک دوسرے کے شجرہ نسب سے مکاحقہ آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ باہم رشتے بھی

طے پا جاتے ہیں۔

تقریب اس ساری تمہید کی یہ ہے کہ کل رات مسز جمیل نے جو ہماری بھابی ہیں اپنی ایک سہیلی کو کھانے پر بلایا۔ ساتھ ان کے میاں کو بھی۔ خاتون تو آرٹسٹ ہیں لیکن میاں ان کے تاجر اور زمیندار قسم کے آدمی ہیں۔ مظفر گڑھ میں ان کی ایک شوگر مل ہے، مرید کے میں کھالوں کی رنگائی کا کارخانہ ہے، ملتان میں ولائتی کھاد کی سول انجینسی ہے اور اس کے علاوہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔ گویا جامع حیثیات بزرگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے دوست میاں جمیل نے شاعر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کے میاں کوئی شاعر واعر ہیں کیا؟

”نہیں۔“

”فلسفے سے ذوق ہے۔“

”خدا نخواستہ۔“

”تاریخ، علم الکلام اور سیاست مدن میں ورک ہے۔“

”تاریخ...؟ میرے خیال میں جیسی صاف تاریخ بغیر تعمیے اور تجربے کے تم کہتے ہو ویسی وہ نہیں کہہ سکتے۔ ابوالکلام کو بھی اگر پڑھا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ مدن بھائی کو وہ نہیں جانتے۔ باقی رہی سیاست تو کیا معنی اپنی تحصیل کے چوٹی کے سیاست دان ہیں۔ میں نے بتایا نہیں کہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔“

اس پر جمیل میاں نے کہا۔ ”پھر تو بھاگوان تم ہی ان سے گفتگو کرنا مجھے تو رات کو مشاعرے میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انشا صاحب کو بلاؤ وہ ہر قسم کی گفتگو پر قادر ہیں۔“

ہماری بھابی نے کھانے کا تکلف بہت کیا تھا۔ ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ مہمانوں سے تعارف بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد بھابی تو اپنی آرٹسٹ سہیلی کو ایک طرف لے گئیں اور ان

کے جھمکوں کی تعریف سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہم مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ہم نے قیافے سے دریافت کیا کہ ہماری دہنی طرف جو بزرگ لائبریری مونیچوں والے بیٹھے ہیں، یہی چودھری خیر دین جنجوعہ ہیں ان کی سہیلی کے میاں۔ ان کا تفصیلی تعارف بھابی نے فون ہی پر کروایا تھا۔ لہذا ہم نے چھوٹے ہی پوچھا۔

☆☆

”اب کے گنے کی فصل تو آپ کے ہاں خوب ہوئی۔“

وہ بھونچکے سے ہو کر بولے۔ ”ہی؟ کیا فرمایا۔“

ہم نے دوسرا سوال داغا۔

”البتہ کھالوں پر جنگ کی وجہ سے اثر پڑا ہوگا؟“

اس پر وہ چپ رہے۔ ہم نے جانا کہ اپنے تجارتی بھید کو بھید ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

لہذا موضوع نمبر ۳ لیا۔

”شلمجھوں کے لیے کون سی دلائی کھاد موزوں رہتی ہے۔ ہم نے اپنے لان میں شلمجھ

بولے ہیں۔“

اس گفتگو کی بھٹک بھابی کے کان میں پڑی تو وہ بھاگی آئیں بولیں۔

”یہ آپ کن سے بات کر رہے ہیں۔ یہ تو مشہور مرثیہ نگار شعلہ بناری ہیں، میرے

بھانجے کے ہمزلف۔ یہ دوسرے میرے تایا زاد بھائی کرنل حبیب اللہ ہیں اور یہ میری

سہیلی کے میاں چودھری خیر... ارے یہ تو سو گئے۔ ابھی انھیں گے تو ان سے بات

کرنا۔“

اس روز کی محفل میں چودھری خیر دین کے خراٹوں کی گونج میں ہم نے دو غزلیں

شعلہ صاحب کو سنائیں اور تین قصیدے اور ایک شہر آشوب سے انہوں نے یہ قرض

اتارا یہ کرنل صاحب کو ہم نے کچھ دیر بکتر بند گاڑیوں کے اسرار و رموز میں الجھایا۔ اس

کے بعد ان کا ہاتھ دیکھ کر ان کے گھوڑے کے اگلی ریس جیتنے کی خوشخبری دی۔ اور جب چودھری خیر دین جنجوعہ استراحت سے فارغ ہوئے تو سلسلہ کلام کو یوں مربوط کیا کہ ولایتی کھاد سے غیشکر کی اقسام جدید تک آتے اور بی ڈی کے تازہ ترین الیکشنوں سے بدیں عنوان گریز کیا کہ رشوت خوری اور بدعنوانی کرنے والوں کی کھال میں بھس بھروادینا چاہیے یہاں سے سلسلہ گفتگو چودھری صاحب کے ہاتھ میں آیا اور پہلے تو انہوں نے کھالوں کے مسئلے پر تقریر کی پھر بھس کی کمیابی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں کچھ ذکر افریقہ اور مشرق وسطے کے حالیہ انقلابوں اور دیت نام کا بھی ہوا۔ گفتگو کے خاتمے تک وہ ہمیں اپنے ہاں کی کھانڈ کی ایک بوری ریو یو کے لیے بھجوانے کا وعدہ کر چکے تھے اور کھالوں کی رنگائی کے سلسلے میں ہم ان کا مشیر اعزازی بننے کی ہامی بھر چکے تھے۔



یہاں ہم گزارش کریں کہ اس تحریر کو خود ستانی پر محمول نہ کیا جائے۔ من آنم کہ من دامن جس طرح پرانے زمانے میں علوم مجلسی میں یہ شامل تھا کہ ہر شریف زاوے کو ہزار دو ہزار اشعار اساتذہ کے ازبر ہونے چاہئیں۔ کچھ اسی قسم کی یہ سائنس ہے۔ من صاحبوں کو مزید معلومات درکار ہوں ہمارے ادارہ علوم مجلسی (رجسٹرڈ) میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ دس روپے کا سلی آرڈر آنے پر پراسپیکٹس مفت بھیجا جاتا ہے۔

اخبار میں آیا ہے کہ فرانس میں بالوں کے فیشن کی ایک نمائش کا افتتاح چوٹی کاٹ کر کیا گیا۔ چوٹی کاٹنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کئی سال ہوئے لاہور میں ایک صاحب ہر وقت قیچی لیے بازار میں کھڑے رہتے تھے۔ جو بی بی اُن کو بے پردہ نظر آتیں یا جن کا لباس ان کی پسند کے مطابق نہ ہوتا۔ اس کی چوٹی کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ لیکن فرانس کی اس نمائش میں شریک ہونے والوں کی چوٹیاں نہیں کاٹی گئیں بلکہ مختلف رنگوں کے

بالوں کی ایک چوٹی گوندھ کر صدر دروازے کے آر پار تان دی گئی تھی۔ اسی کو کاٹا گیا اور کاٹنے والے کوئی مولانا نہیں تھے۔ ایک صاحب نے خود قینچی چلائی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایک تقریر دل پذیر سے بھی حاضرین کو نوازا۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ لوگ کبھی ان کی قینچی کی طرف دیکھتے اور کبھی ان کی زبان کی طرف کہ اُدھر جاتا ہے یا اُدھر آتا ہے۔

خوشی ہمیں اس بات کی ہوئی کہ افتتاح جیسی رسمی رسم میں بھی کوئی پہلو جدت کا نکلا۔ ورنہ تو عام انداز افتتاح کا یہ ہے کہ پچھلے دنوں اس شہر میں دودھ دہی اور مٹھائی کی ایک دکان ”جوئے شیر“ کا افتتاح ہوا۔ ایک مولانا نے تقریر کی اور حوالوں سے بتایا کہ ہمارے بزرگان دین شیرینی بہت پسند فرماتے تھے۔ جب سے لوگوں نے ان کی تقلید سے انحراف کیا ہے ملت پر زوال آ گیا ہے۔ اس کے بعد دعا کی کہ رب العزت اس کاروبار میں برکت دے۔ حاضرین نے اتفاق رائے سے ایک ریزدلیوشن بھی پاس کیا کہ چربی کی درآمد پر سے پابندیاں اٹھائی جائیں اور کارپوریشن کے احتسابی عملے کو سخت گیری سے روکا جائے۔ ازاں بعد حسب حاضرین کو ایک ایک ن ذمہ دیا گیا جس میں دودھ دلدو تھے اور دودھ دامتیاں تھیں۔

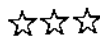
ایک اور مثال لیجیے۔

ابھی چند دن پہلے ہمارے محلے میں فیض عام ٹائٹ کالج کا افتتاح ہوا تو بس فیتہ کٹنا اور وعائے خیر پر بات ختم ہو گئی۔ یہ سچ ہے کہ بعد میں جوتیوں میں دال بی لیکن فقط منتظمین کے درمیان۔ شرکائے افتتاح اس سے بھی محروم رہے۔ اسی طرح پاپوش نگر میں گزشتہ ماہ بان کی چار پائیوں کی ایک دکان کا افتتاح ہوا۔ ہمارا خیال تھا کہ شریک ہونے والوں کو یا کم از کم ہم اخباری نمائندوں کو ایک ایک چار پائی تحفہ پیش کی جائے گی لیکن چار پائی ایک طرف منتظمین سے یہ بھی نہ ہوا کہ ایک ایک رسی ادوائن کی تقسیم

کر دیتے۔

بس ایک مولانا نے پہلے دعوٰی کیا کہ اے مسلمانوں! اجل التین کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اسی کے بعد دوسری رستیوں کا ذکر درمیان میں لائے۔ چارپائی کی رعایت سے، انہوں نے شیخ سعدی کے قطعہ ”شاید کہ پلنگ خفتہ باشد“ کی تشریح بھی کی اور شیخ سعدی کی زبان (حالیہ الرحمۃ) سے کرتے ہوئے کہا کہ اصل مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ ”شاید کہ بر پلنگ خفتہ باشد“ اپنے وسیع مطالعہ سے وہ فارسی ادب میں سے اور بھی مثالیں لائے مثلاً ”چارپائی بروکتا بے چند“ پھر ایک خوش الحان صاحبزادے نے غالب کی غزل پڑھی ہے لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں۔

لیکن یہ نہ بتایا کہ دوسرا کس چیز کا ہوتا تھا۔ اُس کے بعد دعائے خیر پر تقریب ختم۔ اس قسم کے جلسے ہونے لگے تو لوگ آئندہ افتتاح کی تقریبوں میں شریک ہونا ترک کر دیں گے۔



شرط انصاف یہ ہے کہ جس چیز کا افتتاح ہو اس سے شرکائے محفل کو متمتع ہونے کا موقع ضرور دیا جائے۔ اگر جہز اسٹور ہے تو کنگھیوں، پوڈر، کریموں، مچھر دانیوں وغیرہ سے تواضع کی جائے۔ اگر قصاب کی دکان ہے تو سب کو آدھ آدھ سیر گوشت یا قیمر و مال میں باندھ کر دیا جائے۔ ہیر کٹنگ سیلون ہو تو حاضرین کا سر مونڈا جائے اور چچی کی جائے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ صاحب توفیق لوگ کرتے ہی ہیں۔ ہم نے بندر روڈ پر ایک سینما کا افتتاح ہوتے دیکھا ہے۔ سب لوگوں کو مفت فلم دکھائی گئی تھی اور بغدادی محلے میں ایک نئے تھانے کی رسم افتتاح یوں ادا کی گئی کہ رسم میں شریک ہونے والے سبھی صاحبوں کو ایک رات حوالات میں رکھا گیا اور دوسرے روز ضمانتوں پر رہا کیا گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس افتتاح میں شریک نہ ہو سکے۔ جو

لوگ ہوئے ان کا بیان ہے کہ اچھی آرام دہ حوالات بنائی گئی ہے۔ انتہا کی رسم ادیبوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ کوئی شخص رسالہ نکالتا ہے تو میر ہٹل میں لوگوں کو چائے پلا کر پرچے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ کسی کا دیوان چھپتا ہے تو اسے بھی دعوت کی سوچتی ہے تاکہ حاضرین میں ایک ایک نسخہ اپنی کتاب کا پیش کر کے پہلا ایڈیشن ختم کر سکے۔ یہ متعدی بیماری غریب غرباء تک بھی پہنچ گئی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے جس کے پاس فالٹو وقت بہت ہے، پچھلے دنوں برنس روڈ پر گنڈیریوں کی ایک ریڑھی لگائی تو ہمیں اور اپنے سب دوستوں کو بلایا۔ ایک صاحب نے اس موقع پر گنڈیریوں کی تعریف میں فسانہ آزاد میں سے خوبی کے اشعار خوش الحانی سے پڑھے اور دوسرے صاحب نے خود اپنے شعر پڑھے بلکہ اس مصرع سے تارتخ بھی نکالی۔

ہائے کیا خوش مزا گنڈیری ہے
بعد ازاں حاضرین کو ایک ایک گنڈیری تحفہ پیش کی گئی۔



تبصرے کے لیے سالن کی دو پتیلیاں آنی ضروری ہیں

جناب مطبخ مراد آبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بہ غرض ریویو آئی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے پیٹکنوں کی پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی، پیٹکن بھی۔ قلت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ پیٹکنوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرم فرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم ہونی چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ اس میں کوئلے ڈال دیئے جائیں۔ چولہے میں نہیں سالن میں۔ بعد ازاں نکال کر کھائیے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ کوئلے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کوئلے نوش جان کیے جائیں۔

ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزمائی جاسکتی ہیں۔ اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لیے ایک چرخی، ایک کتے، ایک ڈھول اور ایک ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرد کے زمانے سے آرمودہ چلا آتا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرنے کو کیسے جلاتے ہوں گے۔ ٹیڑھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے تاکہ حلق میں پھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً بادام کا حلوہ یوں بنایا جاسکتا ہے کہ حلوہ لیجیے اور اس میں بادام چھیل کر ملا دیجئے۔ بادام کا حلوہ تیار ہے۔ بینگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے کہ بینگن لیجیے۔ اور بہ طریقہ معروف اچار ڈال لیجئے۔ حلوہ بے دودھ، سنہوسہ میسن اور تھالی کے بینگن وغیرہ کی ترکیبیں بھی آسان ہیں لیکن انہیں ہم بہ خوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ شائقین اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

ہم نے خود مکمل باورچی خانے کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے، وہ ہے ردٹی پکانے کی۔ قارئین کرام بھی اسے آزمائیں اور لطف اٹھائیں۔

سب سے پہلے راشن کارڈ بنوائیے۔ اس کے بعد اسے بھول جائیں۔ کیونکہ اب آٹا اس کے بغیر مل جاتا ہے۔ آٹا آگیا تو اس میں پانی ڈالیے۔ اب اسے گوندھیے۔ گندھ گیا؟ شاباش۔ اب چولہے کے پاس، اکڑ دل بیٹھیے۔ اور دھوئیں سے بچنے کے لیے چہرے پر گیس ماسک چڑھا لیجئے۔ خوب۔ اب پیڑا بنائیے۔ اگر آپ کا دطن لکھو رہا ہے تو دودھ تو لے گا۔ اور بنوں کو دطن ہونے کا فخر حاصل ہے تو سیر سوا سیر کا۔ اب اسے کسی ترکیب سے چپٹا اور گول کر کے توے پر ڈال دیجیے۔ اسی کا نام ردٹی ہے اگر یہ کچی رہ جائے تو ٹھیک در نہ کوکلوں پر ڈال دیجئے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اٹھا کر رہ مال

سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجیے اور نوکر کے ذریعے تنور سے پکی پکائی دد روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھائیے بڑی مزیدار معلوم ہوگی۔

مصنف نے شجرہ نسب بھی دیا ہے۔ ان کا تعلق دود پنازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دیگیں پکانے کے لیے بھی، سہرا کہنے کے لیے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنف نے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ جس سے دونوں خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بادرچی خانہ کا بادرچی خانہ۔ دیوان کا دیوان۔

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان:- آلو، چھری، پلیٹ، نادل، ڈیٹول، پٹی۔

آلو لیجئے، اسے چھری سے چھیلے۔ جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے۔ ان کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جائیے۔ بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو، یہ عمل بالعموم یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اخبار خواتین کی اکثر قارئین پڑھی لکھی ہیں لہذا آلو چھیلنے میں ابن صفی کے ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گے۔ ڈیٹول انہی کے لیے ہے۔ جہاں چرکا لگا ڈیٹول میں انگلی ڈبوئی اور پٹی باندھ لی۔ ہمارے تجربے کے مطابق ڈیٹول کی ایک چھوٹی شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جاسکتے ہیں۔ بعض جزارس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں۔ جن بہنوں کو ڈیٹول پسند نہ ہو وہ سیولان یا ایسی ہی کوئی اور دوا استعمال کر سکتی ہیں۔ نتیجہ یکساں رہے گا۔

شاہی بریانی

بریانی اور شاہی بریانی کی ترکیبیں اخباروں اور رسالوں میں اکثر چھپتی رہتی ہیں لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ان میں طول العمل بہت ہوتا ہے اور اکثر گڑھستن یہیاں اسی لیے ان کو پسند نہیں کرتیں۔ ہمارا نسخہ بہت مختصر اور آسان ہے۔ اس کے لیے فقط ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

۱۔ دونٹ دس دس روپے کے (پانچ پانچ اور ایک ایک کے ہوں تب بھی کام چل جائے گا)۔

۲۔ ایک بادرچی مشاق، بہتر ہے دلی والا ہو۔

۳۔ ایک خالی ڈونگا۔

بادرچی سے کہیے کہ میاں یہ لو پیسے اور جو کچھ لانا ہے لاؤ لیکن ہمیں بریانی کھلاؤ۔ چند گھنٹوں کے اندر لا جواب بریانی تیار ہوگی۔ خالی ڈونگا بازار سے سالن منگنے کے لیے ہے کیونکہ بعض لوگ بریانی میں سالن بھی ڈالتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بیس روپے میں آپ اور بادرچی دونوں پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ چادل، گھی، مرچ مسالے آپ اپنے پاس سے دیں۔ کھا چکیں تو بادرچی کو انعام دے کر رخصت کیجیے اور اطمینان سے بیٹھ کر برتن دھویئے۔

حلوہ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ حلوہ پکائیے اور اس میں دودھ نہ ڈالیے۔ نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے۔ درق لگائیے اور چمچے سے کھائیے۔

نہاری

کون ہے جس کے منہ میں نہاری کا لفظ سن کر پانی نہ بھرا آئے۔ اس کا رواج وہلی اور لاہور میں زیادہ ہے لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ ولی والے نلیاں، پائے، مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں جس سے زبان فصیح اور بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی، بنولے اور چنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اول الذکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے، جس میں کچھ وغل صوبائی تعصب کا بھی ہو سکتا ہے لیکن اس تعصب سے دلی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے ساجے دوسرے نسخے کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ بعض تو برا بھی مان جاتے ہیں۔

اس بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ آوی ہے یا گھوڑا۔

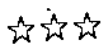


ہمارا ریڈ یونج رہا ہے اور بے آواز ہے پڑوسی کے ریڈ یو سے بھی کام چل جاتا ہے

اخبار میں ایک صاحب کا شکایتی خط چھپا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ریڈ یو بچتا رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ اور ہماری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ خط ہمیں کیوں لکھا گیا ہے۔ ہمارا ریڈ یو سرت کرنے کی کسی دکان سے کوئی تعلق نہیں کہ کسی ملکینک کو بھیجیں اور وہ اسی طرح اس ریڈ یو کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے جس طرح فافٹ ریڈ یو سروس کے ایک مشاق مستری نے ہمارے ریڈ یو کو کیا۔

ہمارا یہ ریڈ یو چنداں پرانا نہیں اور بہت اچھے ماڈل کا ہے۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم کی خبریں شروع سے آخر تک اسی پر سنیں۔ لیکن چند سال سے جانے کیا ہوا۔ اس میں کچھ کھڑ بڑ ہونے لگی تھی۔ جیسے چوہے گھس گئے ہوں۔ ایک بار تو ہم نے اسے کھول کے اس میں بلی بھی داخل کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر اس میں چوہا پکڑنے کا شکنجہ کئی روز لگائے رکھا لیکن یہ چوہے ایسی چالاک قوم ہیں کہ پھنس کے نہ دیے۔ آخر کسی نے کہا۔ تم لوگ اناڑی ہو۔ ریڈ یو کا ستیاناس کر دو گے۔ اس میں کوئی چوہے دوہے نہیں ہیں بلکہ یک چیری و صد عیب۔ اس کے عناصر میں اعتدال نہیں رہا۔ بہتر تو یہ ہے کہ کسی

کباڑی کو بلاؤ ورنہ کوئی مستری مل جائے گا۔ کباڑی والی بات تو ہمارے جی نہ لگی۔
 مستری صاحب مل گئے۔ خدا جانے انہوں نے اسے کھول کے کیا جاو کیا کہ ساری کھڑ
 بڑ کھڑ بن جاتی رہی۔ اس کھڑ بڑ کا تعلق آواز سے تھا۔ جب تک آواز تھی، یہ بھی تھی۔ ان
 مستری صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اوپر کی لپیا پوتی یا ہاتھ کی صفائی کا قائل
 نہیں۔ خرابی کی جڑ بنیاد تک پہنچتا ہوں اور پھر اسے اکھاڑ پھینکتا ہوں۔ آدمی صادق
 القول تھا جو کہا وہی کر دکھایا۔ آواز نہ رہی تو کھڑ بڑ بھی نہ رہی اور اس شخص نے اپنی محنت
 کا بدلہ یہ کیا لیا؟ فقط پندرہ روپے۔ ہم نے پندرہ روپے کے بجائے اس کی محنت کو دیکھتے
 ہوئے اسے ریڈیو دینے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن وہ بولا جی نہیں۔ آبائی جائیداد سے
 انسان کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں۔ اسے اپنے پاس ہی رکھیے۔



اب یہ ریڈیو ایسا کارآمد ہو گیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ نہ ہو تو ہم کیا کریں۔ پیچھے
 کا ڈھکنا ہم نے اتار دیا ہے اور اس کے اندر سوئی وھاگا، ٹوٹے، بے کار سلسلیں،
 مستعمل بلیڈ اور انتہائی رازداری کے خطوط رکھتے ہیں۔ اب رہا ریڈیو پروگرام سووہ
 کہیں سے بھی سنا جاسکتا ہے۔ ہمارے پڑوسیوں کا ریڈیو ان کے عقبی پر آدمے میں
 برابر بچتا ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کی آواز وہ بہت دھیمی رکھتے تھے۔ اس کا علاج ہم نے
 یوں کیا کہ دونوں صحنوں کی درمیانی دیوار کے ساتھ بانس کی ایک سیڑھی لگا دی اور اس پر
 جا چڑھے۔ کان اس طرف کو لگا دیے۔ نہ پتنگ لگے نہ بھٹکری۔ کئی بار تو ہم وہاں لٹکے
 لٹکے سو بھی جاتے تھے۔ لوگوں کو ہمیں مانگوں سے پکڑ کر کھینچنا پڑتا تھا۔

یہ بانس کی سیڑھی والی تکلیف بھی۔ اگر کوئی اسے تکلیف سمجھے تو، چند ہی روز رہی۔
 اس کے بعد ہم نے ان کے گھر شکایت بھجوائی کہ آپ کا ریڈیو بہت اونچا بچتا ہے۔
 ہمارے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اس روز سے وہ اسے پوری آواز سے کھلا رکھتے ہیں۔

ہم گھر کے کسی کمرے میں ہوں حتیٰ کہ غسل خانے میں بھی۔ پوری زنانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ذاتی طور پر ہم ان صاحبہ کی شکایت کو کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ سرود خانہ ہمسایہ سے لطف اندوز ہونا عین جائز ہے۔ تاہم ان کو سوسیتی کا ذوق کم ارزانی ہوا ہو تو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ پڑوس میں اس مضمون کا پرچہ بھجوادیں کہ ذرا اپنا ریڈیو اونچا رکھا کیجیے تاکہ ہم بھی پروگرام سن لیا کریں۔ یقین ہے ان کے دل کی مراد برآئے گی یہی پڑوسی ریڈیو کو دھیمہ کر دیں گے۔

ریڈیو پروگراموں میں ہماری پسند یا تو قوالیاں ہیں یا کمرشل پروگرام۔ قوالیوں کی چاٹ ایک تو اس وجہ سے پڑی کہ ہم صاحبِ دل آدمی ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ کئی برس تک جناب پیر حسین بخش عاصی چشتی نظامی نقشِ بندی کے پڑوس میں رہے ہیں۔ پیر صاحب موصوف کے ہاں جمعے کے جمعے سماع کی محفل تو ہوتی ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ صلح کل اور وسیع المشرب ہونے کے باعث کسی سلسلے یا فرقے کے کسی بزرگ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ آج کسی کا یومِ ولادت ہے تو کل کسی کا یومِ وصال۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ قادر الکلام شاعر ہیں۔ عاصی ان کا تخلص ہی تو ہے۔ خدا نخواستہ سچ بچ کے گنہگار تھوڑی ہی ہیں۔ ہفتے میں پانچ چار قوالیاں وہ لکھ لیتے ہیں اور لکھنے کا کیا فائدہ اگر جلسہ کر کے کسی باکمال کی زبانی سنی نہ جائیں۔ ہمیں بھی انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ غزل کو چھوڑ قوالی لکھا کر داور اب یہ پرانی چیز تھوڑی ہی ہے۔ فیض بھی لکھتے ہیں۔ فلموں میں بھی آتی ہیں چھجور قوال کپور تھلے والے ہمارے مرید ہیں۔ ان سے گواہوں گا۔ لیکن ہماری طبیعت ادھر نہیں آئی۔

قصہ مختصر یہ کہ قوالی کچھ اس طرح ہماری روح کا جزد ہوئی ہے کہ بعض اوقات سور ہے ہوتے ہیں لیکن تالی بجا رہے ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ریڈیو نہ ہوتا تو پیر صاحب کے

پڑوس سے اٹھ آنے کے بعد بڑی تکلیف ہوتی۔ اس وقت بھی جب کہ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ ریڈیو پر قوالی ہی ہو رہی ہے۔ پہلے تو چیف قوال نے یعنی قوال پارٹی کا سرغنہ نے تان اٹھائی۔

خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ

خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

اس میں اینڈ پارٹی یعنی ہمواؤں نے یہ جوڑ لگایا

ہم نے لاکھوں کے بول سہے، ستم گر تیرے لیے
یکا یک قوال اعظم کو خیال آئے گا کہ امیر خسر کا کلام تو ہوا ہی نہیں۔ چنانچہ اگلا بول
شاید یہ ہو۔

کھیر پکائی جتن سے چرخا ویا جلا

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

لیکن سوسنار کی ایک لوہاری۔ ہمواؤں کا جواب بھی بلہلا کر یہی دیں گے۔

ہم نے لاکھوں کے بول سہے۔ ستم گر تیرے لیے

اب رہا کمرشل پروگرام۔ یہ یوں پسند ہے کہ اس میں روحانی غذا بھی ہوتی ہے اور
دوسری بھی۔ کیونکہ نغموں کے ساتھ ساتھ بسکٹوں، مٹھائی اور ڈبل روٹیوں کے
اشتہاروں کا ناکا اس طرح ملایا جاتا ہے کہ سننے والا مسلسل موسیقی سے اکتانے نہیں
پاتا۔ ابھی آپ فیض کی غزل سن رہے ہیں۔

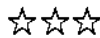
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فورا بعد ارشاد ہوگا کہ گلشن اسکیم میں پلاٹ لینے کے لیے آپ نے ابھی تک عرضی
نہیں دی تو اب دے دیجئے۔ ادھر کسی مغنیہ نے تان اڑائی کہ۔

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد

ادھر اعلانیٰ نے اعلان کیا کہ گل بہار مہندی خریدیے۔ ٹیوب میں آتی ہے۔ پتھر پہ
گھسنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ابھی غزل ہو رہی ہے۔

کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا
یکا یک آوازہ لگا کہ وانتوں کی صفائی اور چمک کے لیے افغان فارسی کے دندان
شکن منجن سے بہتر کوئی چیز نہیں اور گلنار لب احک ہونٹوں کی جاذبیت کو دوبالا کرتی
ہے۔ ادب پر کمرشل پروگرام کے اثرات کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جیکب آباد میں میلہ
موشیاں کے موقع پر جو مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس کا مصرعہ طرح یہ تجویز ہوا۔ ع
جہاں مامتا ہے وہاں والدہ ہے



آج کیا پکایا جائے؟ لکھنے کا مسئلہ کیسے حل ہو

آج کیا لکھا جائے؟

یہ مسئلہ ایسا ہی ٹیڑھا اور دشوار ہے جیسا یہ کہ آج کیا پکایا جائے۔ ہم نے اپنے دوستوں کے گھروں میں اس بات پر فساد ہوتے دیکھے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ میاں سے بیوی صبح ضرور پوچھتی ہیں کہ ’بڑی والا کھڑا ہے، آج کیا پکایا جائے۔‘ ’جو جی چاہے لے لو۔‘ و نہایت استغنا سے جواب دیتے ہیں۔ لیکن جب دوپہر کو میاں کے سامنے کھانا آتا ہے تو جھلا اٹھتے ہیں۔ ’’روز مینگن روز مینگن۔ مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟‘‘

’’آلو لے لوں پھر۔‘‘

’’قبض کرتا ہے۔‘‘

’’گو بھی۔‘‘

’’باوی ہے۔‘‘

’’چھندر۔‘‘

”میٹھے ہوتے ہیں۔“

”کر لیے“

”کڑوے ہوتے ہیں۔“

”شلیم“

”میں کوئی کشمیری ہوں۔“

”وال؟“

”بیگم! مارے ڈالتی ہو۔ تم جانتی ہو مجھے پہلے ہی گیس کی شکایت ہے۔“

”اچھا تو خالی گوشت پکائے لیتی ہوں۔“

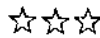
”بابا بابا۔ تمہیں معلوم نہیں خالی گوشت فاسد خون پیدا کرتا ہے۔ سبزی تو کوئی ہونی ہی

چاہئے۔“

”آخر کون سی سبزی لوں۔“

”کہہ تو دیا جو جی چاہے ملے“، میاں اخبار میں ضرورت رشتہ کے کالم میں منہمک

ہو کر فرماتے ہیں۔



”تو پھر آج کیا لکھا جائے۔“

ہم ان لوگوں میں سے نہیں جن کے لئے مضمون لکھنا یا میں ہاتھ کا کھیل ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم بائیں ہاتھ سے کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ اپنا شمار ان باکمالوں میں کرنا مقصود نہیں جن میں سے ایک سے فرمائش کی گئی کہ قطب مینار پر مضمون لکھو۔ وہ فوراً کھٹ کھٹ مینار کی سیڑھیاں چڑھ گیا اور اوپر سے چیخ کر پوچھنے لگا کہ کس موضوع پر لکھوں؟ بچپن میں سبب ہم سے گھوڑے پر مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا تو ہم نے بھی اسی طرح تعمیل حکم کی تھی۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ گھوڑا قطب مینار نہیں ہے

جانور ہے۔ ہلتا بہت ہے۔ کتنا بھی سنبھل کے بیٹھو قلم ریٹ جاتا ہے۔
ہمیں اپنے ان محترم اور بزرگ افسانہ نویس پر ہمیشہ رشک آیا، جو فرماتے ہیں کہ
میں ریڈیو کا فرمائی پروگرام سن کر افسانہ لکھتا ہوں۔ وہ یوں کہ اس میں سے کوئی مصرع
یا بول پسند آجائے تو اسے بطور عنوان ناک کر قلم چلانا شروع کر دیتا ہوں۔ کہیں تو
جا کے رُکے گا۔

سفینہ غم دل۔ جب دیکھتا ہوں کہ سولہ صفحے ہو گئے اور یا تو ہیر و ہیر و کن کی دھوم دھام
سے شادی ہو گئی یا ان میں سے ایک خودکشی کر کے حرام موت مر گیا تو افسانہ ختم کر کے تیر
کر کے ایڈیٹر کو بھیج دیتا ہوں۔ انہوں نے دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ ایسا ہی کیا
کریں۔

ہم نے ان کے نئے پرانے افسانوں کا ایک مجموعہ نکال کے دیکھا۔ فہرست مضمون
کچھ یوں چلتی تھی۔

- ۱۔ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔ ۲۔ میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا۔
- ۳۔ یہ شام کی تنہائیاں..... ۴۔ پریم آن ملو۔ ۵۔ لال دوپٹہ ملل کا۔ ۶۔ جب پیار
کیا تو ڈرنا کیا۔

ریڈیو عام ہونے سے پہلے وہ یہی کام گراموفون سے لیتے تھے۔ لیکن ان کی بات
اور ہے۔ وہ ہماری طرح معمولی ادیب نہیں بلکہ مصوٰر جذبات ہیں اور پبلشرز میں
ان کی کتابوں کی اتنی مانگ رہتی ہے کہ وہ بالعموم چار کتابیں ایک ساتھ شروع کرتے
ہیں۔ کمرے میں چاروں کونوں میں ایک ایک میز چھپی ہے اور ہر ایک پر ایک
کاپی، قلم، دوات، سیاہی چوس وغیرہ دھرا ہے۔ طبیعت میں گرمی آئی تو ناول ”فاتح
دمشق“ دانی میز پر جا بیٹھے۔ رومان انگیز ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو تو ”بیمار محبت“ والی
میز پر پہلے گئے۔ ایک میز پر انہوں نے ایک تحقیقی کتاب شروع کر رکھی ہے۔ اہل

قرطاجنہ کا فلسفہ مابعد الطبیعیات، اور ایک پر، رہنمائے مرغی خانہ، کیونکہ موصوف ریٹائر ہونے سے پہلے سرکاری مرغی خانے کے انچارج تھے۔ یہ سارا کارخانہ بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ فقط ایک بار ذرا سی گڑبڑ ہوئی تھی کہ ناول 'معرکہ ہلال دصیلب میں ایک مقام یوں آتا ہے۔

”صلاح الدین ایوبی نے تلوار اٹھا کر مجاہدوں سے خطاب کیا کہ بہادر و آج زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یاد رکھو۔ جب مرغی کے چوزے ایک ہفتے کے ہو جائیں تو ان کو روزانہ کنگنی کا چوگا دینا ضروری ہے اور دن میں دو بار پانی بھی ضرور پلایا جائے۔“

جب قارئین کرام کے شکایتی خط آئے تو مصور جذبات نے تحقیقات کی، معلوم ہوا قصور ان کا نہ تھا، کمر اصف کرنے والے نوکر کا تھا جس نے بے سوچے سمجھے ایک میز کی کاپی اٹھا کر دوسری پر رکھ دی تھی۔ پناہیہ کتاب رہنمائے مرغی خانہ نکال کر دیکھی گئی تو اس میں ایک باب یوں رقم تھا۔

”مرنے کو گھنٹوں میں رکھ کر اس کے سر کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں اور دو چھوٹی انگلیوں سے اس کے پیٹ کی مالش کرتے ہیں۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ عیسائی طاقتیں مل کر اسلام کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیں گی۔ بس جوش ایمانی سے ایک بلہ اور۔

۔ کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھر دسا!

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

بہر حال ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم گراموفون یا ریڈیو کی مدد سے نہیں لکھ سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریڈیو سراسر بے کار چیز ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ جب ریڈیو پاکستان اور ریڈیو بیلون وغیرہ نہیں تھے اور فرمائشی پروگرام نہ ہوتے تھے تو لوگ اپنے بچوں کے نام کیسے رکھتے تھے۔ ہمارا مطلب جدید قسم کے ناموں سے ہے، ورنہ پرانے لوگ تو

تاریخی نام رکھتے تھے خواہ وہ استغفر اللہ ہی کیوں نہ ہو یا پھر یہ ہوتا تھا کہ باپ عبدالسلام کہہ کر پکارتے ہیں۔ دادا جان تاریخی نام خدا بخش ظہوری پر مصر ہیں۔ نانا کو علی قلی خان پسند ہے۔ اماں اچھن کہہ کر یاد کرتی ہیں۔ دوست احباب تن و توش پر نظر کر کے مولو کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں مجنوں رہ مانی کے نام سے اور دفتر میں تعارف ہوتا ہے تو اے۔ ایس چغتائی ہوتے ہیں۔

خیر کہنا یہ ہے کہ کنیز فاطمہ، عنایت بیگم اور الہی بخش قسم کے ناموں کے لیے ریڈیو کی ضرورت بے شک نہ تھی لیکن اب تو کشور کشا اور حسینہ عالم وغیرہ لڑکیوں کے نام سنے جاتے ہیں اور لڑکے صریحاً نامہ نوائے سر دس وغیرہ کہلاتے ہیں۔



لاؤڈ اسپیکر کے لیے پردے

کا خاص انتظام ہے

ہمارے ہاں پردہ روز بروز متردک ہوتا جا رہا ہے اور اگر اکبر الہ آبادی کی اطلاع صحیح ہے تو سردوں کی عقل پر پڑتا جا رہا ہے لیکن اس زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو اس شعار کی حتی الوسع پابندی کرتے ہیں۔ اخبار میں تلونڈی موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ کے ایک جلسے کی خبر آئی ہے جس کے آخر میں لکھا تھا کہ ”لاؤڈ اسپیکر اور مستورات کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے۔“ اگرچہ مستورات کے لیے اس قسم کا انتظام بھی عجیب و غریب میں سے ہے۔ مستورات اور پردہ؟ خاصی ان مل اور بے جوڑ بات ہے لیکن لاءڈ اسپیکر کے لیے پردے کا انتظام تو اور بھی طرفہ بات ہے

اس سے پہلے ہم ایک مشاعرہ دیکھ چکے ہیں۔ جس میں سردوں کے لیے پردے کا خاص انتظام تھا۔ یہ مشاعرہ کراچی کے ایک کالج برائے خواتین میں ہوا تھا اور ایک طرف قاتیں تان کر ان کے پیچھے مردوں کو بٹھایا گیا تھا۔ چوکی پہرے اور پولیس کا انتظام بھی خاصا معقول تھا تاکہ عورتیں پردے کے پیچھے تانک جھانک کر کے مردوں کی بے حرمتی نہ کریں اور ان پر آواز نہ نہ کیں فقط بیبیاں بے پردہ تھیں اور

جہاں تک ہمیں یاد ہے لاؤڈ اسپیکر بھی سب کی نظروں کے سامنے اسٹیج پر رکھا تھا۔ اس کے لیے برقعے یا کسی اور قسم کے پردے کا تکلف نہ کیا گیا تھا۔ یہ سعادت تلوٹوی مہوی خان ہی کے حصے میں لکھی تھی۔ آج اکبر ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ مارتے۔

لاؤڈ اسپیکر کے لفظی معنی ہیں اونچا بولنے والا۔ بعض لوگوں کے نزدیک جن سے ہمارا متفق ہونا غیر ضروری نہیں اسے بھی خواتین کی ایک خصوصیت قرار دیا جاتا ہے اور کچھ عجیب نہیں۔ اسی وجہ سے میں آئے کو جو محض مشین ہے خواتین کے زسرے میں شمار کیا گیا ہو۔ ہمارے خیال میں یہ مماثلت مبالغے سے خالی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر اونچا بولتا ہے اور جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے بہت بولتا ہے اور کسی کی نہیں سنتا اور ہمیں یہ بھی تسلیم کہ سردوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیات فیاضی سے ودیعت نہیں کیں۔ تاہم لاؤڈ اسپیکر محض ایک مشین ہے جو بجلی کے زور سے بولتی ہے اور بلائے سے بولتی ہے۔ جب بجلی کٹ جائے تو یہ خاموش ہو جاتی ہے۔ خواتین اللہ کی ذی روح مخلوق ہیں۔ ان پر بجلی کے کٹنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہاں زبان کٹ جائے تو مجبوری ہے۔ سانس دانوں کے بنائے ہوئے ایک آلے کو اتنا بڑھانا ہمارے خیال میں بے سمجھی کی دلیل ہے۔



مشینوں میں ایک مشین البتہ ہم نے پردے میں دیکھی ہے۔ آپ نے بھی لاہور میں اسپتال روڈ پر اور کراچی میں صدر اور ہند روڈ کے فٹ پاتھوں پر دیکھی ہوگی وہ ہے کیمرہ۔ یہ کیمرہ مین بھی ایسے منتشر ہوتے ہیں کہ تصویر کھینچتے وقت چہرے پر نقاب ڈال لیتے ہیں تاکہ تصویر کھینچوانے والوں کی نامحرم نظروں سے بچے رہیں۔ سب سے زیادہ بے پردگی مگر ہم نے دیکھی تو اس تصویر کھینچوانے والے طبقے میں۔ اچھی اچھی پردہ دار بی بیاں چہرہ کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم نے فقط ایک بی بی ایسی دیکھی ہے جس نے برقعہ پورا اوڑھ کر تصویر کھینچوائی تھی۔ ہم نے بھی یہ دیکھی۔ فنی نقطہ نظر سے بہت

صاف اور عمدہ تصویر تھی لیکن صاحبہ مذکور کو پہچاننے میں قدرت دقت ہوتی تھی۔ انہیں خود بتانا پڑتا تھا کہ یہ میری تصویر ہے، برقعے کی جھلک نہیں دیکھتے؟

ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ایک صاحب نے بڑھ کر کہا میاں تم نے خشتِ اول ہی غلط رکھی ہے جس کی وجہ سے تمہارا سارا مضمون ٹیڑھا جا رہا ہے۔ ہم نے کہا خیر باشد۔ بولے! تلوٹڈی موسیٰ خان والے جلسے کے اشتہار کا مطلب فقط یہ ہے کہ لاڈ ڈاٹیکٹر کا بھی انتظام ہے اور مستورات کے لیے پردے کا بھی۔ مانا کہ یہ اشتہار کسی ایسے عالم کا لکھا ہوا ہے جسے صرف دنجو سے کم واقفیت ہے لیکن تم تو اسے ملا کر مست پڑھو۔

ہماری ناچیز رائے میں ہم جیسے مصرفِ آدمی سے یہ تقاضا کرنا کہ ہم ان باریکیوں پر غور کریں گے ذرا زیادتی ہے۔ اس سے کہیں آسان یہ ہے کہ اشتہار لکھنے والوں سے ذرا احتیاط کا مطالبہ کیا جائے۔ اس سے پہلے اسی صرف دنجو کے تھے میں ہم نقصان اٹھا چکے ہیں۔ ایک جگہ سے ہم خالص پنجاب کا گھی لایا کرتے تھے، ہمیں تو کچھ ایسا ناپسند نہ تھا لیکن ایک روز اس میں سے ایک چھلا ہوا آلو ثابت نکل آیا اور ایک چربی کا ٹکڑا بھی تو شکایت کرنی پڑی۔ تب اس بزرگ نے وضاحت کی کہ جناب گھی تو یہ بنادٹی ہے۔ میں نے اس کے اصلی ہونے کا دھوی کہاں کیا ہے۔ میں تو صرف اس کا ذمہ دار ہوں کہ یہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے منگاتا ہوں جو خالص پنجاب میں ہے۔ سندھ دندھ میں نہیں ہے۔ انہی کے پڑوس سے ہمارے ناشتے کے لیے انڈے آیا کرتے تھے کیونکہ اس دکان پر تازہ سرخی کے انڈے کا بورڈ لگا تھا۔ ایک روز جو دوا انڈے گندے نکل گئے تو اس اشتہار کا مطلب بھی معلوم ہوا۔ دکاندار نے کہا کہ جناب وہ مرغی جس کے انڈے ہیں بالکل تازہ ہے۔ سال چھ جینے سے زیادہ اس کی عمر نہیں، انڈوں کا میں ذمہ دار نہیں ہوں البتہ تعجب مجھے بھی ہے کہ آپ کے گھر جا کر گندے کیسے نکل گئے۔ میرے ہاں تو دس بارہ روز سے رکھے تھے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔“



اہرام بنانے کے لیے قطب مینار سیمنٹ استعمال کیجیے

سیماب اکبر آبادی کہاں کے رہنے والے تھے
صفا چٹ بلینڈ را پہلے ایجاد ہو گئے ہوتے تو کارل مارکس کبھی واڑھی نہ رکھتے

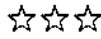
نہ جانے وہ کون لوگ ہیں جو خبروں اور معلومات کے لیے اخباروں اور کتابوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ہم نے تو جب کبھی اخبار پڑھا طلب چین اور جاپانی انگوٹھیوں وغیرہ کے اشتہاروں کے لیے پڑھا۔ کتابوں سے زیادہ سے زیادہ راتوں کی نیند حرام کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے حالانکہ یہ کام کھٹلوں کی مدد سے بہتر اور زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے اور جہاں کھٹل نہ ہوں وہاں مچھروں کا ہماری بلدیہ نے ہر بستی میں معمولی ٹیکسوں کے عوض معقول انتظام کر رکھا ہے۔ اب رہیں خبریں اور معلومات یہ ہم فلموں اور ریڈیو کے کمرشل پروگراموں سے اخذ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان سے چین الاقوامی مسائل کے حل میں بھی مدد مل جاتی ہے۔

☆☆☆

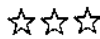
ابھی کل ہی ہم امریکا میں نیکرہ لوگوں کے مارچ کا ذکر ایک رسالے میں پڑھ رہے تھے جو وہ سفید فاموں کے خلاف احتجاج کے طور پر کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے کہا۔ یہ کیا کھڑاگ ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ پاکستان میں کسی نے کسی

درد پیشی نسخے کی مدد سے ایسی کریم ایجاد کی ہے کہ کسی ٹیکر کے چہرے پر مل دی جائے تو یورپ اور امریکا کے سفید فام منہ تکتے رہ جائیں اور بے اختیار پکار اٹھیں۔ ”تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔“ کمرشل پروگرام ہی سے ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ قطب مینار میں سیمنٹ کی کیا خصوصیات ہیں۔ مشہر نے اعلان کیا ہے کہ اگر مصر کے اہرام اس سیمنٹ سے بنائے جاتے تو کہیں زیادہ پائدار ہوتے۔ اس پر ہمیں اہرام کے معماروں کی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ معمولی مسالا اور پتھر استعمال کرنے کی بجائے چار چھ ہزار سال انتظار نہ کر سکتے تھے؟ آخر انہیں معلوم نہ تھا کہ ایک روز پاکستان میں یہ سیمنٹ ایجاد ہونا ہے۔ خیر گزشتہ آنچہ گزشتہ۔ اب ہمیں اہرام بنانے ہوں گے تو ضرور یہی سیمنٹ استعمال کریں گے۔

ریڈیو کے اسی اشتہار سے معلوم ہوا کہ یہ سیمنٹ کوئی آج کی ایجاد نہیں بلکہ تیس سال سے استعمال ہو رہا ہے۔ اشتہار میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ کراچی کے کبھی آثار قدیمہ ای سیمنٹ سے بنے ہیں۔ ہم نے کہنی بذا کے میجر سے پوچھا کہ فریر ہال کی تعمیر میں کتنا سیمنٹ لگا ہوگا۔ بولے وہ تو معمولی چوڑے پتھر کا ہے دیکھ لیجیے گا دتین سو سال میں گر جائے گا۔ ہم نے پوچھا کہ پھر کراچی کے کن آثار قدیمہ کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ بولے۔ ”وہ جو پچھلے تیس سال میں بنے ہیں۔“ ادھر سے مطمئن ہو کر ہم نے مصر کے اہرام کی بات چھیڑی تو میجر صاحب نے کہا آپ اور میں زندہ ہیں تو انشاء اللہ میں دکھا دوں گا کہ یہ اہرام دس بارہ ہزار سال اور کھینچیں گے اس کے بعد ان میں کہیں نہ کہیں دراڑیں پڑیں گی یا پتھر کھسکے شروع ہوں گے۔ ہم اپنے سیمنٹ کے ساتھ گارنٹی دیتے ہیں کہ فلاں مدت کے اندر عمارت میں نقص ہو جائے تو اس کی مرمت کے لیے سیمنٹ دس فی صدی رعایت پر دیں گے۔ کیا آپ تاج محل، اہرام مصر، لندن ٹاور وغیرہ کے متعلق اس قسم کی گارنٹی پیش کر سکتے ہیں؟



ہم نے ایک بار ایک آرٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ کئی سال ضائع کیے لیکن تصور بنانی نہ آئی۔ اب آگے اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ بھلا گھوڑا مار کے پنسل کے بغیر تصویر بن سکتی ہے۔ بے شک مائیکل اینجلو وغیرہ نے قرون وسطیٰ میں تصویریں بنائیں لیکن وہ کیا تصویریں ہیں۔ نہ سر نہ پیر۔ ہمارے وہ سالہ بھتیجے نے پہلے ہی روز اس پنسل کی مدد سے ایک اسٹریکٹ آرٹ کا شاہکار بنا ڈالا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ انعام ملنے میں کچھ دخل اس بات کا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تصویر نمائش میں الٹی ٹنگی تھی۔ فریم بنانے والے کو الٹا سیدھا معلوم نہ ہوا تو جس طرف جی چاہا لٹکانے کی کندی لگا دی ادھر ہمارے پاس بھی اتنا وقت نہ تھا کہ اس کا رخ تبدیل کرتے لیکن نقادوں کی دد ررس نگاہوں نے فوراً پہچان لیا کہ آرٹسٹ نے اپنی دانست میں جو بات ہی بنایا ہے وہ اصل میں طوطا ہے۔ لیکن بنیادی کریڈٹ اس پنسل ہی کو جاتا ہے۔ کیا عجب کہ پکا سو جو تصویریں بناتے ہیں اس کے لیے زرخیر خرچ کر کے خفیہ طور پر یہیں سے گھوڑا مار کے پنسلیں منگاتے ہوں۔ کمرشل سروس ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اگر صفا چٹ بلیڈز پہلے ایجاد ہو گئے ہوتے تو کارل مارکس اور سر سید احمد خان کبھی ڈاڑھی نہ رکھتے۔



ہمیں نظر کرم کی بھیک ملے

سنا ہے ایک مولانا سب پر کھڑے خیرات کے فضائل پر وعظ کر رہے تھے دیکھا کہ پچھلی صف میں ایک سیٹھ اتنا متاثر ہوا کہ مارے رقت کے زار و قطار رو رہا ہے۔ حضرت مولانا نے اس سے پوچھا اے نیک مرد۔ وہ کیا بات تھی کہ تیرے جی کو لگی۔ آنسو پونچھ کر بولا کہ مجھے اب تک معلوم نہ تھا کہ خیرات اتنی اچھی چیز ہے۔ اب میں کل سے خود بھی خیرات لینا شروع کر دوں گا۔

بخشیش ہر چند کہ خیرات کے زمرے میں نہیں آتی۔ خیرات ضرورت مندوں کے لیے ہوتی ہے اور اس کے دینے میں ثواب کی بھی امید ہے۔ بخشیش میں ثواب کا معاملہ ذرا مشتبہ ہے کیونکہ یہ ہم بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی دیتے ہیں جن کی آمدنی ہم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم بخشیش پر اخبار میں جو مضمون چھپا ہے اسے پڑھ کر بے اختیار جی سپا ہا کہ ہم بھی بخشیش لینا شروع کر دیں۔ اب تک ہم نے دنیا میں صرف ایک ملک دیکھا جہاں بخشیش کا کوئی سوال نہیں اور وہ ہے چین۔ لیکن چین جیسا کہ سب کو معلوم ہے ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ ہم خدا خواستہ کمیونسٹ تھوڑا ہی ہیں۔ لہذا یہ ذریعہ تحریر بذا اعلان کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں بخشیش دینا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس کے لیے ہمارا پتہ معرفت ایڈیٹر خواتین رہے گا۔ ہم نے ادارہ اخبار ہذا کو

بھی ترغیب دی تھی کہ اسی قسم کا اعلان کر دے لیکن یہ لوگ پرانے خیال کے ہیں۔
بہر حال مضمون نگار کا ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ قارئین کرام! دل
کھول کر بخشش دیجیے۔



معلوم ہوتا ہے ہم میں اس قسم کا رجحان شریع ہی سے ہے جس کا ثبوت ہمیں اپنا
کلام دیکھنے سے ملا۔ جس طرح لوگ عشق مجازی کے مضامین باندھتے ہیں حالانکہ ان
کا مقصود عشق حقیقی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی اپنے ذوق گدائی کو حسن و عشق کے
پیرائے میں چھپانے کی کوشش کی ہے یعنی ان کے لفظی معنی لینے کی ضرورت نہیں۔
دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم نے بالعموم معاملے کے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ ”جانا نام خدا دے
جا“ جا تیرا بھلا ہوگا۔“ یعنی ہمارے نفع نقصان کی اس میں کوئی بات نہیں، تجھی کو ثواب
ملے گا۔ بعض لوگ شبہ کریں گے کہ اس بہانے ہم اپنا کلام اس پرچے میں چھپانا چاہتے
ہیں جو ویسے نظمیں غزلیں نہیں چھاپتا اور اب بڑی مشکل سے لوگوں کی پسند کا ایک ایک
شعر چھاپنے لگا ہے۔ یہ بات نہیں ہے، ہم بلا تقریب بھی آپ کو اپنا کلام سنانا چاہیں تو
آپ رواداری اور اخلاق کریمانہ سے کام لے کر منع تھوڑی کریں گے۔ بہر حال عرض
کیا ہے۔

کب سے کھڑے ہیں بر میں خراج عشق لیے سر رہ گزار
روز حساب قریب ہے لوگو کچھ تو ثواب کا کام کرد



دل والوں کی دور پہنچ ہے ظاہری اوقات نہ دیکھ
ایک نظر بخشش میں دے کر لاکھ ثواب کماتی جا



انشاء جی اسے ردک کے پوچھیں۔ تم کو تو مفت ملا ہے حسن
کس لیے پھر بازار دفا میں تم نے یہ جنس گراں کی ہے؟

☆☆☆

نگری نگری گھوم رہے ہیں، خنچو اچھا موقع ہے!
ردپ سردپ کی بھکشا دے دد ہم اک پھیلا دامن ہیں!
دیگرہ

ہمیں احساس ہے ہمارے کلام میں ابھی اتنی صفائی نہیں آئی جتنی مثلاً اس مصرعے
میں ہے۔ مجھے نظر کرم کی بھیک ملے۔ لیکن امید ہے ہم باقاعدگی سے ریڈیو پاکستان کا
کمرشل اور فرمائشی پروگرام سننے رہے تو ہماری درخواست میں بھی ایسی ہی وضاحت
اور ملاحظہ پیدا ہو جائے گا۔

تخصیص دینا اتنا اختیاری فعل نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے
فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر ہمارا سامان دس گز ردو اٹھالے جانے والے پورٹر کو جس
نے ہمارے نہ نہ کرتے ہوئے بھی ہمیں اپنا سوٹ کیس خود اٹھانے کی اجازت نہ دی
تھی، ہم نے ایک مارک نذر کیا تو وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ واہ صاحب! اچھے آئے
کہیں کے یہاں دو مارک سے کم ٹپ نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایک سانحہ لندن میں پیش آیا
کہ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا جناب آپ کے پاس پیسے کم ہیں تو بے شک کرایہ نہ دیجیے۔
لیکن میری تخصیص میں آپ کتر بیونت نہیں کر سکتے کہ یہ اصول کا سوال ہے، یورپ میں
ہمیں بعض اوقات کھانا یا ناشتہ ترک کر دیا پڑتا تھا تاکہ ہوٹل چھوڑتے وقت بیردں کو
ٹپ دینے کے لیے پیسے رہیں۔

کراچی میں ٹیکسی ڈرائیور اور رکشا ڈرائیور ٹپ لینے پر اتنا اصرار نہیں کرتے جس پر
ہمیں شروع میں تعجب ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میٹر میں معمولی سی تبدیلی کر کے یہ

انتظام کر لیا جاتا ہے کہ اس میں کرایہ بھی جمع ہوتا رہے اور بیس پچیس فیصدی بخشیش بھی۔ ہمیں یہ بات پسند آئی کیونکہ ٹپ کے نام سے الگ پیسے دیتے وقت دینے والے کو جو احساس زیاں اور لینے والے کو جو معمولی سا احساس ممنونیت ہوتا ہے۔ اس سے فریقین محفوظ رہتے ہیں۔

کراچی کے ریستورانوں میں بھی ٹپ کا رواج ہے۔ بل دیجیے تو ٹپ بھی دیجیے۔ اس لیے اس قباحت سے بچنے کے لیے ہمیں بعض اوقات بل دیے بغیر بظنی دروازے سے نکل جانے ہی میں عافیت نظر آئی۔ لیکن ہم اس کا مشورہ اپنے قارئین کو نہ دیں گے کیونکہ اکثر ہوٹلوں کے بیرے بہت تیز نظر تیز دوڑنے والے اور کچم و شیم ہوتے ہیں اور ہاتھ چھوڑتے وقت ہر قسم کے آداب و اخلاق بالائے طاق رکھ کر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ مار کھانے والا معاشرے میں کتنی اہم حیثیت رکھتا ہے اور لوگ اس کے ریتختے گلیوں میں پڑتے پھرتے ہیں۔ اصل تجربہ ہمیں ٹپ دینے کا ڈھاکے میں ہوا جہاں ایک ہی اچھا ہوٹل ہے اور ہمیں وہاں ٹھہرے بنا چارہ نہیں۔ سو جب تک ٹھہرے بالعموم خیریت رہی۔ کبھی صبح کمرے کے دروازے پر کوئی بیرانا دل پڑھتا نظر آ گیا، کبھی کسی نے لفٹ میں سوار ہوتے وقت ماتھے کی طرف ہاتھ لے جا کر کبھی سی اڑادی۔ ورنہ عام طور پر کسی چیز کے لیے کمرے میں سے گھنٹی بجائی جائے تو بیرے مسافر کے آرام میں مغل ہونے کے خوف سے کاریڈور کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ لیکن جو نہی ان کو پتا چلا کہ اب اس مسافر کا چل چلاؤ ہے تو فوراً مستعد ہو جاتے ہیں اور آپ ہوٹل کے دفتر میں اپنا حساب صاف کرنے اور اپنی جیب صاف کرانے کے بعد اپنا سامان اٹھانے اور دروازے پر حسرت کی نظر کرنے کے لیے آخری بار کمرے میں آتے ہیں تو اپنے دروازے کے باہر وردی پوش اور مستعد بیردوں کی ایک لمبی قطار پاتے ہیں جو نہایت خند و پیشانی سے آپ کو سیلوٹ کرتے ہیں۔ سلام صاحب ان میں سے ایک آدھ بیرے کی

صورت تو آپ پہچان لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ”اچھا ابھی تم تو ہوئے۔ یہ کون لوگ ہیں۔“ اس پر وہ تعارف کراتا ہے کہ ”جناب یہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے کمرے میں آ کر آپ کے جوتے پر رومال پھیرتا تھا۔ یہ دونوں جمعہ دار ہیں۔ ایک صبح آپ کے غسل خانے میں آتا تھا ایک شام کو یہ ہوٹل کا باورچی ہے اور یہ دونوں اس کے اسٹنٹ، یہ شخص کارڈور میں جھاڑو دیتا ہے۔ یہ دونوں پورٹر ہیں۔ اس نے ایک روز آپ کو اخبار لا کر دیا تھا۔ یہ صبح کی چائے والا ہے، یہ شام کی چائے والا ہے۔ اگر کسی پر آپ کو شبہ ہو تو وہ تصدیق کرتا ہے کہ نہیں صاحب یہ آتا تھا۔ آپ اس وقت شہر گئے ہوتے تھے۔“

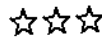
بعد میں تو خیر ہم پیسے کا انتظام کر کے چلتے تھے لیکن پہلی بار ہمارے پاس ان صاحبوں کو دینے کے لیے پچیس روپے کی گنجائش نہ نکلی آخر ایک بھلے مانس نے بیچ میں پردہ کر قطیں کراویں اور ہم پانچ مہینے تک پانچ روپے ماہ بہ ماہ کراچی سے منی آرڈر کرتے رہے۔



بیراگیری میں آمدنی کا سلسلہ تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ وہلی وھلائی کلف لگی وروی۔ اور پگڑی بھی ملتی ہے جسے دیکھ کر اکثر رشک سے سینے پر سانپ لوٹ باتا ہے لیکن آسامیاں اتنی نہیں ہوتیں کہ حب کی کھپت ہو سکے۔ چارو ناچار لوگوں کو بزنس یا نوکری کرنی پڑتی ہے۔ کوئی اخبار نکال کر گزارا کرتا ہے، کوئی کالم لکھنے لگتا ہے۔ روٹی تو کما کھائے کسی طور پر مچھنڈر، سوان پیشوں میں تنخواہ یا آمدنی تو ہو جاتی ہے لیکن بخشیش کا سلسلہ نہیں کہ اصل وجہ کشش ہے۔ کام کیے پر جو ملے وہ تو مختانہ ہوا، کبھی اس پر بھی کسی کو خوشی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے۔

لاہور کا بیسواں میں تو سنا ہے بیرے سو پر روپیہ چلاتے ہیں اور ان کے موکل زیادہ

تر شاعر ادیب اور دانشور ہیں جو کافی ہاؤس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ بعض ان میں بڑے دریا دل اور کریم النفس بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے کافی کا بل دیا لیکن خالی بل بیرے نے کہا جناب بخشیش۔ ہم نے کہا کہ آج تو جیب خالی ہے۔ بس اتنے ہی پیسے تھے۔ مودب ہو کر بولا آپ برا نہ مانیں تو آج میں آپ کو بخشیش دوں ہر چند کہ اس میں مضائقہ نہ تھا ہم نے اتنی بار اسے بخشیش دی تھی۔ ایک بار اس سے قبول کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔ بس یونہی حجاب سا آ گیا۔ یوں بھی اس وقت تک بخشیش کے فضائل پر ہم نے کوئی مضمون نہ پڑھا تھا۔



مصورى ميں گھوڑا مار كہ پنسل كى اہميت

انصاف سے ديكا جائے تو فلمیں اس افاديت ميں ريڈيو كے كمرشل پروگرام اور اخباروں كے اشتہاروں سے كہیں آگے ہيں۔ چند دن قبل ہم فلم ”دوسن بائى نائٹ“ ديكنے گئے جس ميں يورپ كے نائٹ كلب دکھائے گئے ہيں تو مولانا كرامت اللہ سے جوجج كے ليے بس چلا تے ہيں اور محلے كى مسجد ميں امامت بھى كراتے ہيں مڈ بھير ہو گئى۔ بولے ديكا مغرب بے شرى كى كس منزل كو پہنچ گيا ہے؟ اسے ديكا كر عبرت ہوتى ہے۔ اس كے بعد ہم نے مولانا كو اسى قبيل كى اور فلموں كا پتا ديا من سے وہ اور زيادہ عبرت پكڑ سكتے تھے۔ ايك روز كہنے لگے ميں نے سنا ہے كہ يہاں كے نائٹ كلبوں ميں بھى ايسى ہى بے شرى ہوتى ہے ليكن اپنى آنكھوں ديكھوں تو يقين كروں۔ آخر انہيں ايك نائٹ كلب كا فلور شو بھى وكھانا پڑا۔ بے چارے سارا وقت اگلى سيٹ پر بيٹھے آنكھیں پھاڑ پھاڑ كر عبرت پكڑتے اور استغفر اللہ كا ورد كرتے رہے۔



خير يہ تو غلط بحث ہو گيا۔ ہمارا کہنا يہ تھا كہ ہمارى فلموں سے طالب علموں كو بہت مدد مل سكتى ہے، خصوصاً تاريخ كے مضمون ميں۔ ابھى كل ہم كسى تقريب سے ملكہ نور جہاں كا ذكر كر رہے تھے۔ ايك صاحبزادے بولے۔ يہ آپ ملكہ نور جہاں كا ذكر كر رہے ہيں يا

ملکہ ترنم نور جہاں کا۔ جس نے میرے ڈھول سپایا اور منڈیا لکھوٹیا وغیرہ لازم و ملکوف کو جنم دیا ہے۔ ہم نے کہانی الوقت تو ذکر ملکہ نور جہاں کا ہے، بولے میں سمجھ گیا۔ یہ وہی خاتون ہیں نا جنہوں نے فلم ”انصاف کا گھنٹہ“ میں مشہور ہیرو توپ کمار یعنی شہزادہ سلیم کے کوثر اڑائے تھے اور بعد میں جہانگیر بادشاہ سے شادی کر لی تھی۔ ہم نے کہا۔ بالکل آپ ہی سوچیے کہ فلمیں نہ ہوتیں تو اس عزیز کو ایسی قطعی اور موثق معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں۔



ہمیں معلوم نہیں کراچی یونیورسٹی میں وسعت معلومات کے لیے کیا نسخہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب بھی کبھی انعامی معلومات کا مقابلہ ہوا کراچی یونیورسٹی کے طلباء نے شہر کے کالج کے طالب علموں کے مقابلے میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ایک مقابلہ تو ہم نے بھی سنا جس میں اسے تیسرا درجہ حاصل ہوا جب کہ دوسرے کالج پہلے اور دوسرے نمبر پر رہے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ اس مقابلے کو سن کر ہمیں پہلے پہل ڈھاکے کی بندرگاہ کا پتا چلا۔ یہ بھی یونیورسٹی ہی کے ایک فرزند نے بتایا کہ ایٹم بم آبدوزوں کو ڈوبنے کے کام آتا ہے اور اسی جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم نے بتایا کہ سکندر اعظم نے ہندوستان پر مترہ حملے کیے تھے۔ اس مسئلے پر بعد میں تھوڑا اختلاف یعنی ہوا۔ کیونکہ ایک طالبہ کو اصرار تھا کہ مترہ حملے سکندر اعظم نے نہیں باہر نے کیے تھے۔ ایک اور صاحب نے جہانگیر کا نام لے لیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی بادشاہ نے ہندوستان پر مترہ حملے ضرور کیے تھے۔ مولہ یا اٹھارہ نہیں۔ اس قطعی اور درخت جواب کے بعد یہ مسئلہ محض ضمنی اور فروجی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ بادشاہ کون تھا۔ یہ اتنی پرانی بات ہے کہ اس بحث میں جانا محض گڑے مروے اکھاڑنا ہے۔



یہ نہ سمجھا جائے کہ ان طالب علموں کا دائرہ معلومات محض تاریخ تک محدود ہے۔
جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

چل بسا ہے داغ، جیت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
تو ایک طالب علم نے فی الفور جواب دیا کہ داغ کا۔ خیر آپ کہیں گے کہ اس
کا بوجھنا کیا مشکل تھا، تخلص جو موجود ہے۔ اس طرح یہ بتانا بھی غالباً کوئی بڑا کمال قرار
نہ پائے گا کہ۔

ع بڑھاتا ہے یہاں ذوق گناہ ہر سزا کے بعد
استاد ذوق کا مصرع ہے۔ تخلص خود بول دیتا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ ان طالب
علموں نے حسب ذیل سوالات کے جواب بھی بالکل صحیح صحیح دیے۔
”سیماب اکبر آبادی کہاں کے رہنے والے تھے۔“
”دیوان مومن کس کا مجموعہ کلام ہے۔“
البتہ اس مصرع پر ضرور کچھ تامل ہوا کہ کس کا ہے۔

ع خالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
مودہ بھی ایم اے اردو کے ایک طالب علم نے بتا ہی دیا کہ یہ خستہ ہاپوڑی کا ہے
جس کا غیر مطبوعہ دیوان انڈیا آفس میں ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے پڑھے
لکھے اس مصرع کو غالب کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ شاید خالب کے لفظ سے
دھوکا کھاتے ہیں۔



کچھ آداب مجلس کے بارے میں

ہمارے ہاں آداب مجلس سے بے اعتنائی اور بے نیازی کا رجحان خطرناک صورت اختیار کرتا رہا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہم نے زرخیر خرچ کر کے کچھ اوب و وحت احباب کی دعوت کی۔ اس کی تقریب ہم نے کچھ اور بتائی۔ اصل امر یہ تھا کہ ہم نے حال ہی میں کچھ تازہ غزلیں کہی ہیں جو ہماری ناقص رائے میں ارو و اوب میں پیش بہا اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ آداب مجلس کی خلاف ورزی کا آغاز تو کھانے کے دوران ہی میں ہو گیا۔ کسی نے کہا یہ مچھلی ہے یا مگر چھ؟ کوئی مرغ کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ یہ شتر مرغ ہے کیا؟ محض اس لیے کہ پوری طرح نہ گلا تھا۔ بعضے کو فتوں کو کھا کر سی سی کرنے لگے کہ مارڈالا۔ کتنی مرچیں جھونک رکھی ہیں۔

اس کے مقابلے میں دیکھیے کہ ابھی پچھلے دنوں ہم نے ایک جرمن دوست اور ان کی بیگم کی دعوت کی تھی اور اس میں بھی مرچوں اور مسالوں کا تاجب یہی تھا۔ ان کی آنکھیں ضرور سرخ ہو گئیں اور پانی بھی بار بار پیتے تھے لیکن ہم نے جب پوچھا کہ کیا مرچیں لگ رہی ہیں تو بولے ”جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں پاکستانی کھانے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔“ یہ ہوتے ہیں آداب۔

ہمارے ان مہمانوں نے روٹیوں کے جلنے اور گھی کے بنا سستی ہونے کی بھی شکایت

کی اور کھیر کے تھوڑی ہونے کی بھی 'حتی' کہ بعد میں فرمائش کی کہ کنجوسی مت کرو۔ آم منگاؤ اور ہمیں کھلاؤ۔ ہم ہنس ہنس کر طرح دیتے رہے جس پر ایک صاحب تو جزبہ بھی ہوئے کہ کیا آپ ہماری باتوں کو مذاق جانتے ہیں جو یوں منہ کھول کر ہنسے جا رہے ہیں۔

خیر کھانا ختم ہوا۔ اب ہم منتظر تھے کہ کوئی صاحب کلام کی فرمائش کریں گے۔ فرمائش کرانے کے کئی طریقے ہیں مثلاً کھانا 'پہلو بدلنا' زیر لب گنگنا نایا حاضرین میں سے کسی سے کہنا کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ کوئی تازہ غزل وزل ہوئی؟ اس پر نکتہ سنج اور اشارہ فہم لوگ میزبان سے فوراً فرمائش کرتے ہیں کہ اچھا اب کچھ تازہ کلام عنایت ہو اور وہ کان پر ہاتھ رکھ کر رات بھر گاتا ہے۔ چونکہ آج کل اشارہ فہم لوگوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے لہذا زیادہ تجربہ کار شاعر میزبان اپنے ساتھ ایک بچہ جموار رکھتے ہیں جو ایسے موقع پر یاد دلاتا ہے کہ حاضرین مجلس آپ کی تازہ غزلیں سننے کے مشتاق ہیں اور اصرار کیے جاتا ہے کہ اور سنائیے۔ فلاں غزل بھی سنیں گے فلاں بھی مکرر اشاد وغیرہ۔

ہم نے ایک دو لطیف اشارے تو کیے لیکن حضرات برابر بجٹ 'مہنگائی' وزارتی تبدیلیوں' مسئلہ کشمیر وغیرہ کی بحثوں میں جٹے رہے اور خواتین ایک دوسرے کے غراؤں اور دوپٹوں کے بھاد پوچھتی رہیں یا بندوں اور چوڑیوں کو ہاتھ لگا لگا کر جا چمتی رہیں کہ واقعی مومن کی ہیں یا کہنے والی جھوٹ کہہ رہی ہیں۔ آخر ہمارے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا اور ہم نے دتین جمابہاں لے کر کہا کہ صاحبو نان کہ خوروی خانہ برو۔ اب جاؤ رات کے بارہ بجے ہیں ہمیں سونا بھی ہے اور صبح صبح یہ کرسیاں اور برتن جو خاص اس دعوت کے لیے مستعار لیے گئے تھے دھودھا کے ہمسایوں کو واپس بھی کرنے ہیں۔



دو سپاسنامے جناب گاد کی آمد اور حضرت خر کی رفت کی تقریب میں

خطبے سپاس نامے سہرے وغیرہ بھی اب آداب مجلس ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے کہنے سننے کے لگے بنہ ہر طریقے ہیں۔ پچھلے دنوں کچھ چھوٹے بڑے افسروں اور عہدیداروں کی تبدیلیاں ہوئیں اور سپاسناموں کی مانگ ایسی بڑھی کہ ڈاک خانے اور کچہری کے سامنے بیٹھنے والے منشیوں اور رنگین چھپائی کرنے والے پریسوں کا کاروبار چمک اٹھا۔ خیال خاطر احباب سے کچھ سپاسنامے ہمیں بھی تصنیف کرنے پڑے اور اس دوران ہمیں خیال آیا کہ ان کی عبارت مقرر کر کے رفاہ عام کے لیے شائع کر دی جائے تو بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ ضرورت مند حضرات فقط اس میں ناموں وغیرہ کی تبدیلی کر کے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ ان عبارتوں میں فقط الفاظ ہمارے ہیں نفس مضمون ہم نے ان جلسوں کی تقریروں سے اخذ کیا ہے جو پچھلے دنوں اس سلسلے میں ہوئے۔ یاد رہے کہ آج کل بہ نظر کفایت آنے والے اور جانے والے دونوں کو ایک ہی جلسے میں بلا لیا جاتا ہے۔ رس گلے اور پکوڑے کھانے سے پہلے یا بعد (کہ پروگرام کا سب سے دلچسپ اور ہر دلعزیز حصہ ہی ہوتا ہے) میزبانوں کا نمائندہ

اولا جانے والے افسر یا عہدے دار کی طرف روئے سخن کرتا ہے۔

حضرت خراس محکمے سے دس سال تک وابستہ رہے ہیں۔ ان کا دور ہر طرح سے سنہری دور تھا۔ اس ملک میں ان کا نعم البدل ملنا مشکل ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگ خرد کو یتیم محسوس کریں گے کیونکہ یہ سوچنا کہ اس قحط الرجال میں ایسا یا اس کے پاسنگ بھی لائق اور مہربان افسر پھر کبھی نصیب ہو سکتا ہے۔ نیاں است و محال است و جنوں۔ لہذا ہمیں ان کے رخصت ہونے کا دلی افسوس ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ در پیدا

تالیاں بجتی ہیں اور لوگ بچے کھچے پکڑے اور رس گلے چٹ کر کے پیروں سے ایک ایک کو کولا کی مزید فرمائش کرتے ہیں ادھر ہیز بان اپنا روئے مخاطب آنے والے کی طرف کرتا ہے۔

”اسی کے ساتھ ہم جناب گاؤ کے آنے کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کی قابلیت اور شرافت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے محکمے کے حق میں مسیحا ثابت ہوں گے اور اسٹاف کو ماضی میں بعض کھلی ہوئی بے انصافیوں، بے قاعدگیوں اور صوبائی تعصب کی بنا پر جو شکایات پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ان کا ازالہ فرمائیں گے۔ فی الحقیقت محکمہ کے لوگ ایک مدت سے دست برد عاتق تھے کہ ان کو بھی ایسا مہربان اور منصف المزاج حاکم نصیب ہو۔“

اب آداب کا تقاضا یہ ہے کہ رخصت ہونے والا افسر شکریے کے کچھ کلمات کہے۔ حضرت خراس فرماتے ہیں۔

”مجھے آپ صاحبوں سے جدا ہونے کا دلی افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ میری کوٹھی جو آپ کے محکمے سے وابستگی

کی مختصر مدت میں تعمیر ہوئی اور یہ کار بھی جسے خریدنے کا میں اسی دوران قابل ہوا۔ ہمیشہ آپ لوگوں کی یاد دلاتی رہے گی۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایک بار پھر مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع عطا فرمائے۔“

اب جناب گاؤ پر بھی واجب ہے کہ وہ اس موقع پر کچھ کہیں۔

”میں خود کو آپ لوگوں کے درمیان پا کر بہت خوش ہوں۔ میں اس سے پہلے بہت جگہ کام کر چکا ہوں۔ بعض محکمے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ادھر سے نیچے تک سب کے منہ کو پیسہ لگا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ محکمہ ایسا نہیں اور چونکہ آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ پاک۔ آپ لوگ میرے اس فیصلے کا یقیناً خیر مقدم کریں گے کہ میں سب سے پہلے اس بات کی تحقیق کراؤں گا۔ آیا اس محکمے کے چھوٹے بڑے افسر رشوتیں لے لے کر جائدادیں تو نہیں بناتے رہے۔ تحقیقات بالکل بے لاگ ہوں گی اور مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچایا جائے گا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں باری تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ مجھے اپنے دوست اور پیشرو حضرت خرقے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

اس پر سب لوگ تہ دل سے آمین کہتے ہیں۔ آخری دعائیہ فقرے پر ان لوگوں کی جان میں جان آتی ہے جو پہلا حصہ سن کر کچھ بے چینی محسوس کرنے لگے تھے اب آنے والا بھی اور جانے والے بھی جی کڑا کر کے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہیں اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ بیرے ایک ایک کو کا کولا اور لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔



بحث کچے اور پکے گانوں کی

ایک مراسلہ نگار نے اخبار میں شکایت کی ہے کہ ہم بیرون ملک تو موسیقاروں اور رقصاؤں کے جتنے بھیجتے ہیں لیکن اسکولوں میں ان پر پابندی ہے۔ خط میں دلیلیں تو بہت مضبوط ہیں لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ مکتوب نگار کا منشا کیا ہے۔ آیا اسکولوں میں رقص و موسیقی کو جائز قرار دیا جائے یا بیرون ملک وفد بھیجنے بند کر دیے جائیں۔ اپنی وضاحت کر دینی ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات ابہام کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو مرزا غالب کے ساتھ ہوا تھا۔ انہوں نے ایک روز چاؤ میں آکر محبوبہ سے فرمایا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تھی۔ اُس ستم ظریف نے ان کو اٹھا دیا کہ اچھا یہ بات ہے۔ تو باؤ۔ ہوا کھاؤ۔

افسوس کہ رقص و موسیقی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ناچ تو ہم نہ گنگنی کا ناچ سکتے ہیں نہ کوئی اور گانوں کے متعلق البتہ اتنا معلوم ہے کہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کچے دو مرے پکے کچے گائے جاتے ہیں اور پکے گانوں غرارہ کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں ایک بزرگ ہمارے مہمان ہوئے تھے۔ ان کا کمرہ ہمارے کمرے کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ صبح دم عجیب عجیب آوازیں سن کر ہماری آنکھ کھل گئی۔ چونکہ موسیقیوں کا باڑہ بھی اوپر ہی تو تھا لہذا پہلے نیال ہوا کہ تیل ذکرارہا ہے لیکن

بیچ کا دروازہ ڈرا سا کھول کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہیں۔ ہمارے مہمان عزیز ہیں۔ ایک کان ہاتھ پر ہے دوسرا اوپر اٹھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے ایک جگہ مرگی کا ایک مریض دیکھا تھا۔ اس لیے بھاگے بھاگے پڑوس میں حکیم صاحب کو بلالائے کہ ان کا کچھ کیجیے۔ انہوں نے آ کر دیکھا تو الٹا ہمیں ڈانٹا کہ بے وقوف یہ تو تاجدار موسیقی استاد تان توڑ خان ہیں۔ یہ بنکار نہیں رہے بلکہ ریاض کر رہے ہیں۔ بھاگیشرمی کا خیال گا رہے ہیں۔



استاد کے متعلق کہا جاتا تھا کہ پارس ہیں۔ پتھر کو سونا بنادیتے ہیں لیکن ہماری بد قسمتی کہ ان سے فیض نہ حاصل کر سکے۔ ورنہ سینکڑوں شاگردان کے اس وقت ملک کی فلم کمپنیوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسی ایسی دھنیں ایجاد کرتے ہیں کہ لوگ سرو دھنتے ہیں جو آزاد منش ہیں یعنی نوکری پسند نہیں کرتے وہ سارنگی یا استارالے گلے میں جھولی ڈال گلیوں میں نکل جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ تانبے کا پیسہ یا مٹھی بھرا مادے دیتا ہے اور چین سے گزر ہو جاتی ہے۔ استاد کا ایک لڑکا اس وقت میوزیک ڈائریکٹر ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اخبار میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ فلم ”گھسیارے کی بیٹی“ میں ناظرین۔ گیت سن کر ایسے وجد میں آئے۔ ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ کرسیاں اسٹیج پر کھینچ ماریں۔ اس فلم میں اسی عزیز کا میوزک ہے۔ دوسرے نے ایک بینڈ پارٹی بنا رکھی ہے اور بیاہ شادیوں میں بلایا جاتا ہے۔ ہفتہ میں پانچ چھ دن پانچوں گھی میں رہتی ہیں۔

ایک لڑکا ان کا البتہ مالا لائق نکلا۔ مالا لائق تو نہ کیسے کیونکہ سگریٹ پیتا تھا تو کان سے دھواں نکالتا تھا اور پتنگ کی ڈور کو مانجھا لگانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ ہاں آواز اس کی بے بیگم اور پھٹی ہوئی سی تھی۔ نہ وہ فلم کمپنی کے کام کا تھا نہ بیاہ شادیوں کی محفلوں کے۔

آخر باپ نے سوچ سوچ کے اسے پکے گانے کی راہ پر لگایا۔ اب وہ ریڈیو پاکستان کا ایک نامی گویا ہے اور دنیائے موسیقی میں بڑے ہانس علی خان کے نام سے مشہور ہے اگر کسی گھر میں بچے چپ نہ ہوتے ہوں تو ماں کہتی ہے۔ ”کھولوں ریڈیو سنواؤں استاد ہانس علی خان کو“ وہ فوراً سہم کر چپ ہو جاتا ہے۔ ریڈیو کے سامعین کے اصرار پر آج کل ان کا پروگرام دن میں نہیں بلکہ نیم شب کے قریب ہوتا ہے۔ بسن کو اعلیٰ درجے کی موسیقی کا ذوق ہے وہ ریڈیو اپنے ساتھ غسل خانے میں لے جاتے ہیں اور می بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔



پچھلے دنوں ریڈیو پاکستان کے ہفتہ خواتین میں بھی کچے پکے گانوں کا اہتمام ہوا لیکن ریڈیو والوں نے افراط و تفریط سے کام لیا۔ کچے گانے بہت ہی کچے رہ گئے تھے اور پکے زیادہ ہی پکے گئے تھے بلکہ جل گئے تھے۔ پھر بھی کچے گانوں کی حد تک خیریت رہی البتہ کچے گانوں پر ریڈیو نے تھر تھرا نا اور بم جج کرنا شروع کیا جو بچے چپ تھے رونے لگے اور جو در رہے تھے یکا یک چپ ہو گئے۔ ایک بزرگ ددڑے آئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے کہا کچھ نہیں ہو رہا بس بھاگیشری کا خیال ہو رہا ہے۔ بولے یہ بی بھاگیشری کون ہیں اور اظہار خیال کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ ابھی ہم جواب سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور بزرگ پرانے خیال کے آگئے اور دو تین حٹ تک کھڑے بغور سنتے رہے۔ اس کے بعد یہ فرما کر چل دیے کہ آج سمجھ میں آیا اسلام نے موسیقی کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔

کس نفسی کی بات اور ہے۔ یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کہ ہمیں موسیقی سے یکسر لگاؤ نہیں ہے۔ سازوں میں ہمارا محبوب ساز ریڈیو ہے اور گانوں میں ہم قوالی اور کمرشل پروگرام کے عاشق ہیں۔ پہلے قوالی سے ہمیں رغبت نہ تھی۔ لیکن مزار حضرت گھوڑے

شاہ کے سجادہ نشین میاں حمید اختر نے ہمیں پچھلے دنوں اپنے (یعنی اپنے پیر کے) عرس سراپا قدس پر بلایا اور فیض احمد فیض کی تو الیاں سنوائیں تو ہمیں حال آ گیا۔ اب کمرشل پروگرام کے گانے ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ سہل متنع ہوتے ہیں۔ سیدھے گوئی کی طرح دل پر آ کر لگتے ہیں۔ ہمارے جن ہم عصروں نے یہ لازوال نغمے تخلیق کیے ہیں وہ یوں بھی مزے میں ہیں۔ مرزا غالب ہی سے مقابلہ کر لیجیے کہ اپنی طرف سے نوائے سروش لکھتے تھے لیکن لوگ ان کو مشکل گردانتے تھے اور اپنے زمانے کا عبدالعزیز خالد کہتے تھے۔ معاش کا یہ حال کہ قرض خواہ جینے نہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں کلب بھی نہ ہوتے تھے کہ آدمی سرعام جوا کھیل سکے۔ چورمی چھپے کوشش کی تو جیل میں پہنچا دیے گئے۔ کمرشل پروگرام کے شاعروں سے نہ کوئی مشکل گوئی کی شکایت کرتا ہے نہ انہیں جیل ہوتی ہے (یہ الگ بحث ہے کہ وہ اس کے مستحق ہیں یا نہیں) آج مرزا غالب زندہ ہوتے تو ملکہ و کنور یا یا صاحب ڈپٹی کمشنر کے قصیدے لکھنے اور پھر بھی انعام سے محروم رہنے کے بجائے ذیل ردئی بنا سیتی گئی، تو تھ پیسٹ یا معجون قبض کشا بنانے والے کسی کارخانے دار کے در دولت سے وابستہ ہو جاتے اور چمکین کرتے۔



بات گانے سے شاعری تک پہنچ گئی اس لیے کہ دونوں کے درمیان جو میکرو ہن لائن ہے وہ متنازعہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہم شاعر غفر غود خوش گفتار تو ہیں لیکن مشاعروں جیس نہیں جاتے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ ایک نشست میں جہاں معززین شہر جمع تھے۔ ہمارے بعض احباب نے کلام پڑھا اور ترنم سے پڑھا۔ ہم سے کہا گیا تو ہم نے قدرے تکلف سے گام لیا۔ اس پر ایک سیٹھ صاحب نے ہمارا دل بڑھانے کو کہا کہ ”آپ نہیں گاتے؟ ارے صاحب گائیے نا“ خیر ہماری بات الگ ہے سبھی ایسے مہینچہ نہیں ہوتے۔ ہمارے ددحت جمیل الدین عالی شاعر بے بدل جس طرح آنکھ

بند کر کے لکھتے ہیں اسی طرح آنکھیں بند کر کے ترنم سے پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ وہ ایک محفل کی بات سناتے ہیں کہ میں نے اپنی اچھی سی اچھی غزلیں دوہے اور گیت پڑھے اور آواز میں بھی پنچم مدھم ہر سر میں نکالیں، لیکن شرکائے محفل کہ کار دہاری دنیا کی جان تھے اور زیادہ تر جوڑیا بازار کے آڑھتی بے چینی سے پہلو بدلا کیے۔ آخر ایک نے اپنے جی کی کہی کہ عالی صاحب اب کوئی فلمی گیت بھی ہو جائے۔ عالی صاحب کہتے ہیں کہ دل کی کیفیت تو کیا عرض کروں لیکن خیال غاظر احباب سے جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ مورالال دوپٹہ ملل کا۔ اور تانگے والا خیر منگد اُدغیرہ گائے اور سب خوش خوش اٹھے۔ اب میں کسی محفل میں جاتا ہوں تو پہلے پوچھ لیتا ہوں کہ کسی آڑھتی یا سیٹھ کو تو نہیں بلایا۔ بلایا ہے تو فلمی گیتوں کی گالی ساتھ لے لوں۔



شعر لکھوالیجے یا پنچر لگوالیجے

لاہور لاہور ہے۔ اس کے قائل ہم اب کے لاہور جا کر ہوئے۔ اب اور کلچر اس کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ ہم ایٹ روڈ سے داہنے ہاتھ منگمری روڈ کو مڑے ہی تھے کہ غالب آٹو زکا بورڈ نظر آیا۔ معلوم ہوا وہاں موٹریں اور کاریں مرمت کرنے والے بھی ویاں غالب سے قال لیتے ہیں۔ تھوڑی دور آگے میر ہینئر کٹنگ سیلون تھا۔ ہم نے ٹھٹک کر سنا تو معلوم ہوا کہ اسٹاوا ایک گاہک کی شہرگ پر استرا رکھے اسے میر تقی میر کے ایات سنار ہے ہیں اور باقی لوگ آہیں بھر رہے ہیں اور آگے گئے تو مصحفی انجینئرنگ ورکس نظر آیا جہاں ٹیوب ویل کے پرزے بفتے ہیں اور بار عایت نرخوں پر سپلائی کیے جاتے ہیں۔ ناسخ فرنیچر اسٹور اور آتش لائڈری اور حالی سویٹ مارٹ بھی نظر آئے حتیٰ کہ گڈیوں کی ایک دکان دیکھی جس پر شائقین کا ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شبلی نعمانی پتنگ اسٹور ہے اور مالک اس کے اویب فاضل پاس ہیں۔ ادبی ذوق کی یہ ریل پیل کچھ اب کے نظر آئی ورنہ اس سے پہلے تو یہی ہوتا تھا کہ مزنگ میں ایک صاحب نے دکان کھولی اور اس کا نام رکھا 'عاجی دی ہٹی' چند دن بعد اس کے سامنے دوسری دکان کھل گئی۔ وہاں بھی چار پائی کا بان بکتا تھا۔ نام تھا "عاجی دے لبتے دی ہٹی۔"

ایک اور بات جو مشاہدے میں آئی، یہ تھی کہ دکان ایک ہوتی ہے لیکن اس پر کاروبار کئی کئی ہوتے ہیں۔ مثلاً انارکلی میں ایک دکان ہے جس کا عنوان ہے۔ ”مرزا عینکوں والے اور دانتوں والے“ پہلے ہم کو تعجب ہوا کہ یہ کیا پہچان کرانے کا طریقہ ہے۔ عینک تو ہم بھی لگاتے ہیں اور دانت خدا کے فضل سے ہمارے بھی سلامت ہیں۔ اس میں مرزا صاحب کی تخصیص کیا ہے۔ پتا چلا کہ نہیں، نہ مرزا صاحب عینک لگاتے ہیں نہ ان کے منہ میں دانت ہیں۔ یہ تو ان کا کاروبار ہے۔ جس کا جی چاہے ان سے عینک لگوالے۔ جس کا جی چاہے دانت اکٹڑ والے یا بنوالے۔ آگے ایک اسٹور نظر آیا جہاں ہر قسم کے عطریات اور گھوڑوں کے لیے چارہ ملتا ہے۔ اکبری منڈی میں گز شکر کے ایک تاجر سے ملاقات ہوئی جو فالو وقت میں اسلامی فلمیں بناتے ہیں۔ میکوڈروڈ پر ایک شخص کو دیکھا کہ سائیکلوں کے پنچر لگاتا ہے۔ لیکن اس کے بورڈ پر جہاں ہر دلعزیز سائیکل ورکس لکھا ہے وہیں ایک کونے میں شاعری کا لُج بھی مرقوم ہے۔ ہم جواز راہ تجسس ان کے قریب رکے تو بولا۔ فرمائیے کیا خدمت کروں۔ سائیکل کو پنچر لگوانا ہے یا مشاعرے کے لیے غزل کھوانی ہے۔ پنچر کا ریٹ چار آنے ہے اور غزل تن آنے فی شعر۔ ہم نے دریافت کیا کہ پنچر کا ایک آنا زیادہ کیوں ہے۔ شعر کے برابر کیوں نہیں فرمایا۔ پنچر میں تو ولا تہی سیلوش استعمال ہوتا ہے جو خاصا مہنگا ہوتا ہے۔ شعر لکھنے میں کون سا مسالا لگتا ہے۔



ماہنامہ فنون کا دفتر اب تو خیر انارکلی ہی میں اور جگہ چلا گیا ہے۔ پہلے گر جا کے سامنے ایک چوبارے میں تھا۔ اسی میں حکیم حبیب اشعر صاحب مطب بھی کیا کرتے تھے۔ سامنے کے برآمدے میں احمد ندیم قاسمی صاحب تشریف رکھتے اور اہل ذوق کا مجمع چائے کے خم لٹھ ہاتا۔ دوسرے میں حکیم صاحب قارورے دیکھتے اور دوائیں دیتے۔

راستہ بہر صورت ندیم صاحب ہی کے کمرے میں سے جاتا تھا۔ لوگ پہلے آ کر انہی کے پاس بیٹھتے۔ وقفے وقفے سے ندیم صاحب اعلان کر دیتے کہ جو حضرات کھانسی زکام وغیرہ کے سلسلے میں آئے ہیں دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ ان کے پاس فقط ادب کے مریض رہ جاتے۔ ایک روز کی بات ہے کہ بہت سے لوگ تو یہ اعلان سن کر اندر چلے گئے۔ ایک صاحب اجنبی صورت بیٹھے رہ گئے۔ قاسمی صاحب نے فرمایا۔ آپ شاید کوئی غزل یا نظم لے کر آئے ہیں۔ اس پرچے میں تو گنجائش نہیں اگلے پرچے کے لیے غور کریں گے۔ اگر آپ کا تب ہیں تو نمونہ چھوڑ جائیے اور اگر ایجنٹ ہیں تو بتائیے آپ کے شہر میں کتنے فنون کی کھیت ہو سکتی ہے اور اگر آپ مالک مکان کی طرف سے کرایہ وصول کرنے آئے ہیں تو ایک مہینے کی مہلت اور دیجیے قاسمی صاحب نے اپنی دانست میں اس شخص کی منطقی ناکہ بندی کر دی تھی۔ لیکن وہ مرد شریف سنی ان سنی کر کے ان کے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔ حکیم صاحب دو روز سے دست آرہے ہیں۔ ان کے بند کرنے کی کوئی ترکیب کیجیے۔

ادھر حکیم حبیب اشعر صاحب کو شکایت ہے کہ ندیم صاحب اپنے مریضوں کو میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز ایک بزرگ تشریف لائے۔ میں نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا زبان دکھائیے۔ اس نے کہا جناب میری زبان پر آپ حرف نہیں رکھ سکتے، میرے گھرانے کی زبان سے ایک دنیا سند لیتی ہے۔ یہ غزل میں لایا ہوں آپ خود ہی اندازہ کر لیں گے۔“

حکیم صاحب نے کہا۔ غزل کی بات تو مجھے معلوم نہیں لیکن آپ کو قبض معلوم ہوتی ہے۔ یہ نسخہ لے جائیے۔ نہار منہ طباشیر کے ساتھ استعمال کیجیے۔ انشاء اللہ صحت ہوگی۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ شفا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اس مریض کو واقعی صحت ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے کوئی غزل نہیں لکھی۔



بھائی دروازے کے سامنے سے گزریے تو ایک جگہ پہلوان لسی اسٹور و بک سیلرز کا بورڈ نظر آئے گا۔ ہم نے پہلوان صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے لسی کا ایک قد آدم گلاس پیش کرتے ہوئے بیان کیا کہ لسی بنانا ان کا خاندانی پیشہ ہے اور کتابیں اس لیے بیچتے ہیں کہ خود بھی تصنیف و تالیف کے شوقین ہیں۔ انہوں نے ہمیں ایک پمفلٹ بھی دیا۔ ”فوائد لسی“ اس کا نام ہے اور ویدہ زیب چھپا ہے۔ معلوم ہوا وہ لسی گزٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کرنا چاہتے ہیں اور ڈیٹیکٹریشن کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ ہم نے ”فوائد لسی“ کا سرسری مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے بعض اہم نکات چھوڑ دیے ہیں۔ ہم تن توجہ ہو کر بولے۔ فرمائیے۔ ہم نے کہا ”حکما کا قول ہے کہ لسی پینے والے کے گھر میں کبھی چوری نہیں ہو سکتی۔ لسی پینے والے کو کتنا نہیں کاٹتا اور لسی پیئے والا کبھی بڑھا نہیں ہوتا ہے“ ہم تن اشتیاق ہو کر بولے۔ ”اس اجمال کی تفصیل ارشاد کیجیے“۔ ہم نے جان کی امان پا کر عرض کیا کہ لسی پینے والوں کو مسلسل کھانتے دیکھا ہے سو جس گھر میں ایک بھی آدمی رات بھر کھانتا ہے وہ چور کے کام کا نہیں۔ پھر یہ کہ باومی کی وجہ سے چند دن میں اس کا بدن جڑ جاتا ہے اور ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے۔ لاچار اسے چلنے کے لیے ہاتھ میں چھڑی یا لاٹھی لینی پڑتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کتنا لاٹھی سے ڈرتا ہے۔ اب استاد نے پوچھا کہ بڑھا کیوں نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا لسی پینے والا اس عمر کو پہنچ ہی نہیں سکتا جہاں سے بڑھا پا شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے بہت پہلے خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔



اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تو

بچوں کو بزنس مین بنادیتے

چند ترکیبیں تعلیم سے محفوظ رکھنے کی

اسکولوں میں داخلوں کی مشکلوں کے متعلق اخباروں میں پچھلے دنوں بہت کچھ آتا رہا ہے۔ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے ہم سے اصرار کیا کہ تعلیم اتنا بڑا مسئلہ ہے اس پر آپ بھی کچھ لکھیے۔ ہم نے بہت عذر کیا کہ ہم خود چنداں تعلیم یافتہ نہیں ہمیں معاف رکھا جائے۔ لیکن اس کا جواب یہ ملا کہ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہے ہیں۔ کسی مسئلے پر بے لاگ اور موثق رائے وہی دے سکتا ہے جس کا اس سے تعلق نہ ہو۔ بعضوں نے مثالیں بھی دیں کہ دیکھو فلاں سیٹھ نے جو کچھ لکھا پڑھا نہیں فلاں مشاعرے کی صدارت کس خوبی سے کی۔ فلاں شخص جو ساری عمر عربی کا مدرس رہا ہے اس نے حکومت کی ایکسپورٹ امپورٹ پالیسی کی حمایت میں کتنا اچھا مراسلہ اخبار میں لکھا ہے۔

یہ دلیلیں اپنی جگہ صحیح ہیں اور ہمیں اس مسئلے پر لکھنے کا واقعی حق پہنچتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کس پہلو سے لکھیں۔ یہ مسئلہ لوگوں کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ حکومت یا کوئی ادارہ تو انہیں

مجبور نہیں کرتا کہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجو۔ اور اپنے لیے اور معاشرے کے لیے مسائل پیدا کرو۔ بچا اسکول جائے گا تو اس کے لیے کپڑے، وردی، فیس، چندے، سب چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ نہیں جائے گا تو نہیں پڑے گی۔ ایک سیٹھ سے ہماری یاد اللہ ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو گنتی سکھا کر کاروبار میں لگا دیا اور وہ کامیاب بزنس میں ثابت ہو رہے ہیں۔ ان سے ہم نے پوچھا تو انہوں نے کہا ہمیں تو اسکولوں میں داخلے کی مشکلات کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔ لوگ تو خواہ مخواہ شور مچا رہے ہیں۔ کیوں نہیں اپنے بچوں کو بزنس میں لگاتے۔ ان کے لیے آکس ملیں اور کھالیں رنگنے کے کارخانے کھولتے۔

ایک اور بزرگ ان کے ہم رائے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ہمارے زمانے میں تعلیم عام نہ تھی تو لوگ سچ بولتے تھے اور پورا توالتے تھے۔ انہوں نے اکبر الہ آبادی کے اشعار کے حوالے بھی دیے کہ وہ کتابوں کو قابل ضبطی سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر فرعون بچوں کو تیغ تلوار کے گھاٹ اتارنے کی بجائے کالج کے گھاٹ اتارتا تو اس کا منشا پورا ہو جاتا اور قتل کی تہمت بھی نہ آتی۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ لوگ عقل کی بات نہیں سنتے اور علموں بس نہیں کرتے موصوفہ کردہ راج نیست چرا کارے۔ حکومت کو تو تب الزام دیا جائے اگر اس نے تعلیم کا لازمی قرار دیا ہو۔



پچھلے دنوں کئی امتحانات کے نتیجے شائع ہوئے۔ ہم نے جس زمانے میں پڑھا ہے پاس ہونا اور نئی کلاس چڑھنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اکثر لوگ تو اس پر مبارک بادیں دیتے اور وصول کرتے تھے اور بعض انتہا پسند مٹھائی وغیرہ بھی بانٹتے تھے جو والدین زیادہ بردبار اور سنجیدہ طبع تھے وہ بھی کم از کم اس بات پر صف ماتم نہ بچھاتے تھے۔

ہمارے ایک دوست کے بیٹے نے اب کے سیکنڈری بورڈ کا ایک امتحان دیا تھا اور اس کا رول نمبر اتفاق سے ہمارے پاس تھا۔ اب کے اتوار کو نتیجہ نکلا تو ہم نے دیکھا کہ صاحبزادے پاس ہو گئے ہیں۔ ہم انہی پرانی روایات کے عادی حالات حاضرہ سے بے خبر مٹھائی کا ایک ڈبائے مبارک باد دینے پہنچ گئے۔ وہاں کچھ اور ہی حال دیکھا۔ چاندنی نیچھی تھی۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور کچھ لوگ منہ لٹکائے ماتمی صورت بنائے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا خیر باشد؟ کہیں عزیز فیل تو نہیں ہو گیا۔ اخبار میں تو اس کا رول نمبر پاس ہونے والوں میں ہے۔ ہمارے دوست بولے یہی تو رونا ہے۔ نالائق پاس ہو گیا ہے اور یہ تقریب اس کے داخلے کے مسئلے کی تقریب میں ہے۔ اب کے ہم نے اس کو فلمیں بھی خاصی دکھائی تھیں۔ ٹیڈی لباس بنوا کر ایک اسکوٹر بھی لے دیا تھا۔ گھر میں ریڈیو تو تھا ہی۔ کمرشل پروگرام اور فرمائشی پروگرام بھی باقاعدگی سے سنواتے تھے۔ فلمی پرچوں کا بھی ہمارا گھر باقاعدہ خریدار ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چھپ چھپا کر اسکول کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ ہم سے کہتا تھا کہ دریا پر مچھلی پکڑنے جا رہا ہوں۔ یار دوستوں کے ہاں تاش کھیلوں گا یا فلاں جگہ زندہ ناچ گا نا اور تمبولا ہے لیکن اصل میں لاہریری یا اسکول چلا جاتا تھا۔ گھر میں بھی یہ چالاکی کرتا تھا کہ باہر جاسوسی ناول کی جلد ہوتی تھی۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ اندر گرائمر یا تاج کی کتاب ہے۔ امتحان ہوا تو اس وقت بھی اس نے ہمیں دھوکے میں رکھا کہ پرچے خراب ہوئے ہیں۔ آپ فکر نہ کیجیے ضرور اچھے نمبروں میں فیل ہوں گا۔ لیکن اب اس کے کروت سامنے آ گئے ہیں۔ نہ صرف پاس ہوا ہے بلکہ سیکنڈ ڈویژن بھی لی ہے۔ بورڈ سے نمبر نکلانے کے لیے عرضی تو دی ہے کہ ممکن ہے غلطی سے پاس ہو گیا ہو نمبر جوڑنے میں چوک ہو گئی ہو۔ لیکن امید کوئی نہیں ہے ہماری تو قسمت پھوٹ گئی۔

☆☆☆

ثابت ہوا کہ یہ ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کیونکہ سب لوگ تو ایسے خوش قسمت نہیں کہ ان کے بچے فیل ہو جائیں اور داخلے کے مسائل سے بے نیاز وہ نتیجہ آتے ہی گئی کے چراغ جلائیں یا مٹھائی بانٹیں۔ والدین اس سلسلے میں حکام تعلیم کو بڑی حد تک قصور وار گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امتحان کے پرچے طالب علموں کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے نہیں بنائے جاتے بلکہ فاضل ممتحن اپنی صلاحیت کے مطابق بناتے ہیں لہذا وہ نہایت آسان ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی بچہ بھی حل کر سکتا ہے۔ پھر وہ ہوتے بھی نصاب کی کتابوں میں سے ہیں، باہر سے نہیں رہی کسر پرچہ دیکھنے والے پوری کر دیتے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے بے درد اور شقی القلب لوگوں کی ہے کہ کسی کو فیل ہی نہیں کرتے ایسا لگتا ہے جیسے ان کی اپنی اولاد ہی نہ ہو۔

ہم نہیں کہتے کہ سبھی ممتحن ایسے منتقم المزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اچھے لوگ بھی ضرور ہوں گے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے لڑکے فیل بھی ہوتے ہیں لیکن یہ شکایت بے بنیاد بھی نہیں۔ ایک ممتحن کو ہم خود جانتے ہیں کہ بیوی سے اس کا سخت جھگڑا ہوا تھا۔ قرض وار بھی پریشان کر رہے تھے اور اسکول میں اس کی ترقی بھی رکی ہوئی تھی اس کا بخارا نہ ہوں نے غریب طالب علموں پر نکالا۔ جس کا پرچہ سامنے آیا اسے ستر اسی فیصدی نمبر دیے گئے۔ حالانکہ بعض طالب علموں نے بڑی محنت سے سوالات کے جواب غلط لکھے تھے اور بعض نے تو پرچے کو رے چھوڑ رکھے تھے۔ کسی سوال کو ہاتھ ہی نہ لگایا تھا۔



اس کا حل ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اسکول اور کالج بند کر دیے جائیں اور بورڈ اور یونیورسٹیاں توڑ دی جائیں۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اکا دکا لوگ پھر بھی گھر دیاں مسجدوں میں پڑھنے سے باز نہیں آئیں گے لیکن داخلے میں مشکلات کی شکایتیں کم از کم نہ رہیں گی۔

اس سلسلے میں ایک بات ہمیں اپنے تعلیمی اداروں سے بھی کہنی ہے۔ پچھلے دنوں بعض اسکولوں نے اپنے پھاٹک بند کر کے باہر سنتری بھی تعینات کر دیے تھے کہ طالب علم یا ان کے والدین اندر نہ گھس آئیں۔ بعض جگہ تو سنا ہے۔ ہاں سالانہ چارج بھی ہوا۔ بے شک ہم مانتے ہیں کہ اسکولوں میں طالب علموں کا کیا کام۔ اگر طالب علموں نے داخلہ لینے کی کوشش کی تو یہ ان کی زیادتی ہے لیکن سبھی لوگ تو اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے کہ اپنا برا بھلا سمجھ سکیں۔ ان کو محبت اور ملامت سے سمجھانا چاہیے کہ تعلیم کے کیا نقصانات ہیں اور تعلیم کا پھیلاؤ معاشرے کے لیے کیوں خطرہ ہے۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ جس طرح اس نے جا بجا فیملی پلاننگ سنٹر کھول رکھے ہیں اس طرح کے سرگز کھولے جن میں مانع تعلیم ترکیبیں بتائی جائیں۔



جنگ نہیں رہی رسل تھی

روداد ایک حربی اور ضربی مشاعرے کی

بھارت کی افواج قاہرہ ادھر سے مار کھانے کے بعد دانت تیز کر رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان کا رخ کیا جائے۔ لیکن کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ چین نے اٹی میٹم دیا کہ ”تم نے جو چھین ناجائز چوکیاں ہماری سرحد کے اندر بنا رکھی ہیں اٹھاؤ ان کو ورنہ بھارت کی فورا چین بول گئی۔“

پہلے تو بھارت نے کہا۔ ”ہماری کوئی چوکیاں وہاں نہیں۔“ چین دالے کھکارے تو کہا۔ ”اگر ہیں تو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔“ چین نے پھر آنکھیں دکھائیں تو بولے اگر چھوٹی نہیں بھی تو ان میں سپاہی تھوڑا ہی ہیں۔“ جب یہ ثابت ہو گیا کہ سپاہی ہیں تو کہا ”بالفرض ہیں بھی تو کیا ہوا۔ چین ہم سے پہلے کہتا ہم پہلے چوکیاں خالی کر دیتے۔ اتنی اے تے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ہم بھی عزت دار ہیں۔“

سنا ہے بہت سے بھارتیوں کو تو پتا بھی نہ چل پایا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ وہ چوکیوں کو وہو چوکیاں سمجھے جو غسل خانے یا بادرچی خانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے شور مچایا۔ اے ہے کیا غضب ہو گیا۔ چوکیاں ہی تو ہیں یہاں بچھالیں یا دہاں بچھا

لیں۔ مشکل یہ ہے کہ چین والے جو پینتیس چالیس سال سے لڑ رہے ہیں چوکی کے اور کوئی معنی سوائے فوجی چوکی کے جانتے ہی نہیں۔ ہم نے اپنے ایک چینی دوست سے ایک روز کہا کہ ہم نے اپنے گھر کے لیے ایک چوکی بنوائی ہے پوری ساگوان کی لکڑی ہے۔ اس نے کہا اچھا کتنا گولا بارود رکھا ہے اس میں؟

جب چین کے الٹی میٹم کے بعد بھارت میں قبض کشادہ ایں مکنی بند ہوئیں تو ایک روز بھارتی لیڈروں نے مسکوٹ کی کہا یہ تو عجیب ملین بلکہ مہل شے ہے اس سے ہماری بڑی بیٹی ہوئی۔ خیر چین نے ہمارے ساتھ یہ داؤ کیا ہے تو ہم پاکستان کے ساتھ کریں۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان کو ایک الٹی میٹم بھجوا دیا۔

الٹی میٹم بھجوانے کے بعد بھارتی لیڈروں نے انتظار کرنا شروع کیا کہ اب پاکستانی زعماء و پٹہ گلے میں ڈالے آتے ہیں کہ ہمارا قصور معاف کیا جائے۔ آئندہ غلطی نہ ہوگی۔ لیکن جب کچھ بھی نہ ہوا تو ناچار ایک احتجاج بھجوا دیا۔ ”کہ ہم نے تمہیں الٹی میٹم بھیجا تھا تم ڈرے کیوں نہیں؟“

لڑائی میں جو ہوا سب کو معلوم ہے۔ آخر ایک روز مندرجی کو اعلان کرنا پڑا کہ سجنو۔ یہ جنگ تو فظہ ریہرسل تھی جو جنگ اب شروع ہوگی وہ فیصلہ کن ہوگی۔ یہ ایک طرح سے اعتراف تھا کہ چھپلی بار ہم سے لڑنے میں کسر رہ گئی۔

اس پر لوگوں کو ایک اظیفہ یاد آیا کہ ایک ہوائی مشق میں ایک ہوا باز جہاز سے محض ایک جائگہ پہن کر کودنے کو تھا اس کے افسر نے کہا تمہارا پیراشوٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا وہ میں نہیں لایا۔ وہ تو سچ مچ کی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے یہ تو محض ریہرسل ہے۔ لیکن جاتی پر مندرجی کی تقریر کا اثر اٹا ہوا۔ لوگوں نے کہا نابابا۔ جب ریہرسل میں اتنی مار پڑی ہے تو اصلی مجلد اور باتصویر لڑائی میں تو نہ جانے کیا ہوگا؟

☆☆☆

بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب

اس ہفتے پھر ہمارے دشمنوں کی طبیعت خراب رہی، جو لوگ اردو محاورے کی نزاکتوں سے واقف نہیں وہ جان لیں کہ یہ ہم اپنی طبیعت کی بات کر رہے ہیں۔ یہ ایک پیرایہ گفتگو ہے اور اس کا موقع استعمال خاص ہے۔ ہم نے ایک بار زیادہ نستعلیق بننے کی کوشش میں ایک صائب کو جا کر بایں الفاظ مبارک دی تھی کہ سنا ہے، آپ کے دشمنوں کی ترقی ہو گئی ہے۔ مٹھائی کھلو ایسے، وہ بجائے خوش ہونے کے ہم پر خفا ہو گئے۔



ہم بالعموم بیمار پڑنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کچھ تو عدیم الفرستی کے باعث کچھ اخراجات کے ڈر سے، لیکن کبھی کبھی خلق خدا کا خیال آ ہی جاتا ہے یعنی یہ لحاظ کہ ہم بیمار نہ ہوئے تو اتنے یونانی، عبرانی، ایلو پیٹھی، ہومیو پیٹھی اور فنٹ پاتھی معالجین کیا کریں گے، کہاں سے کھائیں گے۔ ایک صاحب کا قول اسی مضمون کا ہے کہ میں بیمار ہوتا ہوں تو ڈاکٹر سے نسخہ لکھواتا ہوں اور اس کو اس کی فیس دیتا ہوں کیونکہ اس کا گزارا اسی پر ہے۔ اسے بھی جینا ہے پھر کیسٹ کے ہاں جاتا ہوں اور سکچر اور پڑے بندھواتا ہوں اور اس کا حق اسے ادا کرتا ہوں کیوں کہ اسے بھی جینا ہے۔ پھر باہر آ کر نسخہ اور دوائیں

بدرو میں پھینک دیتا ہوں۔ کیونکہ مجھے بھی جینا ہے، زندگی مجھے بھی عزیز ہے۔
 دیکھا جائے تو دنیا میں پیشہ کوئی بھی بے کار نہیں حتیٰ کہ ڈاکٹر اور گورکن کا بھی نہیں
 ، کیونکہ بیماری اور موت سبھی کے ساتھ لگی ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے طور پر
 ہمارے محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطب کے ددھے کر دیے ہیں۔ ایک
 میں وہ خود بیٹھتے ہیں، دوسرے میں ان کا لڑکا لٹھا اور کافور بیچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے
 ہاتھ میں اللہ نے ڈگری نہیں دی نہ سہی۔ وہ بھی انہوں نے بہ ذریعہ ڈاک کہیں سے
 حاصل کر لی لی ہے۔ لیکن برکت ضرور دی ہے کیونکہ مجمع ہم نے مطب کے دونوں
 حصوں میں کثیر دیکھا۔ بعض لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ شفا فقط اللہ کے ہاتھ میں
 ہے۔ ڈاکٹر تو بس فیس مشورہ اور دو انجکشن کے پیسے لینے کا گنہگار ہے۔ وہ خدائی
 معاملوں میں کیوں دخل دینے لگے۔ لاہور کے ایک مشہور حکیم کا تعارف کسی نے ہم
 سے ان لفظوں میں کرایا تھا کہ ان کا نام تم نے سنا ہوگا۔ بہت نامی گرامی شخصیت ہیں۔
 علامہ اقبال انہی کے ہاتھوں مرے تھے۔ یہاں بھی ایک ڈاکٹر ایک روز ایک محفل میں
 ازراہ تعلیٰ کچھ ایسا ہی فرما رہے تھے کہ فلاں فلاں وزیر، امیر اور سیٹھ میرے زیر علاج
 رہے ہیں۔ ہمیں بھی یہ اشتیاق ہوا کہ علاج کرا کر ان بڑوں کی صف میں داخل
 ہو جائیں لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ان مشہور مریمضوں میں سے اب کوئی بھی بہ قید
 حیات نہیں ہے تو محض اتفاق کی بات لیکن ہم ڈر گئے کہ خود بھی کہیں اتفاقات کی پلیٹ
 میں نہ آجائیں۔



آج کل لوگ اپنی پکری بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ مثلاً
 ایک دکاندار نے اعلان کیا ہے کہ آپ دو دوڑے جوڑوں کے ہمارے ہاں سے خریدیں
 تو آپ کو ایک جوڑا ہم اپنی طرف سے دیں گے۔ یہ دکاندار دتی کا ہے لہذا محاذ رہا

بھی استعمال کر گیا ہے۔ آپ اگر ایمپریس مارکیٹ کی پشت کے بازار سے گزریں تو ایک جگہ یہ لکھا پائیں گے کہ دو بڑے کفن خریدنے والے کو ایک چھوٹا کفن بچے کا مفت ملے گا۔ ہمیں معلوم نہیں اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے والے کتنے ہیں۔ لیکن سنا ہے دو بڑی قبریں کھدوانے پر گورکن حضرات بھی ایک چھوٹی قبر مفت میں کھود دیتے ہیں۔ افسوس کہ ڈاکٹروں نے جن کے پیشے کا تعلق ان امور سے اتنا قریب کا ہے، کبھی یہ رعایت نہ دی کہ دو بڑوں کا علاج پیسے لے کر کریں تو چھوٹے بچے کا علاج مفت کر دیں۔ غالباً ڈاکٹروں کی اسی بے مروتی اور کج خلقی کے باعث ہی لوگ ان کے پاس جانے کی بجائے رعایت دینے والے مذکورہ بالا دکانداروں کے پاس سیدھے چلے جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وقت بھی بچتا ہے پیسے بھی۔



لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کون سا طریقہ علاج زیادہ پسند ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں کسی طریقہ علاج کے خلاف تعصب نہیں بشرطیکہ دوا ہمیں مفت ملے۔ چونکہ ہماری طبیعت صلح کل ہے۔ لہذا بیماری کا اثر ہوتے ہی ہم سب سے پہلے اپنے دوست حکیم طبابت حسین کو جا کر نبض دکھاتے ہیں اور خمیرہ گاؤز بان چاٹ کر ان کے ہتھ کے ددکش لیتے ہیں۔ آگے ڈاکٹر سرور کی دکان پڑتی ہے۔ وہ دیکھتے ہی ہمیں تھرما میٹر لگا کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ ہم سے پرانا ٹبل مانگا گیا تو ہمارا درجہ حرارت کیا ہوگا۔ پھر اسٹتھسکوپ لگانے کے بہانے ہماری جیب ٹٹولتے ہیں اور اگر وہ خالی ہو جیسی کہ اتفاق سے ہمیشہ ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بھلے چنگے ہو تمہیں کوئی بیماری نہیں۔ چلتے ہو۔ اگلی گلی میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر ایم ایم خاں کا ”ہنومان کلینک“ ہے۔ نام ان کا میاں محمود خاں ہے، لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو ایم ایم خاں کو ملک الموت نماں کا مخفف گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر ان کے ہاں بڑے حرفوں میں لکھا ہوتا ہے اور ہو میو چھوٹے لفظوں میں۔ پیسے

ہمارا خیال تھا کہ 'ہومیو' کا لفظ ہوم سے نکلا ہے یعنی جو شخص گھر بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر بن جائے۔ وہ ہومیو لکھنے کا مستحق ہے لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ طب کی ایک باقاعدہ اور اہم شاخ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بورڈ لکھنے والے سے کہا تھا کہ "بہنی مان کیونک" لکھ کے لاؤ کیونکہ بہنی مان صاحب ہومیو پیتھی کے بانی تھے۔ وہ شخص کم پڑھا لکھا تھا اور پاکستان بننے سے پہلے رام لیلا اور وسہ کے لیے تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ "ہنومان کیونک" لکھ لایا۔ خرابی اس نام میں اور تو کوئی نہیں، ہاں بعض مریض ڈاکٹر صاحب کی شکل سے دھوکا کھا کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید ان کا سلسلہ نسب ہنومان تک جاتا ہے ہمارے خیال میں یہ غلط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



ہوائی سفر بھی کوئی سفر ہے؟

نہ نام پتا پوچھا جاسکے نہ ولدیت نہ بچوں کی تعداد نہ ان کی عمریں

آج یہ ستم دیکھا جائے تو یہ سفر بھی کوئی سفر ہے کہ ابھی لمبوں پر رخصت کرنے والوں کے لیے خدا حافظ پھر ملیں گے اگر خدا لایا وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے رومال آنکھوں سے پوری طرح اوجھل نہیں ہوتے کہ پیشوائی کرنے والوں کے رومال اور صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ جب تک یہ تیز رفتار جیٹ جہاز نہ چلے تھے کہ ناشتا کھائیں کراچی میں تو لندن میں ٹفن کوچ کر دکھائیں۔ تب تک کم از کم ہم کراچی سے لاہور آتے جاتے میں ایک دو صفحے کسی رسالے کے پڑھ لیتے تھے۔ ایک آدھ پیالہ چائے کی، کسی مسکراتی ہوئی ایئر ہوسٹس کے نازک ہاتھوں سے ہمارا شرف قبول پاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم ساتھ بیٹھے مسافر کا نام بھی پوچھ لیتے تھے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ہم سیٹ پر بیٹھ کر حفاظتی بند باندھ ہی رہے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے منزل آگئی ہے۔ کرم نما و فردخا کہ خانہ کا نہ ٹسٹ۔ جو ایئر ہوسٹس ذرا تیز بولتی ہیں وہ تو جلدی جلدی دونوں طرح کے اعلان کر لیتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم آپ کو خیر مقدم کہتے ہیں اور اس کے بعد دوسرا یہ کہ منزل آگئی اترے۔ لیکن پچھلی بار لاہور سے آتے میں ایک ایئر ہوسٹس صلابہ کہ ذرا آہستہ چلتی اور آہستہ بولتی تھیں قلتِ وقت کے باعث ایک ہی اعلان کر

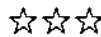
پائیں۔ ”خواتین و حضرات۔ ہم پی آئی اسے کی پرواز نمبر فلاں پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اپنے حفاظتی بند باندھ۔ میرا مطلب ہے کھول لیجیے۔ کیونکہ لاہور آگیا ہے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار ہوگا۔ السلام علیکم۔“

سفر کا اصل مزہ ریل ہی میں ہے۔ جہاز کے سفر میں ہمارے ساتھ چالیس پچاس مسافر ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی شخص کے متعلق کما حقہ معلومات حاصل نہ ہوئیں۔ اس کا موقع ہی نہ ملا۔ کون کیا کرتا ہے۔ اس کی ولدیت قومیت اور سکونت کیا ہے۔ بچوں کی تعداد کیا ہے۔ عمر کیا ہیں۔ کتنے ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی کیا کیفیت ہے۔ آپ کے شہر میں آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے۔ تمباکو اور اصلی گھی کی دستیابی کی کیا صورت حال ہے۔ وغیرہ بس جہاز سے اترے اور اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھا گھروں کو روانہ ہو گئے۔ یہی توجہ ہے کہ آج کل انسانوں میں باہم محبت اور انس نہیں ہے اور یہ تہذیب کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی سے کچھ کلام نہ کرو، منہ باندھے گردن اکڑائے بیٹھے رہو۔ یہ خیال نہیں کہ آپ کے پاس جو بھلا مانس بیٹھا ہے اس کے بھی کچھ براہم ہوں گے۔

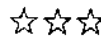
کیا عجب اس شخص کو اسی کی ضرورت ہو۔ آپ غزل کہتے ہیں ممکن ہے یہ شخص صاحب ذوق ہو۔ موز و گداز والے کلام کا قدردان ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کی جیب میں آپ کے پسندیدہ سگریٹ ہوں۔ اس سارے خلا ملا کے لیے جو وقت درکار ہے وہ سوائے ریل کے کہیں بھی نہیں مل سکتا۔ ہم نے یہاں تک دیکھا کہ دو اجنبی ایک ساتھ ریل میں بیٹھے اور اگلے اسٹیشن پر اترتے اترتے ایک دوسرے کے سدھی جن چکے تھے۔

سفر کے ساتھ لوازم سفر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہوائی جہاز کا سفر اگر سفر ہو تو اس کے لوازم بھی ہوں۔ بستر کی ضرورت نہیں، لوٹے کی حاجت نہیں۔ حقہ ہوائی جہاز کے اندر

بیٹھ کر پینے کا رواج نہیں۔ ریل کے سفر میں رخصت کرنے والے بالعموم کہا کرتے ہیں کہ جاتے ہی خط لکھنا۔ تاکید ہے۔ بھول نہ جانا۔ اور رستے میں سامان پر نظر رکھنا۔ اب جانے والا کہتا ہے کہ گھنٹے بھر میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے فون کروں گا۔ اب تو ڈائریکٹ لائن ہے۔ سامان کے نام سے ایک موٹ کیس ہے۔ سو نیچے جہاز کی ڈگی میں ہے۔ ایک بریف کیس ہاتھ میں ہے۔ اس قسم کا کسی چھوٹے قصبے میں نکل جائیں تو لوگ آپ سے بال کٹوانے کا اشتیاق ظاہر کریں۔ ناشتے دان تک ساتھ نہیں رہتا



ہم نے جب سے ریل کا سفر ترک کیا ہے۔ اندوں پر اٹھوں کو ترس گئے ہیں۔ یہ ہمارے ریل کے سفر کا لازمہ تھا۔ صبح کے ناشتے کے لیے ہمارے گھر والے انہیں ثقیل سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ ہوائی جہاز میں پیک تھوکنے کی جگہ نہیں۔ جب تک سفر میں رہو۔ پان کو ترسو، منہ باندھے بیٹھے رہو۔ یہی لیل و نہار رہے تو کوئی دن مشرقیت ہمارے درمیان سے بالکل ہی اٹھ جائے گی۔



ہم منگولیا نہیں گئے تھے

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب جب ہفتے کا ساتواں دن ختم ہوتا ہے

ہم نے پچھلے ہفتے اپنے کراچی سے باہر جانے کا ذکر کیا تھا۔ ہم لاہور گئے تھے، منگولیا وغیرہ نہیں گئے تھے۔ اپنے جانے کی اطلاع گوہم نے ایک مصلحت کی وجہ سے عام کرنا پسند نہ کی تھی۔ بلکہ جانے کے روزائے پی پی دیسری نیوز ایجنسیوں اور اخباروں کو فردا فردا فون کر کے کہہ دیا تھا کہ ہم کتاب میلے کے افتتاح کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ اس کی خبر نہ چھاپیے گا۔ اور اگر چھاپے بنا نہ رہ سکیں تو معمولی طور پر صفحہ اول پر چوکھٹے میں بے دیجیے گا۔ دو کالمی سہ کالمی سرخی لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ذاتی پبلسٹی کو نامی پسند کرتے ہیں۔ ریڈیو والوں کو بھی ہدایت کروئی کہ اپنے پلیٹن کی خاص خاص خبروں میں ہمارا نام نہ لائیے گا۔ ہاں دوسری خبروں کی حد تک ہم اتنی سختی سے آپ کو منع نہیں کرتے کہ آپ کو برا معلوم ہو۔

ان لوگوں کو منع کرنے کی احتیاط ہم نے اس لیے کی کہ اخبار والے ہمیشہ رہتے اسی کھوج میں ہیں کہ کون کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے؟ آپ خود ہر روز اخبار میں دیکھتے ہوں گے کہ آج صدر ایوب کراچی پہنچیں گے۔ یا گورنر محمد موسیٰ کا پرسوں

سرگودھا سے والپسی کا پروگرام ہے۔ کوئی پوچھے کہ آپ کو کسی کے آنے جانے سے کیا مطلب؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں یہ حضرات جاتے ہیں لوگ جلوس اور جھنڈیاں لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ٹریفک رک جاتا ہے۔ خیر اور کسی کی ذمہ داری ہم نہیں لیتے۔ ہم یہ کسی صورت نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے ایسی خرابی پیدا ہو۔ ٹریفک رکنا تو ایک طرف۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہماری وجہ سے کبھی دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو۔ ہمیں لینے اور چھوڑنے والوں کی تعداد ہمیں اور سامان اٹھانے والے قلی کو شامل کر کے کبھی پانچ سے متجاوز نہیں ہو پائی۔

یہاں اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اخبار والوں نے اب کے ہم سے ہماری توقع بلکہ ہدایات سے زیادہ تعاون کیا۔ ہم ہفتے بھر تک تمام اخبارات بڑے غور سے پڑھتے رہے ہیں۔ کہیں ان میں ہماری آمد و رفت کی طرف اشارہ نہیں ملا حالانکہ ہمارے جاپان جانے کے موقع پر انہی اخباروں نے ہم سے بری طرح عدم تعاون کیا تھا۔ ہم نے اپنے جانے کی اطلاع فوٹو کے ساتھ کہ ہمارے پاس بہت سے بے کار پڑے تھے ہر نیوز ایجنسی اور اخبار کو بھیج دی تھی۔ اپنے پروپیگنڈے کے لیے نہیں جس کا بھلا اللہ ہمیں کبھی شوق نہیں رہا بلکہ عوام الناس کی اطلاع کے لیے لیکن نہ کسی نے خبر چھاپی نہ تصویر۔ ایک دو روز ناموں نے اتنا کہا کہ آپ چاہیں تو ہم اسے بہ طور اشتہار اجرت پر چھاپ دیں۔ لیکن یہ ہمیں منظور نہ ہوا۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم تو اپنے کج خلوت اور گوشہ گمانی میں مست رہنے والے آدمی ہیں۔

بائیں ہمہ احتیاط معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے جانے کی خبر کسی نہ کسی طرح نکل گئی اور پولیس والوں تک پہنچ گئی۔ نتیجتاً انہوں نے لاہور میں ہفتہ ٹریفک کا آغاز کر دیا تاکہ اگر ہمیں ہوائی اڈے پر لینے والے لوگ ہجوم کی شکل اختیار کر جائیں تو اسے سنبھالا جاسکے۔ ہم ان لوگوں کی ساوگی پر بہت ہنسے کہ ان لوگوں نے ہمیں بھی دوسرے بڑے

آدمیوں کا سا سمجھا۔ ہم نے تو لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر سوائے اس کے کہ
مائیکروفون پر ایک دوبار اعلان کیا یا کسی کو کانوں کان اپنے آنے کی خبر نہ ہونے دلی۔
چھپ چھپاتے وہاں سے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے۔

عالم ہمہ افسانہ مآوار و مآبج



ہمارے ملک میں لوگوں کو بھیڑ چال کی عادت ہے۔ یہ نہیں کہ اپنے ذہن سے کوئی
بات پیدا کریں۔ ہم نے کتاب میلے کے ہفتے کا اعلان کیا تو پولیس والوں کو ٹریفک کا
ہفتہ منانے کی سوچھی۔ ریلوے والوں نے کہا ہم کیوں پیچھے رہیں انہوں نے پابندی
وقت کے ہفتے کا اعلان کر دیا۔ ہفتہ صفائی کا غفلت بھی بلند ہوا حتیٰ کہ لاڑکانہ والوں نے
بھی یہ اشتہار دیا کہ ہم ہفتہ ردپوش اشتہاری ملزمان مناتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں یہ
ہفتہ کیسے منایا گیا۔ آیارہ پوش ملزموں کے اشتہار دیے گئے یا اشتہاری ملزموں کو ردپوش
ہونے کی آسانیاں بہم پہنچائی گئیں۔ بہر حال سنا ہے یہ ہفتہ بھی ہمہ وجوہ کامیاب رہا۔
کراچی میں ہفتہ صفائی ہماری دایسی سے ایک روز پہلے ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے جو صبح
اپنے جمعدار گھیسے خاں سے کہا کہ میاں ہمارے دروازے پر سے کوڑا اٹھاؤ۔ ”اکیلے نہ
جانا“ کے گیتوں کی کاپی پھر پڑھنا تو وہ حیران ہو کر بولا کہ صاحب آپ اخبار نہیں
پڑھتے۔ ہفتہ صفائی تو کل ختم ہو گیا۔



کتاب میلے کے ہفتے میں ہمیں ہر طرف بچے ہی بچے اور کتابیں ہی کتابیں نظر
آئیں۔ بچے آخر بچے ہیں۔ کتابوں پر پلے پڑے تھے۔ جوں جوں بڑے ہوتے
جائیں گے سر حقیقت ان کے ہاتھ آتا جائے گا اور ان میں سے چند ایک یقیناً اس رتبہ
اعلا کو پہنچیں گے جو ہمارے ایک مشہور ماہر تعلیم نے حاصل کیا تھا۔ ان کے جانے

والوں کا بیان ہے کہ وہ فخر یہ کہتے تھے میرے گھر میں کوئی کتاب نہیں سوائے ٹیلی فون ڈائریکٹری کے۔ آخری کتاب انہوں نے ۱۹۲۵ء میں پڑھی تھی جب کہ لندن میں زیر تعلیم تھے۔ یہ بات ان کی ترقی درجات میں بہت مدد ہوئی۔ آج کچھ ہیں کل ترقی کر کے کچھ ہو گئے۔ پھر تو ان کی اس میدان میں عظمت کا ایسا شہرہ ہوا کہ تعلیم اور کتابوں کے متعلق کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ ہو پاتا تھا۔ کراچی کے ایک مشہور سیٹھ سے ہماری ایک بار گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم ان سے یہ سن کر خوش ہوئے کہ جب تک وہ رات کو اپنے دفتر کی تمام کتابیں نہ پڑھ لیں ان کو نیند نہیں آتی۔ ہم نے ان کتابوں کے نام پوچھے تو پتا چلا کہ ان کا مطلب اکاؤنٹ بکس سے ہے یعنی کھاتے کی کتابیں۔ انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت میر نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن اس کتاب میلے کا تعلق نہ ٹیلی فون ڈائریکٹریوں سے تھا نہ ہی کھاتے کی کتابوں سے۔ اس کا مقصد ان کتابوں کا فردغ تھا جو ہم آپ پڑھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درحت ہوگا کہ نہیں پڑھتے۔ ادیبوں کے لیے تو یہ بات قابل معافی ہے۔ اگر وہ کتابیں پڑھنے لگیں تو لکھیں کس وقت؟

لیکن کتاب میلے میں تقریریں کرنے والے بہت سے صاحبوں اور صاحبزادوں نے بتایا کہ ہمیں ہمارے والدین باقاعدہ منع کیا کرتے تھے کہ یہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ اور کوئی ڈھنگ کا کام کر دو۔

بیگم تنہا محمود نے کہ مشہور ماہر تعلیم ہیں اور کتاب میلے کے مذاکرے کی ڈائریکٹر تھیں، بتایا کہ ”ایک بار میں نے صوبے کے مختلف اسکولوں کا اچانک دورہ کیا۔ اور ہر جگہ باکر پہلا سوال یہی کیا کہ مجھے اس اسکول کی لائبریری دکھاؤ۔ بچانوں نے فیصد اسکولوں میں یہی جواب ملا کہ جناب وہ الماری جس میں کتابیں ہیں اس کی چابی گم ہو گئی ہے۔ کوئی

کہتا ہے کہ کلرک کے پاس ہے۔ اور کلرک لمبی چھٹی پر گیا ہے۔ کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ سابقہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے ساتھ بے ایمانی کر گئے۔ ریٹائر ہوئے تو اس کی چابی بھی ہمراہ لے گئے۔“ انہی بیگم ست نام نے بتایا کہ ”میں جب ہوائی میں تھی اور مکان کی تلاش میں تھی تو جو شخص کسی مکان کی سفارش کرتا ان الفاظ میں کرتا کہ اس سے چند سنٹ کے فاصلے پر ایک بہت اچھی لائبریری ہے۔ ایک صاحب نے کہا کرایہ تو کچھ زیادہ ہے۔ لیکن آپ فلاں مکان لیجیے۔ اس کے پڑوس میں دو تین لائبریریاں ہیں۔“ ست نام محمود نے ایک بات اور پتے کی کہی۔ فرمایا میں بہت سیمیناروں اور مذاکروں میں شریک ہوتی رہی ہوں جن کے لیے یا جن کے متعلق وہ ہوتے ہیں بس وہی ان میں نہیں ہوتے۔ اگر کوئی سیمینار دیہاتیوں کے لیے ہے تو اس میں سبھی ٹائی کوٹ والے صاحب ہوں گے۔ دیہاتی ایک بھی نہ ہوگا۔ بچوں کے کتاب میلے کے متعلق یعنی مجھے یہی گمان تھا کہ یہاں بس بڑے بڑے تعلیم یافتہ گدھ ہوں گے۔ بچے نہیں ہوں گے۔ لیکن کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہاں تو ہر طرف بچے ہی بچے ہیں۔“ ایک مہماندہ بزرگ کو یہ گفتگو پسند نہ آئی۔ بولے۔ ”یہ آپ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں؟“ ہمارا خیال تھا وہ ناراض ہوں گی۔ الٹا ہنس دیں اور بولیں۔ ”شکریہ۔ میں آپ سے یہی کہلوانا چاہتی تھی۔“

تباحث ہفتے منانے میں یہ ہے کہ ہفتہ صرف سات دن کا ہوتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ ٹریفک کے ہفتے کے دوران میں تو حادثوں کا زور رہتا ہے۔ اس کے گزرنے پر کم ہو جاتا ہے۔ درست لگانے کا ہفتہ ختم ہوتے ہی کار پر درازان ہفتہ درختوں کی ٹہنیاں اکھاڑ پھینکتے ہیں جو بے طور پودوں کے سرخوں کے دورویہ نصب کی جاتی ہیں۔ پچھلے سال جو بسوں والوں نے ہفتہ خوش اغلاقی منایا تو اس میں ہم نے دیکھا کہ جو کنڈیکٹر ہے باچھیں پھیلائے آپ‘ جناب‘ حضور بندہ نواز کہہ کر بات کر رہا ہے۔ اس ہفتے کے

آخری روزِ وقتِ اختتام یعنی بارو بجے سے ایک دو منٹ پہلے ہم نے ایک کنڈیکٹر کو دیکھا کہ گھڑی بھی دیکھے جا رہا ہے اور مسافروں سے بھی خطاب کر رہا ہے کہ حضرات۔ زحمت نہ ہو تو ذرا ٹکٹ لے لیجیے۔ بی بیو بہنو ذرا سٹ سٹ کر۔ میاں جی ذرا فٹ بورڈ سے ادھر تشریف لے آئیے۔“ اس کے بعد یکا یک کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ ”اے بابو بس تیرے باوا کی ہے جو یوں پھیل کے بیٹھا ہے۔“ یہ اعلان تھا اس بات کا کہ بارہ بج گئے ہفتہ خرش اغلاقی بہ خیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ پھر ملیں گے اگر خدا نے ملایا۔

قیس اور فرہاد سمجھ دار آدمی تھے
سرتے مر گئے عمر بھر شادی نہ کی

یہ مہینہ شعبان کا خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے تو ہے ہی ہمارے سیکولر یعنی دنیا دارمی کے نقطہ نگاہ سے بھی۔ آپ بھی منکے میں سے اپنی اچکن نکال لئیے ایک رات تنکے کے نیچے رکھنے کے بعد اسے زیب تن کیجیے اور سر پر دو پلی ٹوپی جما دیدوں میں سر سے کی تحریر کھینچ، بھلے آدمیوں کی سی صورت بنا شہر میں نکل جائیے اور اللہ کی قدرت کاملہ اور شانِ رزائی کا تماشا دیکھیے۔

جہاں آپ کو اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیر، بن اور تمبو قتاس نظر آئیں بس وہیں رک جائیے۔ وہی آپ کی سنزل ہے آپ اب بھی نہیں سمجھے؟ ہیس تو آپ کی ذہانت پر بہت اعتماد تھا۔

ارے صاحب یہ جگہ خیمہ و خرگاہ برپا ہے بریانی کی خوشبو دشمنِ ایمان و آگہی اور رہ زن تمکین و ہوش ہے اور بینڈ باجے کی آواز فردوسِ گوش ہے شادی کا گھر ہے۔ کس کی شادی کا۔ اس سے آپ کو غرض نہ ہونی چاہیے۔ بہر حال آپ کی نہیں۔

اس تمبو کے نیچے شادی کا رن یا تو پڑ چکا یا ابھی پڑے گا۔ بہر حال خانہ بے تکلف ہے تشریف رکھیے۔ ان لوگوں نے اگر آپ کو نہیں بلایا تو یہ ان کی غلطی ہے۔ آپ ان کی

دعوت میں نہ شریک ہوں گے تو یہ آپ کی غلطی ہوگی کیونکہ کسی دوسرے کی شادی غمی بالخصوص شادی میں شریک نہ ہونا تقاضائے انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ دوسرے پری چہرہ لوگ کہ شیردانا یاں پھٹکارتے پھر رہے ہیں سب کے سب مدعو تھوڑا ہی ہیں ان میں سے اکثر آپ ہی کی طرح جذبہ انسانیت سے مجبور ہو کر آگئے ہیں اور دعوت کھا کر اپنے اپنے گھر دں کی راہ لیں گے۔

ہمیں تو اس سارے مہینے میں شام اور دوپہر کے کھانے کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک آدھ دعوت سے اٹھا بھی دیے گئے تو خرچ نہیں۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی بلکہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ لوگ جو اتنا خرچ کرتے ہیں اگر ناشتے کا اہتمام بھی رکھا کرتے تو مزید خیرد برکت کا موجب ہوتا۔ ان کے حق میں بھی ہمارے لیے بھی۔

وجہ شادیوں کی اس ریل پیل کی قرب قیامت نہیں قرب رمضان شریف ہے۔ جن لوگوں کو اپنی زندگیاں بنانی یا بگاڑنی ہیں اس مبارک مہینے کی آمد سے پہلے اس کا سامنا کر لینا چاہتے ہیں۔ درنہ پھر عید کے بعد یہ بات جاری رہے گی اور شاعر کہہ گیا ہے۔

ولے کہ عاشق د صابر بود مگر سنگ است

زعشق تابہ صوری ہزار فرسنگ است

ہم آدمی نرم طبیعت کے ہیں لہذا جب کبھی کسی کی شادی میں شریک ہوئے دو لہیا میاں پر ترس آیا کہ بے پار اس وقت انجام سے بے خبر کیا خوش خوش بیٹھا ہے۔ کوئی دن میں یہ ساری عشق و عاشقی کی چوکڑی بھول جائے گا اور سنڈی میں آئے دال کا بھاد پوچھتا نظر آئے گا۔ ایک بچہ کاندھے پر ہوگا ایک گود میں اور دانگی تھا سے ہوں گے پھر بھی خیال ان بچوں میں لگا ہوگا جنہیں گھر پر چھوڑ آیا ہے۔ اس وقت اسے احساس ہوگا کہ قیس اور فرہاد ایسے بدھونہ تھے۔ جیسے داستانوں میں نظر آتے ہیں شادی کرنا چاہتے تو بخوبی کر سکتے تھے لیکن دانش مند تھے لہذا احمر کی ناک چھاننا اور پہاڑ

کا ثنا منظور کر لیا۔ لیکن عمر بھر کا ردگ پالنے سے پرہیز کیا۔ اب دیکھیے باراتی تو کھانے کے بعد خوشبودار پان کھا کر پلاؤ میں بنا پستی گھی ہونے کی شکایت کرتے ہوئے ایک ایک کر کے کھسک جائیں گے۔ دولہا بچارے کو تہوؤں اور دیگیوں کا کرایہ چکانا پڑے گا۔ ستے اور باورچی سے حساب فہمی کرنی پڑے گی اور ازدواجی زندگی کے دوسرے اور تیسرے مرحلے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ داناؤں نے الہا مرحلوں کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ شادی سے پہلے مرد بولتا ہے اظہار محبت وغیرہ کرتا ہے اور عورت سنتی ہے۔ شادی کے بعد عورت بولتی ہے اور مرد سنتا ہے۔ پھر ایک ردز یہ دونوں بولتے ہیں اور محلے والے سنتے ہیں۔ جس زندگی میں یہ تینوں مرحلے نہ آئیں اسے مکمل یا کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔



شادیوں میں ہم دولہا بلہنوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا جی رکھنے کو یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ لیکن رشک ہمیں اس سارے ہنگامے میں اگر آتا ہے تو رد لد و محمد وین ایند سنز اور ان کے ہم پیشگان پر جنہیں اپنے کرایے سے مطلب ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ دولہا گنجا ہے یا دلہن گنجی ہے، دونوں شیعہ ہیں یا سنی، پنجابی ہیں یا یوپی کے شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پابند صوم صلوة ہیں یا میاں سیدھا میٹانے سے اٹھ کر آیا ہے اور سہرا اتارتے ہی سیدھا جوا خانے میں پہنچے گا۔ ہم نے شادی کا اہتمام کرنے والوں میں یہی ایک فریق تہو قاتوں والوں کا دیکھا جو ازدواجی زندگی کی قباحتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور امیر خسرو سے تعویذ لکھوا کے لایا ہے۔

سرا	جاشد	خرم	رائیز	جاشد
زین	وہقان	زاید	یا	نہ
			زاید	

آج کل اصلاح معاشرہ والے برابر یہ آواز بلند کر رہے ہیں کہ شادیوں کا خرچ گھٹنا چاہیے۔ جہیز پر پابندی ہو، مہمانوں کی تعداد محدود کر دی جائے۔ اس آخری بات کے تو ہم حق میں نہیں لیکن دوسری مدد میں تخفیف کی کچھ نہ کچھ گنجائش ہے۔ خراب وہ پہلے زمانے کا سا کروفر نہیں، بالخصوص شہروں میں۔ دولہا میاں کسی کی کار ادھار مانگ لیتے ہیں، پٹرول ڈلوالیتے ہیں۔ کار والا مفت کھانا کھانے کے لالچ میں کار وے دیتا ہے۔ باقی لوگ ٹیکسیوں، رکشاؤں میں آ جاتے ہیں یا بس کرائے کی لی جاتی ہے۔ باجے گا بجے کا دستور بھی اٹھتا جا رہا ہے۔ اور لارنس روڈ کے باجے والے اب کھیاں مارتے ہیں اور کار پوریشن کو فروخت کرتے ہیں۔ جہیز پر اب بھی کہیں کہیں پابندی ہے۔ دولہا کھلو بھیجتا ہے کہ بیس ہزار روپے سے کم کا نہ ہو اور اس میں یہ یہ چیزیں شامل ہونی چاہئیں۔ جہاں پابندی نہیں ہوتی وہاں وہن والے جو چاہتے ہیں دے ویٹے ہیں۔ بعض اوقات تو وہن کو میکے سے بیشتر کپڑے دیے ملتے ہیں جو ان کی والدہ کو اپنی والدہ سے ملے تھے۔ وہ دور اندیش بڑی بی پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے جب یہ کپڑے اپنے میکے سے لائی تھیں اسی وقت سوچ لیا تھا کہ پوتی کو ویس گے۔ آج کل اس زمانے کی چیزیں ملتی کہاں ہیں۔ آج کل کا کپڑا تو آج خرید پانچ چار سال میں پھٹ جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں ولہا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چار آدمی مل کر اسے گھوڑے پر چڑھاتے تھے اور بہ نظر احتیاط زین کے ساتھ باندھ دیتے تھے کہ گر نہ جائے یا ایک آدمی کو پیچھے بٹھا دیتے تھے جو اسے پکڑے رہتا تھا اور شہ بالا کہلاتا تھا۔ موٹروں اور مشینوں سے چلنے والی دوسری گاڑیوں کو شادی کے مبارک موقع پر خلاف وضع سمجھا جاتا تھا اور لوگ پالیکوں، پہلیوں اور تانگوں وغیرہ کا بندوبست کرتے تھے۔

ہمارے ایک جزیرے دوست شرفا کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو پرانی روایت کا پاس بہت ہے جسے انہوں نے اپنی شادی میں بھی ملحوظ رکھا۔ ہم اس جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ بس ایک وکٹوریہ کے کوزے میں سارا دریا بند تھا۔ دہن اور دوسرے قریبی رشتے دار وکٹوریہ کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ یہ دولہا بنے چہرے پر ہار۔ اس اہتمام سے ڈالے کہ قرض خواہ دیکھیں بھی تو پہچان نہ سکیں۔ اس وکٹوریہ کے گھوڑے پر تن کر بیٹھے تھے۔ باجے والے ”گھوڑی چڑھیا نی مائیں“ کی دھن بجا رہے تھے۔ کوچوان کے ہاتھ میں مورچھل تھا جسے وہ چابک کی طرح ان کے سر پر لہرا رہا تھا تاکہ جہاں جہاں ان کی پوشاک پر سالن یا میٹھا گرا ہے اس پر کھیاں بیٹھ کر انہیں تنگ نہ کریں۔ ہم چونکہ شہ بالا تھے۔ لہذا باقی باراتیوں کو پیدل چھوڑ کر ہمیں وکٹوریہ کے پیچھے کی اس سیٹ پر جگہ دی گئی جس پر لڑکے بالے ازراہ شرارت اچک کر سوار ہوتے ہیں اور کوچوان کے چھانٹا دکھانے پر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کم خرچ بالائین مثال سے اور لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ کم از کم عبرت تو پکڑ سکتے ہیں۔



سچ کے پاؤں نہیں ہوتے

قرض دینے سے محبت بڑھتی ہے فلسفہ روزے اور چاولوں کا

پچھلے دنوں ایک اخبار کے کالموں میں یہ بحث دیکھنے میں آئی کہ آیا ہر موقع پر سچ بولنا چاہئے یا کبھی کبھی تبدیلی ذائقہ کے لیے جھوٹ بولنے میں بھی حرج نہیں۔ ایک محترمہ نے کالم میں لکھا کہ وہ ہر موقع پر سچ بولنے کے حق میں ہیں۔ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پھیلیں یعنی لوگوں نے سمجھا کہ اس اصول کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے یا کم از کم آئندہ ہوگا۔ یہ بات نہیں انہوں نے تو ایک زریں اصول بیان کیا تھا لوگ ناحق اسے ذاتیات کی طرف لے گئے۔ وہ اس کی ترویج کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن چونکہ طبیعت مرنجاں مرنج پائی ہے اس لیے خاموش رہیں۔ خیر ان کی طرف سے ہم یہ وضاحت کر رہے ہیں کہ روزہ اپنی جگہ ہے چاول اپنی جگہ۔ یعنی ہم اپنے قارئین کو ان بزرگ کا قصہ یاد دلاتے ہیں جو رمضان شریف میں لوگوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ روزہ کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے۔ ایک روز کوئی ہم سانیا زمند کسی مسئلے مسائل کے سلسلے میں ان کے دروالت پر پہنچا۔ دستک دی تو بزرگ تھوڑی دیر میں میں واڑھی جھاڑتے ہوئے تشریف لائے اور دروازہ کھولا۔ احتیاط تو انہوں نے کی لیکن ایک گستاخ چاول پھر بھی

ریش مبارک میں کہیں اٹکا رہ گیا۔ نیاز مند نے کہا۔ قبلہ آپ لوگوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور خود آپ کا عمل یہ ہے کہ دن میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ بزرگوار نے کہا، کون کافر کہتا ہے کہ میرا روزہ نہیں ہے۔ نیاز مند نے چاول کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے ڈانٹا۔ اے بھلے آدمی غلط بحث کیوں کرتا ہے۔ روزہ اپنی جگہ چاول اپنی جگہ۔



خیر کہنا یہ تھا کہ غلط صحبت کی وبا پھیل جائے تو خدوان لیڈروں کو بھی اپنا پیٹ کاٹنا پڑے جو قوم کو ایثار کا درس دیتے ہیں۔ لیڈری یوں نہیں چلتی۔ یہ سبق کانگریسی لیڈروں سے لینا چاہیے کہ احمد نگر کے قلعے میں بھوک ہڑتال بھی کر رکھی تھی اور معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ چھپ چھپ کے بسکٹ بھی کھاتے تھے۔ لیڈری ہی نہیں اس سے ویناداری کے دوسرے کارخانے بھی بند ہو جائیں۔ ابھی کل ہی ایک حلوائی کے ہاں سے خالص تاندلیاں والہ کے گھی کے لڈولائے۔ تھوڑا انتظار بھی کرنا پڑا، اس لیے کہ وہ اس وقت مصلے پر بیٹھا کوئی وظیفہ کر رہا تھا۔ خالص کشائش روزی کا۔ تولتے تولتے اس نے زمانے پر لعنت بھیجی کہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ یہ بشارت بھی دی کہ بے ایمانی کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک گرم جگہ کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ چربی تو بے شک اس مٹھائی میں ہم نے خالص ہی پانی لیکن تول میں وہ پانچ میر کے بجائے چار میر نکلی۔ دور کیوں جاییے۔ ہماری گلی کی نلکا کا پان سگریٹ والا اپنے ہاں تختی لگائے ہوئے ہے کہ اوہار محبت کی قینچی ہے لیکن خود ہی اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمیں برابر چھ ماہ سے اوہار روے رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اس پانچ بار تقاضا کیا ہے اور ایک آدھ بار ناخوش گواہی تو تیار کی نوبت بھی آئی لیکن کچھری میں اب تک ہمارے خلاف نالاش نہ کی۔

ایک بار ہمارے ایک کرم فرمانے جن کا ہیر کنگ سیلون اس وجہ سے بند ہو گیا ہے کہ لوگوں پر ادھار زیادہ چڑھ گیا تھا اپنی دکان پر سے ”قرض مقرض محبت ہے“ کی تختی اتار کر ہمیں مفت دینے کی پیش کش کی تھی۔ جسے ہم نے لینے سے انکار کیا اس لیے کہ غیر ضروری منافقت ہم سے نہیں ہوتی۔ ہمیں تو ہر صبح کسی نہ کسی سے ادھار لینا ہوا۔ لوگوں سے قطع محبت کا خوف سوار ہوا تو ہمارا کام کیسے چلے گا۔ ویسے سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اکثر دیگر اقوال کی طرح اس مقولے کو بھی ہم نے اپنے عملی تجربے کے خلاف پایا ہے۔

اس کی ایک مثال لیجیے۔ شیخ سدو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ یہ وہ شیخ سدو نہیں جن کا ذکر عملیات اور جادو نوٹوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے وہ غالباً ان کے مورث اعلا تھے۔ اس وقت ہماری مراد شیخ صدر الدین سے ہے جن کی صدر میں صدیوں کی دکان ہے۔ عرصہ تین سال کا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دو دن کی واپسی کے وعدے پر ہم سے پچاس روپے لیے تھے۔ وجہ قرض اب ہمیں یاد ہے نہ انہیں۔ انہیں تو خیر کئی بار یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انہوں نے کبھی ہم سے یہ رقم لی تھی۔ کاروبار کے ہجوم میں ایسا ہونا قدرتی ہے۔ لیکن ہم اس کو کسی طرح نہیں بھولے اور یہ قرض کا رشتہ ہی اب بہت دن سے ہماری دوستی اور ملاقات کی وجہ سے ہے۔ اس واقعے سے پہلے ہماری ان سے سرراہے یا کسی بیاہ شادی میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ورنہ نہیں کیونکہ وہ رسالہ نہیں نکالتے جس کے لیے مضمون لینا پڑے اور ہم صدیاں نہیں خریدتے پہنتے کہ نئی روشنی کے آدمی ہیں۔ لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ دل ان میں لگا رہتا ہے۔ کسی کام سے ادھر جائیں تو ان کی دکان کا پھیرا کئے بغیر نہیں آسکتے۔ دل ہی نہیں مانتا۔ بڑے تپاک سے مزاج شریف ہوتی ہے جس کی وجہ سے کئی بار تو ہمیں اپنے سے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اتنے

خلوص کے آدمی سے پچاس روپے کی حقیر رقم کا ذکر چھیڑ بیٹھتے ہیں۔ لیکن بندہ بشر ہے بعض اوقات حرف مطلب زبان پر آ ہی جاتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ براہ راست نہ کہنا پڑے بلکہ گفتگو میں پچاس کا لفظ بار بار آئے جس سے ان کی یادداشت عود کر آئے مثلاً اس قسم کے فقرے ان سے گفتگو میں ہم سے اکثر سرزد ہوتے ہیں۔

”آج سیلون کی ٹیم نے پچاس رن کیے ہیں۔“

”روس کے انقلاب کو پچاس سال ہونے والے ہیں۔“

”صدر کے علاقے میں تو پچاسوں گداگر ہیں بھی۔“

”اب ہمارا گھٹنے کا درد پچاس فیصدی رہ گیا ہے۔“

ان فقروں کا کچھ اثر نہ دیکھ کر ہم ازراہ کمینگی نیم براہ راست بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ ”حکومت نے پچاس روپے والے نئے نوٹ جاری کیے ہیں۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ تم نے دیکھیے۔“ نتیجہ اس کا بھی کچھ نہ نکلا۔

لیکن ادھار کی بات تو ضمناً آ گئی۔ ہم ذکر جھوٹ سچ کا کر رہے تھے۔ ہم تھوڑا کام اشتہار بنانے کا بھی کرتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ یہ بات چت بھی پڑتی ہے اور پٹ بھی، ساحر لدھیالوی نے اپنے مجموعے تلخیاں کے اشتہار میں علامہ تاجور نجیب آبادی کی یہ رائے لکھ دی کہ ”ساحر اپنی غلط نگاری میں پختہ ہو چکا ہے۔ اسے زبان و بیان کا قطعی سلیقہ نہیں۔“ اس پر یہ کتاب خوب کبی۔ ممتاز مفتی کی کتاب ”علی پور کا ایللی“ کا اشتہار ہم نے دیکھا۔ اس میں مشتہر نے لکھا تھا کہ ”یہ وہی ناول ہے جسے آدم جی انعام کے فاضل ججوں نے (آگے ان کے نام بھی دیے تھے) متفقہ طور پر انعام کے ناقابل قرار دیا۔“ اسی حق گوئی کے صدقے اس کا پہلا ایڈیشن چند مہینے میں نکل گیا حالانکہ بیس روپے کی کتاب تھی۔ اور بھاری ایسی کہ کچھ کم بیس روپے اس پر محصول ڈاک لگتا تھا۔ البتہ نمکدان کے معاملے میں یہ نسخہ نہ چلا۔ طفیل احمد جمالی صاحب نے پہلے تو اس میں

خالی جگہیں پر کرنے کے لیے وہی گھسا پھٹا فقرہ لکھا جاتا تھا کہ ”نمکدان میں اشتہار دے کر اپنے کاروبار کو فروغ دیجیے۔“ جمالی صاحب سے منافقت نہ ہو سکی۔ انہوں نے لکھا کہ ”نمکدان میں اشتہار دے کر ہمارے کاروبار کو فروغ دیجیے۔“ نتیجے کا قیاس اس سے کیجئے کہ نمکدان کو بند ہوئے آج تیس سال ہوتے ہیں۔



ایسے لوگ تو بہت ملتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ کبھی ضرور بتایا کسی کے دباؤ کے تحت بولیں تو فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے دوستوں میں ایسے بھی ہیں کہ سچ بولیں تو پکڑے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو سچ بولنے کی کبھی مشق نہیں رہی اور چیز کوئی بھی ہو، مشق ہی سے حاصل ہے۔ یہ مقولے جو آپ نے بھی سنے ہوں گے۔

”سچ کے پاؤں نہیں ہوتے۔“

”سناچ کو آناج ہے۔“

”جھوٹے کا بول بالا۔ سچے کا.....“

ان کے ڈرائنگ روم میں بھی ہم نے یہی کچھ سب کچھ لکھا لکھا دیکھا۔

جھوٹ کہہ، جھوٹ کہہ، ہمیشہ جھوٹ کہہ

ہے بھلے مانسو کا پیشہ جھوٹ کہہ

یاد رہے کہ یہ بھلے مانس پیشے کے اعتبار سے اچھے لوگ ہیں۔



اسے اشتہار نہ سمجھا جائے

اخبار خواتین میں ہمارے کالم جس شان اور انداز سے چھپتے رہے ہیں اس سے بعض حلقوں میں چند در چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے پہلے شمارے میں جس صفحے پر ہمارا کالم تھا اسی میں ایک پہلو میں یہ مضمون بھی تھا کہ ”پاگلوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے۔“ اس میں کسی قسم کا اشارہ ہماری طرف نہ تھا، کم از کم ایڈیٹر صاحبہ کا بیان یہی ہے۔ دوسرے شمارے میں ہمارا مضمون جنس تریوں وغیرہ کے بارے میں تھا۔ اس میں ایک پرندے کی تصویر جو رات کو جاگتا اور دن میں موتا ہے۔ ہمارے نام کے آس پاس شائع ہو گئی تھی۔ ہمارے ہاں اس پرندے کے خلاف طرح طرح کے تعصبات ہیں۔ حالانکہ مغربی روایات میں اسے دانش مندی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اس توجیہ کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تصویر ہمارے نام سے ذرا دور ہٹ کر لگتی تو بہتر ہوتا۔ بہر حال ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ یہ بھی ایک امر اتفاقی ہے۔ زیادہ سنگین واردات تیسرے شمارے میں ہوئی جس میں ہمارے مضمون کا عنوان تھا۔ ”اشتہار ضرورت رشتہ کا“ اور عین اس کے ساتھ ایک بڑی سی تصویر ہماری تھی۔ ہمیں وہ مضمون خود پسند تھا اور ہمارا خیال تھا کہ کسی طرف سے داد کے خطوط آئیں گے۔ لیکن اب تک جو خطوط آئے ہیں، ان میں ہماری تعلیم، عمر، اور تنخواہ وغیرہ کے متعلق استفسارات ہیں جو غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر ہیں۔ اس مضمون کو مضمون ہی تصور کیا جائے اشتہار نہ سمجھا جائے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ اخبار خواتین کی ایڈیٹر صاحبہ اپنے منبر اشتہارات سے بھی اس بات کی وضاحت کر دیں، ازالہ پیشتر کہ وہ پانچ چھ مورد پے کا بل بنا کر ہم سے ادائیگی کا تقاضا شروع کر دیں۔

طلاق کے مقدمے میں میاں بیوی کے

درمیان راضی نامہ ہو گیا

”اخبار خواتین“ کے ابن انشاء صاحب نے پچھلے دنوں ادیب، صحافی، شاعر اور مزاح نگار کی حیثیت سے چار ہفتے تک عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا۔ واپسی پر وہ بہت کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ایک ہفتے بعد انہیں جاپان کے دورے پر روانہ ہونا تھا، اس لیے وہ اس ارادے کی تکمیل نہ کر سکے اور سنانے پر ہی اکتفا کر گئے۔ انہوں نے چین کی عورت کو جس حال میں دیکھا اور اس کے بارے میں ان کے جو تاثرات ہیں وہ ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ یہ بڑا سرسری سا جائزہ ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اس سے عظیم چین کی اس عظیم ہستی کے خدوخال ضرور سامنے آجائے ہیں جس کا نام عورت ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ چین تشریف لے گئے۔ کئی روز وہاں کوچہ و بازار میں گھومنے پھرے۔ واپسی سے ایک روز پہلے اپنے دوست سے پوچھا۔ ”کیوں جناب کیا چین میں عورتیں نہیں ہوتیں۔“

ان کے دوست نے کہا۔ ”خیر باشد۔ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ ذرا اپنے سوال کی معقولیت پر غور فرمائیے۔“

کہنے لگے۔ ”بے شک یہ میں بھی جانتا ہوں کہ عورت کے بغیر محفل ہستی کو نمود نہیں ہو سکتی۔ فی الحال انسان ڈھالنے کی مشین اور کارخانے نہیں بنے لیکن اگر عورتیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کیا ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے؟“

یہ واقعہ بیکنگ کے پاکستانی سفارت خانے میں ایک صاحب نے سنایا۔ ممکن ہے یہ داستان نہ ہوزیب داستان ہو، لیکن مقصود ان کے کہنے کا یہ تھا کہ چین میں عورتوں اور مردوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ وہی بند گلے کی جیکٹ، وہی پتلون، ایک سا جوتا، نہ سرخی نہ لپ اسٹک نہ بندے نہ جھومر۔ نہ غرارہ نہ ساڑھی نہ دوپٹہ نہ پرس۔ یہ سب سچ ہے۔ میں خود جاتے ہوئے اپنی بینڈی کرافٹ شاپ سے موتیوں کا ایک پرس لے گیا تھا، خیال یہ تھا کہ کوئی بیگم ادیبہ ملیں گی یا کسی ادیب کی بیگم کونڈر کروں گا تو خوشی ہوگی۔ لیکن وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آخرا ایک پاکستانی خاتون کے حوالے کر آیا۔ وہاں تو کوئی خاتون سودا سلف لینے کو نکلے تو زیادہ سے زیادہ کپڑے یا پلاسٹک کا تھیلا ساتھ ہوتا ہے اور بس۔

بایں ہمہ یہ بات سبالغہ ہے کہ عورت اور مرد کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ حسن و رعنائی وہاں بہت ہے۔ ایسے ایسے چہرے نظر آئے کہ بس۔ اور پھر چہروں کا حسن صحت اور شادابی سے عبارت ہوتا ہے، کسی مصنوعی مدد کا محتاج نہیں۔

ایک جگہ کچھ خواتین خازہ پوتے، بھڑکیلے لباس پہنے نظر آئیں تو تحقیق پر معلوم ہوا کہ بے شک چینی ہیں لیکن سمندر پار کی چینی۔ سنگاپور سے سیر کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ کسی چینی کو لاغر دیکھیے یا کسی کا پیٹ بڑھا ہوا پائے تو یہ بھید کیلے گا کہ یہاں کا متوطن نہیں۔ باہر سے آیا ہوا ہے۔ سارے چین میں کسی مرد یا عورت کو لاغر نہ پایا۔ اسپتالوں میں بہت کم مریض ہوتے ہیں۔ وارڈ کے دارڈ خالی پڑے رہتے ہیں۔ کوئی بیمار ہو تو آئے۔

عورتیں دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی کام کرتی ہیں لیکن چین کی طرح نہیں۔ کام کرنے میں عورت اور مرد کا کوئی فرق نہیں۔ عورتیں بھاری مشینیں چلاتی ہیں۔ کاریں اور ٹرک چلاتی ہیں۔ دکانیں اور کارخانے چلاتی ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتی ہیں۔ سڑکیں بناتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑے بڑے بوجھ اٹھاتی اور کھینچتی ہیں۔

چین کی ایک بات جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی یہ بھی ہے کہ ایک مرد یا عورت اتنا بوجھ کیسے کھینچ لیتی ہے جس کے لیے ہمارے ہاں گھوڑے کی ضرورت ہو۔ ایک ریڑھا لوہے کی سلاخوں یا سرخ اینٹوں یا اناج کی بوریوں سے لدا ہوا ہے اور ایک شخص بڑے آرام سے اسے کھینچے یا دھکیلے جا رہا ہے۔ اگر اتنا سامان ہو جتنا ہمارے ہاں اونٹ گاڑی میں عموماً ہوتا ہے تو ایک مرد یا عورت اسے کھینچ رہی ہوتی اور ایک یا دو مرد یا عورت اس کی مدد کر رہے ہوں گے لیکن ہانپتے کانپتے نہیں۔ بڑے اطمینان اور آرام کے ساتھ جیسے خانی چل رہے ہوں۔ مویشی یا بار برداری کے جانور ہمیں خال خال ہی نظر آئے۔ زیادہ بھاری کاموں کے لیے ٹرک اور ٹریکٹر ہیں لیکن زیادہ تر بارکشی انسان کرتے ہیں۔ بعض حالتوں میں سائیکل یا سائیکل گاڑیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والوں میں عورتوں کا تناسب تیس پینتیس فی صد ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسپتالوں میں تو کچھ مریض ہوتے بھی ہیں۔ عدالتیں بالکل ہی خالی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ہفتوں کوئی کیس نہیں ہوتا۔ ایک پاکستانی دوست جو قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں کوئی عدالت دیکھنا چاہتے تھے۔ پبلنگ کی عدالت عالیہ کے چیف جج نے کہا کہ بھیا ہمارے ہاں تو بہت دن سے کوئی کیس نہیں لگا۔ ہاں فلاں گاؤں میں ایک مقدمہ ہے وہ چل کے دیکھو۔ چیف جج صاحب ان کو لے کر وہاں پہنچے۔ مقدمہ طلاق کا تھا۔ ایک کارخانے کے کاریگر نے عرضی دی تھی کہ میری بیوی بہت بد مزاج

ہے، ہاتھ چھٹ بھی ہے، ٹکرار اور مار پیٹ کرتی ہے۔ میری بڑھیا ماں کا خیال نہیں کرتی۔ میں اس سے علیحدگی چاہتا ہوں۔ وہاں اشام وغیرہ کا رواج نہیں۔ سادہ کاغذ پر لکھ کر عرضی دے دیجیے۔ یا پوسٹ کر دیجیے دوسرے تیسرے روز عدالت بیٹھ جائے گی اور عموماً ایک ہی دن میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وکیل بھی پارٹ ٹائم ہیں۔ ان کو فیس یا مشاہرہ حکومت کی طرف سے ملتا ہے اور ان کا کام مدعی یا مدعا علیہ کی جانچ کرنا نہیں بلکہ قانون کی تشریح کرنا ہوتا ہے۔

خیر تو یہ لوگ اس گاؤں میں پہنچے تو عدالت شروع ہو گئی تھی۔ کوئی عبا قبا تھی نہ اونچی کرسی نہ جج کا ہتھوڑا۔ ایک میز کے گرد جج بھی بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی مدعی بیٹھا چائے پی رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو آدمی اس کے کارخانے کی انتظامیہ کے۔

دوسری طرف اس کی بیوی اور بیوی کے کارخانے کے دو آدمی۔ ان آدمیوں نے دونوں کے حق میں شہادتیں دیں کہ مخنتی کارکن ہیں۔ البتہ بیوی کے کارخانے والوں نے کہا کہ یہ بی بی مزاج کی تیز ہیں۔ کبھی کبھی مغلوب الغضب ہو جاتی ہیں۔

بیوی نے اس الزام کو تسلیم کیا کہ بے شک میرا مزاج بگڑا رہتا ہے لیکن میرا میاں شام کو دیر سے گھرا تا ہے۔ ڈراما دیکھنے چلا جاتا ہے یا اپنے دوستوں کے ساتھ دقت گزارتا ہے۔ اس کی ماں کا خیال بے شک میں نے کبھی نہیں کیا کیونکہ میری ماں بچپن میں انتقال کر گئی تھی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ماں کیا ہوتی ہے۔ اب البتہ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مرد نے بھی کہا کہ میں جلدی گھرا جایا کروں گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے راضی نامہ ہو گیا۔ جج نے کہا میں وقتاً فوقتاً تمہارے گھر آ کر دیکھا کروں گا کہ تم لوگوں کا ایک دوسرے سے کیسا سلوک ہے۔ معلوم ہوا کہ اتنی نوے فیصد صورتوں میں فیصلہ راضی نامے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہوتا وکیل اور ان کے دلال، رشتہ دار اور اہل کار، عرضی نویس اور وثیقہ نویس، بھوکے مریں یا دوسری نوکریاں اور روزگار ڈھونڈتے نظر آئیں۔

☆☆

شاعری کی کہیں بھی قدر نہیں

جوش صاحب کی پوتی سے ہمارے بھتیجے تک

اخبار خواتین کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی پوتی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں۔ ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھتیجے بابر میاں سے آزر رہے تھے جس کا ردیہ ہماری نظم و نثر کے بارے میں کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم نے اس عزیز مکرم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں۔ افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا۔ علم عروض اور زمانات کے نکات سمجھانے کی کوشش کی۔ افراط زر کی بحث میں الجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دور رس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا لیکن اس نے ہمیشہ جہاں ہی لے کر ٹالا۔ اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں۔ اگلی ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔



لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ

عزیز مذکور کی ادب عالیہ اور دقیق معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے۔ نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفنگی کا اظہار کرتا ایسے عیب جو نکتہ چینوں سے کسی کو پناہ نہیں۔ کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ اپنی زبان کو لغت ہائے حجازی سے اتنا گراں مایہ نہ بناتے اور سیدھی زبان میں شعر کہتے اک رنگ کا مضمون سوڈھنک سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے تو آج آپ کی پوتی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستارے لٹھکتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستارہ بجانا کوئی بری بات نہیں ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع و خشوع سے بیٹھ کر پوتی کا الاپ ہتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لائق بھتیجا ڈنڈے سے مزے کاٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی داہا کرتے ہیں۔ اور جب میچ ہوتے ہیں تو اتنے لوگ اسپورٹس کے دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے لیکن لوگوں کا کیا ہے وہ تو بیر کو بھی پھل نہیں مانتے۔

☆☆☆

ان مثالوں سے اس راز سے بھی پردہ اٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فضلاء کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیولہ بنتے ہیں اور بڑے بڑے نغز گو شعرا یعنی تلامذہ الرحمن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابون کٹ پیس بیچتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون در کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل لکھی رکھی ہے لیکن کوئی مشاعرہ

ہونے کی خبر نہیں تو وہ گھر سے خیرات شروع کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں۔ بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ علم کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا تحمل ہو سکے۔ ہمارے ایک بزرگ دیوانہ ناگپوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داو طلب کیا کرتے تھے۔ وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا۔ دیوانہ صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے سکے ہیں کہ عزیزم واپس آ جاؤ۔ اب تم کو کوئی غزل نہ سنائی جائے گی۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کا راز حال میں کھلا۔ صاحب زاوے کراچی کے ایک مشور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار ویکہ کر کاٹنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابامیاں کی غزل نہ چھپی ہو۔



ہماری نثر تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے۔ لیکن اگر ادارہ اخبار خواتین ہماری غزلیں چھاپنے سے صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے۔ یہ قدر ناشای اخبار خواتین والوں تک محدود نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا۔ اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکے بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ ہمیں اس صورت سال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی۔ کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو۔ ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کبھی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔ پکنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات

بھی تھیں۔ ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ تھوٹھا سامنہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے۔ عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی۔ اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی۔ اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر دی کہ اب کچھ یا نہیں۔ کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔ ”غزلیں جو آپ نے پڑھیں کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں آپ شاعر ہیں کیا“ ہمارا خیال ہے ہم کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا کھیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سناتے پڑتے۔“



جانا ننھے شہزادے کا بلا رعایا کے بادشاہ کی مملکت میں

پوری داستان سے آپ کو مطلب نہ ہونا چاہیے۔ ہمارا نو عمر ہیرو یعنی ننھا شہزادو آسمان کی وسعتوں میں ایک میارے سے دوسرے میارے پر اور دوسرے سے تیسرے پر زقندیں بھرتا اور سیر دیکھتا طیاروں کے ایک نئے جھرمٹ کی طرف جا نکلتا ہے۔ اس جھرمٹ کے پہلے ہی سارے پر ایک بادشاہ عالی جاو متسکن نظر آئے، زرنگار مند خلعت فاخرہ عصا تاج سر صغ اور بادشاہی کے دوسرے الابلا لوازم۔ ننھے شہزادے کو دیکھتے ہی اشتیاق سے بولے۔ ”بیجے رعایا آگئی۔ ایک آدمی ہی سہی۔ کوئی تو حکم کا بند دلا۔“

ننھا شہزاد حیران ہوا کہ اس شخص نے تو مجھے پہلی نظر میں پہچان لیا حالانکہ اس سے پہلے کہیں مذہبھڑ نہ ہونی لقی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بادشاہوں کے نزویک اس دنیا میں بس دو طرح کی مخلوق ہستی ہے۔ ایک بادشاہ و لوگ دوسرے رعایا لوگ۔ ایک حکم دینے والے دوسرے حکم ماننے والے بادشاہ سلامت نے کہا۔ ”قریب آؤ۔ سیری دھایا۔ آؤ۔ آداب بجالاؤ۔“

ننھے شہزاد نے ہر طرف نظر دوڑائی کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نظر آئے۔ لیکن اس چھوٹے سے سیارے پر ہر طرف بادشاہ کا زرنگار شاہی لبادہ بکھرا ہوا تھا۔ پس وہ کھڑا رہا۔ اور چونکہ تھکا ہوا تھا اس لیے اسے جمائی آگئی۔

بادشاہ سلامت نے سختی سے ٹوکا۔ ”بادشاہوں کے حضور جمائی لینا بدتمیزی کی بات ہے آداب شاہی کے یکسر خلاف ہے۔ میں فرمان شاہی کی رو سے تم کو منع کرتا ہوں۔“

”لیکن مجھے جمائی آرہی ہے۔ حضور میں اسے روک نہیں سکتا۔ بادشاہ سلامت۔“

ننھے شہزادے نے کہا۔ ”بڑی دور سے آیا ہوں اور کئی دن سے موہیں پایا۔“

”یہ بات ہے؟“ بادشاہ سلامت نے کہا۔ ”دراں صورت میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جمائی لو۔ میں نے برموں سے کسی کو جمائی لیتے نہیں دیکھا۔ جمائی لینا آدی بھی کیا خوب لگتا ہے۔ ہاں لیتے رہو جمائیاں رک کیوں گئے۔“

”جی جی۔ اب مجھے جمائی آ ہی نہیں رہی۔ کیسے لوں جمائی بادشاہ سلامت۔“

”ہوں یہ بات ہے۔ تب میں تم کو شاہی حکم دیتا ہوں کہ گاہے بہ گاہے جمائی لیتے رہو اور گاہے بہ گاہے منہ بند کیے رہو۔“

بادشاہ کی خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے لیکن کوئی نہ کوئی شاہی فرمان تو جاری کرنا تھا نا۔ بہ حیثیت مطلق العنان حکمران کے یہ اس کا فرض تھا۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔“ ننھے شہزادے نے اجازت طلب کی۔

”میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔“ بادشاہ سلامت نے حکمت سے فرمایا اور عبائے شاہی کی شکنیں درمت کرنے لگے۔

ننھے شہزادے کو حیرانی تھی کہ اس چھوٹے سے سیارے پر بادشاہ سلامت کس چیز پر حکم چلاتے ہوں گے۔ اس نے کہا۔ ”حضور عالی جاہ۔ جان کی امان پاؤں تو ایک سوال پوچھوں۔“

”میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم مجھ سے سوال پوچھو۔“ بادشاہ سلامت نے روایتی جلال سے فرمایا۔

”حضور عالی جاہ۔ آپ کس چیز پر حکومت کرتے ہیں۔؟“

”ہر چیز پر کرتا ہوں۔“ بادشاہ سلامت نے اپنے سیارے آس پاس کے سیاروں اور آسمان کے ستاروں کی طرف بہ یک جنبش اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان مب پر؟“ شہزادے نے پوچھا۔

”ہاں ان سب پر۔“

”اور ستارے آپ کا حکم مانتے ہیں۔“

”ہاں مانتے ہیں، سرتابی کی مجال نہیں۔ میں کسی کی عدول حکمی برداشت نہیں کر سکتا۔“

ہمارا ننھا شہزادہ بہت حیران ہوا کہ ستارے اور چاند اور سورج بھی اس کا حکم مانتے ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے شفق بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ سورج کو حکم دیں کہ ڈوب جائے۔“

بادشاہ سلامت نے نہایت گہمیدہ برانہ لہجے میں کہا۔ ”کسی کو وہی حکم دینا چاہیے جس کا وہ مکلف ہو سکے۔ حکم معقول ہونا چاہیے۔“

ننھے شہزادے نے ضد کی کہ میں تو سورج کو ڈوبتے دیکھوں گا۔

”اچھی بات ہے۔“ بادشاہ نے اپنی جستری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سورج کو حکم دیتا

ہوں لیکن تم کو حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ بس سات بج کر چالیس منٹ تک انتظار کرو تمہارے دل کی مراد پوری کر دوں گا۔“

ننھے شہزادے نے پھر ایک جماہی لی۔ اس نے بادشاہ سلامت سے کہا کہ ”اب میں

اجازت لیتا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی کام نہیں رہا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”مت جاؤ۔ میں تم کو ذریعہ بنا دوں گا۔“

”دزیر؟ کس چیز کا دزیر؟“

”دزیر انصاف“

”لیکن یہاں کوئی ہو تو اس کا انصاف کروں۔ آپ کی دلایت میں تو ایک بھی تنفس نہیں ہے۔“

”یہ تو مابدلت کو پتا نہیں ہے۔“ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ ”ہمیں اپنی ساری مملکت کا دورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں بہت بڑھا ہو گیا ہوں اتنی جگہ نہیں کہ شاہی رتھ وغیرہ چل سکے۔ کوئی پاکلی اٹھانے والا بھی نہیں۔ پیدل چلنے سے میں تھک جاتا ہوں۔“

”لیکن میں تو آپ کی پوری مملکت چھان بھٹک آیا ہوں۔ مجھے تو کوئی نہیں ملا جسے آپ محکوم کہہ سکیں۔“

”تو پھر تم اپنا ہی انصاف کر دو۔ خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ یہ مشکل تو ہے لیکن اگر تم اپنی منصفی آپ کر حکومت یہ دانش مندی کی معراج ہوگی۔“

ننھے شہزادے نے کہا۔ ”عالی جاہ۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں رخصت ہوتا ہوں آپ کی مملکت سے۔“

”ٹھہرو۔ ٹھہرو۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”میرے اس سیارے پر کہیں کوئی بڑھا چوہا ہے۔ کئی بار رات کو اس کی چپیں پھیں کرنے کی آواز آتی ہے۔ تم اس کا انصاف کر سکتے ہو۔ گا ہے پہ گاہے اسے موت کی سزا کا حکم سن سکتے ہو۔ لیکن میری ہدایت ہے کہ ہر بار موت کی سزا کا حکم سننے کے بعد اس کو بخش دیا کرنا تا کہ انصاف کا سلسلہ جاری رہے اور قانون کی حکمرانی قائم رہے۔“

”جی نہیں۔ میں کسی کو سزائے موت نہیں دے سکتا۔“

ننھے شہزادے نے کہا۔ ”ادرا ب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

تم نہیں جاسکتے۔ بادشاہ سلامت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
 لیکن ننھے شہزادے نے رخصت ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر حضور
 چاہتے ہیں کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں تو بہتر ہے کہ میری پسند کا حکم دیں۔ مجھے
 فوراً چلے جانے کا حکم دیں۔ یہ تصور کر لیں کہ اب اس کے لیے حالات سازگار ہو گئے
 ہیں۔“ بادشاہ سلامت نے کوئی جواب نہ دیا۔ ننھے شہزادے نے تھوڑی دیر تاہل کیا۔
 پھر چلنے کے لیے قدم اٹھایا۔

”میں تمہیں سفیر بنانا ہوں۔ ٹھہر جاؤ رک جاؤ۔“ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔
 ننھے شہزادے نے سوچا کہ یہ بڑے لوگ سن رسیدہ لوگ بھی کیا عجیب عجیب باتیں
 کرتے ہیں۔ وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”سولہ لاکھ بائیس ہزار اور سات سو اکتیس۔“

”یہ کیا گنتی ہو رہی ہے صاحب؟“ ننھے شہزادے نے پوچھا۔ ”پچاس کروڑ کیا؟“
 ”ارے۔ تم کون ہو؟“ پچاس کروڑ سولہ لاکھ۔ مجھے کام کرنے دو۔ مجھے ابھی بہت
 حساب کتاب کرنا ہے۔ بڑا اہم حساب ہے۔ میرے پاس فضولیات کے لیے وقت
 نہیں ہے۔ دو اور پانچ ہوئے سات.....“
 ”لیکن یہ پچاس کروڑ سولہ لاکھ ہے کیا؟“

ننھے شہزادے نے پھر پوچھا۔ سوال پوچھنے کے معاملے میں وہ ڈھیٹ تھا۔
 بیوپاری نے اپنا سراٹھایا اور کہا۔ بچھلے چون سال سے میں اس سیارے پر رہتا
 ہوں۔ اس دوران میں صرف تین بار کسی نے مجھے تمہاری طرح ٹوکا ہے۔ دخل
 در معقولات کی ہے۔ پہلی بار تو آج سے اٹھائیس سال پہلے ایک بطخ کہیں سے ٹپک
 پڑی تھی۔ اس نے ایسی قیس قیس کی کہ میرے کھاتے میں جمع کی چار جگہ غلطیاں
 ہو گئیں۔ دوسری دخل اندازی آج سے گیارہ برس پہلے ہوئی۔ وہ گٹھیا کی وجہ سے۔ بات

یہ ہے کہ مجھے کسرت کرنے کی فرصت نہیں، چل پھر کر میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ تیسری بار..... خیر ہاں تو میں کہاں تھا۔ ”پچاس کروڑ سولہ لاکھ.....“
 ”لیکن پچاس کروڑ سولہ لاکھ کیا؟“

بیوپاری نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ میرا مطلب ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہے، وہ جو آسمان پر چمک رہی ہیں۔“
 ”کھیاں؟“

”ارے نہیں۔ کھیاں بھی کوئی چمکتی دکتی ہیں...“
 ”جگنو۔“

”ارے نہیں۔ جگنو وغیرہ بھی نہیں۔ جگنو کسی کے کیا کام آ سکتا ہے؟ یہ تو شاعروں داعروں کے کام کی چیز ہے۔ وہ دیکھو وہ۔“
 ”آپ کا مطلب ستاروں سے ہے۔“
 ”ہاں ہاں ستارے۔“

”اور آپ پچاس کروڑ ستاروں کا کیا کرتے ہیں۔ آپ کے کس کام آتے ہیں؟“
 ”صرف پچاس کروڑ نہیں بلکہ پچاس کروڑ سولہ لاکھ سات سو اکتیس۔ حساب کتاب میں ادٹ پٹانگ باتیں نہیں چلتیں۔“

”آپ ان ستاروں کا کیا کرتے ہیں؟“

”میں ان ستاروں کا کیا کرتا ہوں؟“

”جی ہاں۔ میں یہی پوچھ رہا ہوں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ میں ان کا مالک ہوں یہ میری ملکیت ہیں۔“

”کیا یہ سارے ستارے آپ کے ہیں۔“

”ہاں۔“

”لیکن مجھے ایک بادشاہ ملا تھا جو.....“

”بادشاہ لوگ مالک نہیں ہوا کرتے وہ تو بس حکمران ہوتے ہیں۔ دونوں باتوں میں بہت فرق ہے۔“

”لیکن اتنے سارے ستاروں کا مالک ہونے سے فائدہ؟“

”واہ فائدہ کیوں نہیں۔ میری دولت بڑھتی ہے۔ میں امیر ہوتا ہوں۔“

”لیکن امیر ہونے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچتا ہے!“

”امیر ہونے سے میں مزید ستارے خرید سکتا ہوں۔ جو دریافت ہوں۔“

نصفے شہزادے نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ شخص بھی اس شرابی کی طرح نامعقول ہے تاہم اس نے سوال پوچھا۔

”کوئی آدمی ستاروں کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔“

بیوپاری نے اس کے جواب میں پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں یہ کس کی ملکیت ہیں؟“

”مجھے تو معلوم نہیں۔ میرا تو خیال ہے کسی کی ملکیت نہیں۔“

”پھر تو یہ میرے ہوئے۔ اس لیے کہ سب سے پہلے ان کو ملکیت بنانے کا خیال مجھے سوچھا۔“

”بس؟ اتنا ہونا کافی ہے۔“

”کیوں نہیں خود ہی سوچو اگر تمہیں راہ چلتے ایسا بہیرا ہاتھ لگتا ہے جو کسی اور کا نہ ہو تو وہ تمہارا ہوا۔ کوئی ایسا خیال سوچتا ہے جو کسی اور کو نہ سوچا ہو۔ تو وہ بھی تمہارا ہوا۔ یہی مثال میری ہے۔ سب سے پہلے ان ستاروں کو اپنی ملکیت بنانے کا خیال مجھے آیا۔ کسی اور کو نہیں آیا۔“

”یہ تو سچ ہے۔“ نصفے شہزادے نے کہا۔ ”لیکن آپ کے کس کام آتے ہیں۔ ان کا

مصرف کیا ہے۔“

”بس دہ میرے ہیں میں ان کی گنتی کرتا ہوں۔ ان کا حساب رکھتا ہوں.... کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنے ستاروں کا مالک ہونا۔“

ننھے شہزادے کا پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔

”فرض کیجئے میرے پاس ایک ریشمی گلوبند ہے۔ اسے میں گردن کے گرد لپیٹ سکتا ہوں جہاں سپاہوں ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ اگر میں کسی پھول کا مالک ہوں۔ تو اسے توڑ سکتا ہوں جہاں چاہوں ساتھ لے جاسکتا ہوں۔ لیکن آپ ستارے تو آسمان سے نہیں توڑ سکتے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں ان کو تجوری میں تو بند کر سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب۔“ ننھے شہزادے نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کا شمار کر کے ایک کاغذ پر لکھ لیتا ہوں کہ یہ اتنے ہیں۔ اور اس کاغذ کو تجوری میں بند کر کے تالا لگا سکتا ہوں۔“

”بس؟“

”یہ تھوڑا ہے۔“

”یہ بھی اچھی رہی۔“ ننھے شہزادے نے دل ہی دل میں کہا۔ ”لیکن فائدہ؟“ ننھے شہزادے کا کسی چیز کے مفید ہونے کا پیمانہ بڑی عمر کے لوگوں سے مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نہ ستارے آپ کے کام آ سکتے ہیں نہ آپ ستاروں کے کام آ سکتے ہیں۔ پھر بھی آپ ان کی ملکیت پر خوش ہیں۔“

ستاروں کا مالک سپ رہا۔ اس کی سمجھ میں ننھے شہزادے کی بات نہ آرہی تھی۔ ننھا شہزادہ حیران آگے چل دیا۔ پانچویں سیارے کی طرف۔



ہے ہر اباغ لے گیا کون؟ ہم نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی

اس شہر میں دو طرح کی مخلوق ہے۔ آدھے لوگ مکandar ہیں آدھے کرایہ دار۔ اس حساب سے ہم تین میں نہ تیرہ میں۔ یہ کہاں ہماری قسمت کہ کرایہ دار ہوتے۔ ہر نئے مہینے مکandar کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے کہ ”مکان میں سفیدی کرائل میں نئی ٹونٹی لگوا۔ غسل خانے بنا کے دے۔ مکandar بھی ان معنوں میں نہیں کہ کوئی کرایہ دار نہیں رکھتے جس کو یہ دھونس دے کراپٹی خودی بلند کرتے رہیں کہ ”اومیاں۔ اگر میرے مکان کی کسی دیوار میں کیل ٹھونکا تو دیکھنا۔ سفیدی کا ذکر مت چھیڑ۔ ابھی تو دس سال بھی نہیں ہوئے سفیدی کرائے۔ بس کرایہ لاور نہ ابھی تیرا سامان باہر پھینکتا ہوں۔“ دراصل ہمارا مکان ہمارا ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے، قرض لے کے بنایا تھا لہذا اپنی تنخواہ میں تہائی کا۔ ہو گیا ہے۔ ٹریک سا ہو کار مہینے کے مہینے ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کو قسط دیتے ہیں۔ بارہ تیرہ برس اور دیتے رہیں گے۔ مول جدا۔ سود جدا۔ ندیس گے تو مکان قرق کر اسکتا ہے، باریں ہم جب ہم مکان میں آئے تو بہت خود پسند تھے۔ پہلی بار کسی چیز کے مالک بنے تھے نا۔؟ کوٹھے پر چڑھ کر آواز لگائی۔

ہم ہیں مالک اس مکان کے۔ ہے کوئی اس جائیداد کا ٹیکس لینے والا۔ کئی آدمی دوڑے آئے۔ ایک میونسپل کارپوریشن کا۔ ایک کے ڈمی اے کا۔ ایک شاید ایکسائز کا تھا۔ ایک نے کہا۔ ”ہم لیں گے۔ تم ہماری رعایا ہو“ دوسرا بولا۔ ”جی نہیں ہمیں دو۔ یہ عملداری ہماری ہے“ تیسرے نے کہا۔ ”ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ آپ کے قیمتی ٹیکس کے طلب گار۔“

ہم نے کہا۔ ”صاحبو۔ ہم صفائی ٹیکس بھی دینے کو تیار ہیں“ اس پر کے ڈمی اسے اور کارپوریشن والے بیک وقت بولے ”نکالو پیسے۔ یہ ہمارا حق ہے۔ یہ ہمارا حق ہے۔“ اب ہم نے کہا۔ ”پانی کا ٹیکس بھی تیار ہے۔ بہت پیسے والے ہیں ہم۔“ اس پر تو دونوں باقاعدہ الجھ پڑے کہ اس کے حقدار ہم ہیں۔ اب ہم نے چلا کر اعلان کیا۔

”ارے ہمارے محلے میں جھاڑ دکون دیگا۔ ہماری ٹنگی میں پانی کون چھوڑے گا۔ روشنی کے کھمبے کون گاڑے گا۔ سڑکیں کون بنائے گا۔“ اس پر ان میں ایثار کا مادہ عود کر آیا۔ بولے۔ ”لوگو۔ کوئی اور بھی تو بولے، ہم کہاں تک بولتے رہیں۔“



لیکن ادھر نظم و نسق کی تطہیر اور معاشرے کو آلائشوں سے پاک کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ اور یہ محکمے بھی کلمہ پڑھتے منہ پر ہاتھ چھیرتے جمابھیاں لیتے اٹھے۔ یہ پوچھتے ہوئے کہ ”یہ کونسی صدی ہے۔“ کارپوریشن والے خواٹھے۔ اپنے جمعداروں کو جگایا۔ وہ پچارے مشق نہ ہونے کے باعث صفائی کا کام بھول گئے تھے۔ ان کو نئے سرے سے جھاڑو لگانا سکھایا گیا۔ کچھ لوگ بازار کی طرف دوڑے کہ ابے اٹھاؤ۔ یہ خوانچہ

یہاں کیوں لگا رکھا ہے۔ اے میاں جالی کے بغیر گوشت اور دہی بیچ رہے ہو؟ ہم نے خدا کی قسم آج دیکھا ورنہ کبھی اجازت نہ دیتے اے مسرود کا نذرانہ یہ کیا جتنی نکال رکھا ہے۔ اپنی کھال میں رہ۔

”حضور دھوپ سے بچنے کے لیے ذرا سا سایہ کر لیا ہے۔“

”نواب کا بچہ۔ دھوپ لگتی ہے۔ ہٹا اس ٹین پاٹ کو۔“



ہم نے یہ کراست دیکھی اور قائل ہو گئے کہ ایں کاراز تو آید مرداں چنیں کنندہ۔ فوراً حضرت مولانا تنبیہ الفالین عرف ڈنڈا پیر کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ڈنڈا پیر ہے۔ بگڑیاں ٹکڑیاں دا۔ یہ کراست نہیں تو اور کیا ہے کہ دیواریں چھاپنے والے ان محکموں کی آنکھوں کے سامنے دیواریں چھاپتے تھے اور پھر انہی دیواروں کے سایے کو اپنی ضروری اور غیر ضروری حاجات سے مشرف کرتے تھے۔ اب یکا یک ان محکموں کو احساس ہوا کہ یہ تو بڑی باتیں ہیں۔ رفتہ رفتہ بقول حفیظ جالندھری۔ ہر بری بات بری بات نظر آنے لگی۔

چند روز پہلے تک بسوں کا دھواں ہر گز مضر صحت نہ تھا۔ مشام جاں کو تازہ کرتا تھا۔ مگر اب شہریوں کی صحت کے لیے خطرناک ہو گیا۔ ۲۶ مارچ کو ہمارے گھر میں پہلی بار دودھ پر بالائی آئی۔ دو تین دن میں ہمیں بھی خیال آیا کہ ہاں بھئی۔ پڑھائی بھی ہونی چاہیے کہ بے علم متواں خدا شامت۔ اگر ہماری آنکھوں میں سرمہ سلیمانی سلائی نہ لگائی جاتی تو یہ ساری حقیقتوں کے دینے ہمیں کیسے نظر آتے۔ ایسے میں جانے کون تھا جس نے بلدیہ سے جاجمیری کی کہ ناظم آباد کے علاقے میں کچھ لوگوں نے اپنے گھروں کے سامنے خالی جگہ میں کہیں کہیں گھاس لگا رکھی ہے۔ شام کو اس پر کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعضوں نے تو پھولوں کے پودے بھی لگا رکھے ہیں۔ درود دیوار پر سبزہ اگ رہا

ہے۔ اٹھو گر نہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی۔ پہلے تو کے ایم سی والوں کو یقین نہ آیا کہ ان کے دور میں ایسا اندھیرا ہو سکتا ہے۔ ان کا تو حکم تھا کہ سارے شہر میں سوائے خاک کے کچھ نہ اڑے اور سوائے کتوں کے گلیوں میں کوئی آزادانہ نہ گھومے، نہ کسی کو کاٹے، اب احساس فرمیں جو جاگا تو ان کو سب جگہ ہر اہی ہر نظر آنے لگا۔ فوراً پیادے دھڑے کہ اکھاڑ پودے۔ کھود گھاس۔ خبردار جو کوئی تنکا بھی ہریالی کا تمہارے گھروں کے سامنے نظر آیا۔ یہ تمہارے بادا کی جگہ ہے جو یوں گل کھٹار کھے ہیں۔ اپنے بادرچی خانے میں یا غسل منانے میں جو چاہے کاشت کر دے۔ ہم منع نہیں کرتے بشرطیکہ اس میں پانی نہ دو۔ پانی کا توڑا ہے۔ اور یہ توڑا صرف ناظم آباد کے پودوں کی وجہ سے ہے۔ دوسری موسائٹیوں کے امراء تو اپنے باغچوں کو ڈرائی کلین کراتے ہیں۔



تو کون میں خواہ مخواہ..... ہمارے گھر کے باہر نہ کوئی تجاوز نہ کوئی گھاس پات۔ ایک پارک ضرور سامنے ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے ایک کونے میں کچھ گھاس وغیرہ ہے۔ کچھ پودے بھی ہیں لیکن یہ کے ڈی اے کا ہے۔ ان لوگوں کو پکڑنیے اور مرخا بنائیے۔ ہماری بلا سے۔ ہمیں درد یوں اٹھا کہ ناظم آباد ہمارا قریبی ہمسایہ ہے۔ ہم سر درخانہ ہمسایہ سے کہاں تک بے بہرہ بلکہ بہرہ رہ سکتے ہیں۔ آج کل اس علاقے میں جدھر جائیے لوگ گل بکاؤلی کی مثنوی پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہے	ہے	ہے	ہے	ہے	ہے
کون	گیا	نلے	باغ	مرا	ہے
کون	گیا	دے	داغ	مجھے	ہے
سنبل	مرا	تازیانہ	لانا		
موسن	اے	دار	پر	چڑھانا	

صبر ہمارا کمزوری بھی ہے۔ پودے ہوا کی ٹھونٹ اور طبیعت کی خشونت دور کرتے

ہیں۔ مسلمان اس ملک میں آئے باغ لگاتے گئے۔ ہندو تو پتھر کی سورتیاں پتھر کے مندر اور پتھر کے فرش بنانے کے علاوہ کچھ نہ جانتے تھے۔ مسلمان تو خواہ اپنی طبیعت میں باغ و بہار ہوتا ہے۔ گلرخوں کو دیکھ کر ہم جیتے ہیں سروتدوں کے سائے میں جی کی ٹھنڈک پاتے ہیں۔ سبزہ پسند کرنے کی کئی وجہیں ہیں۔ کچھ اس لیے کہ آنکھوں میں تراوٹ آتی ہے۔ کچھ اس لیے کہ پاکستان کا قومی رنگ سبز ہے اور کچھ اچی شاعری کے حوالے سے۔

تو بھی ہرے درتچے والی آجا برسر بام ہے چاند
ہر کوئی جگ میں خود سا ڈھونڈے۔ تجھ بن بے آرام ہے چاند
مسافر غریب ایک رستے میں تھا۔ پیدل تھک گیا تو دعا کی کہ یا خدا سواری عنایت کر۔ یکا یک ایک سوار کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک الہ پچھیرا بھی تھا۔ اس نے مسافر کے ایک کوزا رسید کیا اور کہا اے شخص یہ بے زبان تھک گیا ہے۔ اسے اپنے کاندھے پر اٹھا اور سیرے پیچھے پیچھے چلا آ۔ اس نے کہا داہ بھئی واخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ سواری مانگی تھی۔ نیچے کے لیے۔ مل گئی اوپر کے لیے۔ خیر اس میں تو مسافر کا تصور تھا اس نے دجا ہی بہم الفاظ میں مانگی تھی۔ اوپر نیچے کی تخصیص نہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تو اس روز کے کالم میں بالوضاحت لکھ دیا تھا کہ جمعہ ار لوگ ہمارے محلے میں کوزا سڑک پر پھینکا کر پھینکتے ہیں۔ ہے کوئی دانی وارث اس محلے کا۔ تلالی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔ ٹیلیویشن پر اشتہار دے دیا کہ شہر کی مسائی میں بلدیہ کا ہاتھ بنائیے۔ اچھا بھئی ہم تیار ہیں۔ اے میاں ابراہیم جلیس۔ اے حضرت! انعام درانی صاحب۔ نصر اللہ خاں ہوت۔ اور یا ارشاد احمد خاں۔ اٹھا اپنی اچی ٹوکریاں اور لگاؤ کارپوریشن کے دفتر کے سامنے جھاڑو۔



رپورٹ پٹواری مفصل ہے!

قصہ عید و ولد غنی سکنہ روڈ و سلطان کا

دوسرے روز میاں مچھر غاں ذرا سویرے ہی آن وارد ہوئے۔ مونچھوں کو تیل لگائے۔ بھن بھن کرتے چونچال۔ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ صلح ماری کہ آؤ خان صاحب۔ کچھ چکھوتیاں ہو جائیں۔

ڈکار لے کر بولا۔ جی نہیں۔ بسم اللہ کیجیے۔ یہ جو آپ کے گھر کے سامنے پارک کے کونے پر کوڑے کا ڈھیر ہے وہیں سے اٹھ کر آیا ہوں۔

ہم نے کہا۔ ارے وہ ڈھیر کسی نے ابھی اٹھایا نہیں؟ ہم تو دو کا لم لکھ چکے۔ تمہیں معلوم ہے اخبار نویسوں کے قلم میں بڑا زور ہوتا ہے۔

ہنسا اور بولا! آپ قلم کے بجائے جھاڑو چلاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔

ہم نے کہا۔ اس میں عذر نہیں لیکن ہم صفائی ٹیکس دیتے ہیں۔ خود بیکام کرنے لگے تو ٹیکس کس کو دیں گے۔

بولا۔ میں تو سوچتا ہوں۔ یہیں آن بسوں۔ باقی سب بستیوں میں کارپوریشن والے گشت لگاتے ہیں۔ ادھر کوئی داروغہ صفائی آتا نہیں دیکھا۔ یہاں پانی کا جو ہڑ بھی

ہے۔ بقیہ عمر اسی گوشہ عافیت میں گزاروں۔“

ہم نے کہا، ”چشم مارو شن دل ماشاد۔ تیرے بھائی بند پہلے ہی بہت ہیں۔ شب بھر ”عقیدت“ یعنی قوالی کا پردہ گرام ہوتا ہے۔ ویسے ہم رپورٹ کرنے والے ہیں۔ وارونہ صفائی کی۔“

بولاً۔ ”کس کے پاس کریں گے۔“

ہم نے کہا، ”جو بھی بڑے سے بڑا افسر ہوگا اس کے سامنے کریں گے۔“
بولاً۔ ”یہ آج کل میں ایڈمنسٹریشن کی تطہیر یعنی صفائی دھلائی ہوگی۔ ذرا اس کا انتظار کر لیجئے ورنہ۔“ رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔“ کا سا حشر ہوگا۔“
ہم نے کہا۔ ”یہ کیا چیز ہے۔“

بولاً۔ ”قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ہے بلکہ واقعہ ہے جو انہوں نے جھنگ کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں لکھا تھا۔“
ہم نے کہا ”بھئی بڑا پڑھا لکھا مجھ پر نکلا تو۔ حیرت ہے پڑھ لکھ کر بھی لوگوں کو کاٹتا ہے۔“ ملیر یا پھیلاتا ہے۔“

بولاً۔ ”آپ نے وہ قلم نہیں دیکھی جس میں ایک آدمی کہتا ہے۔“ چوری میرا پیشہ ہے۔ فواز میرا فرض ہے۔“ میرا مطالعہ اپنی جگہ۔ کاٹنا اپنی جگہ۔“

اس پر ہمیں یاد آیا کہ پڑھے لکھے انسان بھی تو کاٹتے ہیں بلکہ بے پڑھے لکھوں سے زیادہ کاٹتے ہیں۔ دلیلیں دے دے کر کاٹتے ہیں۔ پس ہم نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ حکایت کو مختصر کر کے بیان کر۔

نصیحت کرنے لگا کہ آپ کا فرض تو بطور ادیب کے یہ ہے کہ اپنے قلم سے اس نیک مشن کو تقویت پہنچائیں، نیک کام میں حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ آپ جیسے روشن خیال لوگوں نے اپنا فرض نہ ادا کیا تو افسر شاہی اور دفتر شاہی اور قائل شاہی یونہی قائم

رہے گی۔

ہم نے کہا اچھا فرض ہم بخوبی جانتے ہیں۔ نصیحت کا دفتر تہہ کر۔ اپنا قصہ کہہ۔ اور زیادہ نمک مرچ مت لگا۔ پچھلی بار تو نے غلام عباس کی کہانی کو زیادہ ہی نمکین بنا دیا تھا۔ بولا۔ جی اب کے احتیاط رکھوں گا۔ مصنف کی زبان ہی میں کہانی کہوں گا۔

”سنیے... ایک تھا کسان۔ عید و ولد غنی نام۔ سابق سکنہ موہن ماجرہ۔ تحصیل روپڑ ضلع انبالہ۔ پاکستان بنا تو وہ موضع روڈ و سلطان تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ میں آن آباد ہوا۔“

”ہوں۔“ ہم نے ہونکارا بھرنا شروع کیا۔

”اس نے ایک عرضی لکھی اور درجہ بدرجہ لاٹ صاحب وزیر اعلیٰ۔ وزیر بحالیات۔ فنانشل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کو بھینچہ رجسٹری ارسال کی۔ مضمون واحد تھا۔ جناب حالی۔ فدوی مہاجر ہے۔ دس ایکڑ اراضی چاہی و بارانی کا مالک تھا۔ کلیم فارم داخل کیا۔ کسی دفتر میں گم ہو گیا۔ فدوی نے عذر داری کر رکھی ہے۔ ابھی تک سنٹرل ریکارڈ آفس سے جواب نہیں آیا۔ موضع روڈ و سلطان میں فدوی کو تین ایکڑ اراضی حاضی طور پر الاٹ ہوئی تھی۔ فدوی چار سال سے اس پر قابض ہے اور فصل کاشت برداشت کرتا ہے۔ فدوی لگان بھی باقاعدہ ادا کرتا ہے۔ لیکن اب پٹواری حلقہ بہ طمع نفسانی یہ زمین اپنے ایک قریبی عزیز کو الاٹ کر رہا ہے۔ جناب عالی۔ فدوی کی الاٹمنٹ ٹوٹ گئی تو فدوی کا کنبہ فاقوں سے مرے گا۔ التماس بخشور یہ ہے کہ فدوی کا عارضی رقبہ تا تصفیہ عذر داری بحال رکھا جائے۔ فدوی تازیت حضور انور کی بان و مال کو دو عائمیں وے گا۔

ہم نے کہا۔ یہ تو بڑی بڑ و دردر خواست ہے۔ اس پر کیا کارروائی ہوئی۔

میاں چھھرغاں نے سلسلہ کلام یوں جوڑا۔ لاٹ صاحب کے دفتر نے وزیر اعلیٰ کو لکھا کہ درخواست پر مناسب کارروائی کی جائے۔

وزیر اعلیٰ نے کمشنر کو لکھا۔ کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو لکھا۔ دوسرے افسروں نے بھی ان درخواستوں پر یہی ضابطے کی کارروائی کی۔ یعنی نیچے بھیج دیا حتیٰ کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس چھ درخواستیں بغرض مناسب کارروائی جمع ہو گئیں۔ سو گئے آپ؟

ہم نے کہا۔ ”نہیں سن رہے ہیں۔ تم کہے جاؤ۔“

ڈپٹی کمشنر کے مسل خواں نے ان سب درخواستوں کو اکٹھا کر کے نوٹ لکھا۔ ”درخواست ہانڈا بطلب رپورٹ بخد مت افسر مال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے فوراً اس پر اپنے دستخطوں کی چڑیا بٹھائی۔“

”مال افسر نے تحقیقات کی ہوگی پھر؟“

جی ہاں کی۔ انہوں نے لکھا۔ ”درخواست ہائے ہڈا بطلب رپورٹ بخد مت بناب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔۔۔۔“

تحصیل دار صاحب نے فرمایا۔ ”درخواست ہانڈا بطلب رپورٹ بخد مت جناب نائب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔“

نائب تحصیل دار نے لکھا۔ ”درخواست ہانڈا بطلب رپورٹ بنام قانون کو علاقہ مرسل ہوں۔“

قانون کو صاحب نے حکم دیا۔ ”درخواست ہانڈا بطلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ ہڈا مرسل ہیں!“

بالآخر ساری درخواستیں بطلب رپورٹ اسی پٹواری کے پاس پہنچ گئیں جو عید و ولد غنی کے الاٹمنٹ کو بطع نفسانی منسوخ کرنے کے درپے تھا۔

قصہ دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے کہا۔ پٹواری نے ڈر کر فوراً الاٹمنٹ عید و کے نام لگا دی ہوگی۔ یہ لوگ لاتوں کے بھوت ہیں۔ لاٹ صاحب تک معاملہ پہنچا تھا نا۔

میاں مجھ صر خاں نے سنی ان سنی کر کے حکایت جاری رکھی۔

”پٹواری صاحب نے درخواستوں کا بندل اپنے رجسٹر میں تھیں کیا اور ہفتے عشرے کے بعد عید کو طلب فرما کر یہ پلندہ اس کے منہ پر دے مارا۔

عید کی آنکھیں لاٹ صاحب۔ وزیر اعلیٰ۔ وزیر مہاجرین۔ کمشنر۔ ڈپٹی کمشنر بہادر وغیرہ کی کرسیوں کو پٹواری کی چارپائی سے بندھا دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پٹواری صاحب نے عید کو چند ناقابل اشاعت اور سرغن گالیوں سے نواز اور جوتے لگوا کر گھر واپس بھیج دیا۔

”ختم ہوئی کہانی....؟“

مجھڑ خاں نے کہا، جی نہیں۔ ابھی باقی ہے۔ عید ہر دوسرے تیسرے روز تحصیل اور ضلع کے دفاتروں میں جاتا اور گھر کیاں جھڑ کیاں اور دھکے کھا کر نوٹا حتیٰ کہ اس کے برتن اور بیوی کے زیور بک گئے۔ اب ہیلوں کی باری تھی لیکن پٹواری صاحب نے بروقت فیصلہ کر کے عید کو اس افتاد سے بچا لیا۔

”یعنی اس کی زمین اس کے پاس رہنے دی۔“ ہم نے کہا۔

”آپ سنتے جاییے جناب۔ پٹواری نے عید کی زمین منسوخ کر کے اپنے عزیز نور بخش کے نام تجویز کر دی اور درخواستوں پر رپورٹ لکھی۔“ جناب حالی۔ مسمیٰ عید کی جملہ درخواست ہا کی مکمل پڑتال ہوئی۔ ظاہر ہوا کہ سائل فصول درخواست ہا دینے کا حاوی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی گئی کہ اس طرح حکام اعلیٰ کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ وہ نہیں مانا۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصلی ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم اب تک تصدیق نہیں ہوئے۔ چنانچہ کیوٹ نمبر ۱۳ مقدمہ نمبر ۲۵ موضع روڈ و سلطان میں تین ایکڑ متروکہ زمین جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمیٰ نور بخش کے نام بردیت قانون رائجہ باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے مسمیٰ

نور بخش ضلع ہوشیار پور کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے مصدقہ کلیم فارم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ چنانچہ متروکہ اراضی ہذا اس کے نام الاٹ کر کے اس کی حق رسی کروئی گئی ہے۔ نیز آنکہ مسمی نور بخش نیک چلن اور با عزت مہاجر ہے اور جملہ کارہائے سرکار میں ہر وقت مستعد اور امدادی ہے۔ خاکسار کی رائے میں افسران بالا کی خوشنودی اور موضع روڈ و سلطان کی نمبر داری کا مستحق ہے۔ رپورٹ ہذا بمراہ حکم مناسب پیش حضور انور ہے۔

قانون گو نے لکھا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراہ حکم مناسب بحضور نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔“

نائب تحصیل دار نے لکھا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراہ حکم مناسب بخد مت جناب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔“

تحصیل دار صاحب نے لکھا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراہ حکم مناسب بخد مت جناب افسر مال بہار پیش ہو۔“

صاحب افسر مال بہار نے لکھا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بمراہ حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔“

صدر کے مسلوخوں نے حکم لکھا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ درخواست ہا مسمی عید و فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔ مسمی نور بخش کے کاغذات بوقت انتخاب نمبرداراں برائے موضع روڈ و سلطان صدر میں پیش کئے جائیں۔ تاکید احکامات برائے افسر مال جاری ہوں۔“

اس پر بھی ڈپٹی کمشنر بہادر نے اپنے دستخطوں کی چڑیا بٹھائی اور یہ معاملہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچایا۔



ہم نے کہا۔ دیکھو میاں چھھر۔ قدرت اللہ شہاب صاحب افسانہ نگار آدمی۔ ایڈمنسٹریشن کے رموز کیا جانیں۔ اگر اعلیٰ افسران ماتحت عملے پر کئی اعتماد نہ کریں گے تو لوگوں پر رعب کیا رہے گا۔ حکومت کی گاڑی رک جائے گی۔ اسی لیے افسران بالا پر فرض ہوتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کی سچ کریں۔ ان کی بات کو سند مانیں۔ ہر ایرے غیرے درخواست گزار کو منہ نہ لگائیں۔

چھھر خان بولا۔ لیکن اس ضابطے کی پچھلی میں عید و ولد غنی تو بے گنا واپس گیا نا۔ ہم نے کہا۔ ہمیں تو اس کہانی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ عید و کا کلیم تصدیق نہیں ہوا تھا اس کی اراہنی چھن گئی۔ نور بخش ایک باعزت مہاجر تھا اس کی حق رسی ہو گئی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔

بولا۔ باعزت ہونے کے علاوہ وہ پنواری صامب کا رشتہ دار بھی تو تھا۔ ہم نے کہا۔ ”تمہارا کیا مطلب ہے۔ اگر کوئی کسی بڑے آدمی کا رشتہ دار ہے تو اسے ترقی کرنے کا حق نہیں؟ الاٹمنٹ۔ لائسنس۔ جاگیر۔ کارخانے سے محروم رکھا جائے؟ یہ تو کچھ انصاف نہ ہوا۔

بہت ناخوش ہوا۔ بولا۔ آپ جیسے آدمی سے بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ جیسوں کے مشورہ نے تو ملک تباہ کر دیے۔ بادشاہیاں خارت کرویں۔ میں آپ کے بجائے اپنی بین کسی بھینس کے آگے بجاتا تو اس پر زیادہ اثر ہوتا۔ خدا حافظ۔ ہم نے کہا۔ ارے خان صامب۔ ایک بات تو سنو۔

بولا جی نہیں۔ آپ کو سنا م ہے۔ میں جاتا ہوں چھھر کا لونی واپس۔



بچ موڑتوں..... ہفتہ ٹریفک شروع ہو گیا!

یہ زیادہ نہیں تو قیامت تک تو جاری رہنا ہی چاہیے!

ہفتہ ٹریفک شروع ہو گیا۔ چشم مارو شن دل ناشاد ایسے ہفتے جو وقتاً فوقتاً ہمارے ملک میں ہوتے رہتے ہیں بہت کامیاب اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ انسداد گداگری کا ہفتہ ایک بار منایا گیا تھا۔ اس سختی سے کہ کوئی اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے کے لیے دست دعا بھی بلند کرتا تھا تو پولیس والے اس میں ہتھکڑی ڈال دیتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورے شہر میں آپ کو کوئی گدا اگر نظر نہ آئے گا، بشرطیکہ آپ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو۔ ویسے مستثنیات تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں بھی اگر آٹھ دس ہزار مستثنیات ہوں تو کچھ خیال نہ کرنا چاہئے۔ پھر ہفتہ باغبانی منایا گیا۔ عینی ہفتہ امتناع باغبانی۔ کیونکہ لوگوں کے باغیچوں میں پانی بہت مرتا تھا۔ گل، بوٹوں، گھاس اور سبزے کا صفایا ہونے کے بعد، اور جگہ کی تو ہم نہیں کہہ سکتے، تاہم آباد اور تاریک ناظم آباد میں پانی کی وہ فراوانی ہو گئی ہے۔ وہ فراوانی ہو گئی ہے کہ یہ ہفتہ منانے والے خود شرم سے پانی پانی ہو گئے ہوں گے۔ ٹل ہیں کہ ایک پل تھمتے ہی نہیں۔ گھر میں سیلاب سا آیا رہتا ہے۔ کیا ہے زمین فلک پہ ہے پانی کسر کسر۔ پھر بس والوں نے خوش اخلاقی کا ہفتہ منایا۔ سو کند کٹر لوگ ایسے نستعلیق ہو گئے ہیں کہ مرائض نویسوں کی زبان میں باقیں

کرتے ہیں۔

”حضور فیض گنجور۔ کیا فدوی یہ اتہاس کرنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ آپ ٹکٹ کر عند اللہ ماجور ہوں۔“

”اے جناب عالی مقام دام اقبالہ ظالمرہ۔ فٹ بورڈ سے ہٹ کے کھڑے ہوں۔“

”اے مہر بانو۔ سر پرستوں۔ بندہ نوازو۔ ذرا نیچے اتر کے بس کو دھکا تو لگائیے گا۔ داعی الی الخیر۔ آپ کا کنڈ کٹر عفی عنہ۔“



ہفتہ ٹریفک میں غاص بات یہ ہے کہ یہ سات دن میں ختم نہیں ہوگا بلکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لوگ ٹکٹ کی طرح سیدھے نہیں ہو جاتے۔ گھر کے اندر بھی لکیروں پر نہیں چلتے اور لال ہری بتیاں نہیں لگواتے۔ ٹریفک والوں کا فرمانا ہے کہ اب کے ہم کو کوئی جلدی نہیں۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے (راہِ راحت پر) جا بجا راہگیروں کے لیے ہدایات چسپاں اور آویزاں کر دی گئی ہیں بسن میں سے زیادہ تراگریزی میں ہیں۔ ہر راہگیر کو چاہیے کہ غالب کے نوحہ گر کی طرح اپنے ساتھ ترجمان رکھے کہ بھیا ذرا بتائیو تو کیا لکھا ہے؟ ویسے ٹریفک پولیس جا بجا مدر سے بھی کھول رہی ہے بسن میں لوگوں کو انگریزی لکھنا پڑھنا سکھایا جائے گا تا کہ وہ ٹریفک کی اور بلدیہ والوں کی اور کے ڈی اے والوں کی ہدایات اور سڑکوں کے نام پڑھ سکیں۔ اردو چونکہ باہر کی زبان ہے۔ کچھ صلاحیت بھی نہیں رکھتی اور پھر انگریزی کے ٹریفک میں خواہ مخواہ کی رکاوٹ ہے لہذا لوگ اس کا استعمال ناگ کر شرمندہ نہ کریں۔



موٹروں، بسوں اور دوسری سواریوں اور ان کے چلانے والوں کو تو خیر خاصی پڑتا ہے۔
 کے بعد لائسنس دیا جاتا ہے۔ بیدل چلنے والوں کو ابھی تک کھلی چھٹی ہے کہ جہاں چاہو
 بلا لائسنس گھومتے مٹر گشت کرتے پھرو۔ پس پولیس کو چاہیے کہ ان کا بھی امتحان لیا
 کرے۔ تب گھر سے باہر نکلنے کا لائسنس دیا جائے۔ انہیں چلا کے دیکھے دوڑا کے
 دیکھے۔ ان کی پیٹھ پر لائسنس کی تختی لگی ہو۔ آگے پیچھے بتیاں ہوں، گھنٹی ہوتا تھے پر ٹکونا
 کا غنڈ چپکا ہو کہ فلاں تاریخ کا ٹیکس اس نے دے رکھا ہے۔ اس کو غلط جگہ پارک نہ
 ہونے دیا جائے۔ وقتاً فوقتاً چیک کیا جائے کہ اس میں سے دھواں تو خارج نہیں ہوتا۔
 فضا مسموم تو نہیں ہوتی؟ جو بیدل چلنے میں مبتدی ہوں ان کو آگے پیچھے (L) ایل کا
 بورڈ لگانے کا حکم دیا جائے۔ ایسے گیرج بھی ہونے چاہئیں بسن میں بیدل راگیروں کو
 اور ہال کیا جائے۔ ان کا تیل بدلا جائے۔ ان کے ڈھیلے کل پُرنے کے جائیں
 وغیرہ۔



دھوئیں کے ذکر سے یاد آیا کہ ہمارے شہر میں دھواں بہت ہے۔ کارخانوں میں
 سے دھواں نکلتا ہے بسوں میں سے نکلتا ہے۔ سگریٹ پیٹنے والوں کے منہ سے نکلتا
 ہے۔ عاشقوں اور زمانے کے ستارے ہوئے لوگوں کے دلوں سے نکلتا ہے۔ مقررین
 تک بولنے پر آئیں تو دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں بلکہ ان کے دھوئیں سے بعض
 اوقات قوم کی صحت کو ڈیزل کے دھوئیں سے زیادہ ضرر پہنچتا ہے۔ خیر ان کا علاج ہم
 نہیں کر سکتے۔ گاڑیوں کا یہ حال ہے کہ کچھ پٹرول کی پاور سے چلتی ہیں۔ کچھ ڈیزل کی
 پاور سے۔ کچھ دھکے کی پاور سے۔ ہماری سفارش یہ ہے کہ اس آخر الذکر پاور کی حوصلہ
 افزائی کی جائے۔ ایک تو دھوئیں کا سد باب ہوگا۔ پھر زر مبادلہ بچے گا۔ کیونکہ گاڑیوں
 میں پٹرول کی ضرورت نہ ہوگی۔ ڈیزل کی ضرورت نہ ہوگی۔ انجن تک کی ضرورت نہ

ہوگی۔ یہ پاور مقامی طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ جس طرح شہر میں جا بجا پٹرول پمپ ہیں۔ کسی باہمت کو دھگکا پمپ قائم کر دینے چاہئیں جہاں لوگوں کی نکلڑیاں لنگیاں اور پھینڈے باندھے ہمہ وقت تیار رہا کریں۔ آج کل دھگکا عموماً بس کی سواریاں خود لگاتی ہیں۔ لہذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کو مستقل کر دیا جائے۔ سواریاں گھر سے نکلیں۔ کسی بس کو دھکیلتی اپنے اپنے دفتر پہنچ جایا کریں۔ شام کو نکلے اسی طرح کسی بس کو دھگکا دیتے گھر پہنچ گئے۔ اسے آٹو ٹیک پاور کہتے ہیں۔ بس کے اندر فقط دو سیٹیں ہوا کریں۔ ایک ڈرائیور کی ایک کنڈکٹر کی۔ ہم نے تجویز پیش کر دی ہے۔ اس کے مضمرات پر ٹریفک والے غور کریں۔



یہ جو اعلان ہے کہ ٹریفک کی مہم اس وقت تک جاری رہے گی جب تک لوگ راہ راست پر نہیں آ جاتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قیامت تک۔ تم بھی چلے چلو یونہی سب تک چلی چلے۔ ہر شخص پر کم از کم دو آدمی متعین رہنے چاہئیں کہ اسے برابر روکتے ٹوکتے رہیں یعنی ٹریفک پولیس کی تعداد بڑھانی پڑے گی۔ ساٹھ لاکھ کا نیشنل تو صرف کراچی کی تیس لاکھ آبادی کے لیے چاہئیں۔ قاعدے سے تو یہ کام منکر نکیر کا ہونا چاہیے جو ہر آدمی کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کا روزنامہ لکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ آپ کسی گڑھے میں گر رہے ہیں۔ مین ہول میں گر رہے ہیں تو یہ نہیں کہ آپ کو تھام لیا۔ بچالیا۔ بس ایک اندراج کر دیا کہ شخص مذکورہ گڑھے میں گر گیا ہے۔ باہر بیٹھے ہیں کہ کب کوئی اسے نکالے اور کب یہ روزنامہ نویس دوبارہ شروع کریں نہیں بھی نہیں۔ یہ خالی رجسٹر بھرے جانا ہمارے نزدیک کچھ کام نہیں۔ آخر دو آدمی ہو۔

اگر بنی کہ نابینا وچاہ است
اگر خاموشی بنشینی گنا ہست



ہماری دانست میں تو ٹریفک پولیس کا کام اسرافیل کا صور پھیلنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا۔ حشر کے میدان میں جو حشر برپا ہوگا۔ بھیڑ بھڑکا ہوگا اسے کون کنٹرول کرے گا۔ وہاں تو ٹریفک پولیس کی اور زیادہ ضرورت ہوگی۔ ”اے ٹیک لوگو۔ ادھر قطار لگاؤ۔ بمت کا گیٹ ادھر ہے۔ اپنا نامہ اعمال اپنے ہاتھ میں رکھو۔ شور مت کرو۔“ اے مولانا کدھر جا رہے ہیں آپ وہ تو دوزخیوں کی لائن ہے۔“ ”ہاں بھتی دوزخیو تم بھی اپنی لین میں رہو۔“ اے میاں آوارو گرد۔ کیوں مولوی صاحب کی ٹانگوں میں سے گھس کر اندر جا رہا ہے۔ یوں تھوڑا بمت میں جاسکے گا۔ وہاں بھی رضوان صاحب کی سخت چیکنگ ہے۔“ ”اے شاعر لوگو تم لوگ یہاں بھی افراتفری مچا رہے ہو۔ ہاں ہم نے بھی سنا ہے کد جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے لیکن بھائی قطار میں۔ ایک ایک کر کے اپنی اپنی باری پر جاؤ۔ اندر آگ ہی تو جل رہی ہے۔ دیکھیں تھوڑا ہی پک رہی ہیں۔ لڈو تھوڑا ہی بٹ رہے ہیں۔ مشاعرہ تھوڑا ہی ہو رہا ہے۔“



شہزادی امینہ نے اپنی شادی کے لیے ٹینڈر طلب کر لیے!

شہزادی امینہ۔ ایک حسینہ ہیں عالم میں انتخاب بلی ڈانس یعنی مکے پیٹ کا رقص دکھانے اور کو لھے منکائے کے لیے دور دور تک مشہور۔ اگر آپ اخبار پڑھتے اور اس میں نائٹ کلبوں کے اشتہار دیکھتے ہیں تو ان کی تصویر دیکھ کر ایک آدھ بار آنکھیں بھی نیچی کی ہوں گی۔ یا گلے میں بب باندھ کر رال ٹپکائی ہوگی۔ یہ حسینہ اپنے کمال فن کے جھنڈے ولایت تک کے کلبوں میں گاڑ آئی ہیں۔ کچھ جھنڈے انہوں نے پاکستان کے لیے بپار کھے تھے۔ آج کل وہ انہیں لاہور میں گاڑ رہی ہیں پھر ڈھاکہ جا کر گاڑیں گی۔ کراچی سے پہلے ہی آچکی ہیں اور ہم ان کے جھنڈوں کو غائبانہ سلامی دے سکے ہیں۔ آج کل گرمی کا موسم ہے۔ جسم پر کپڑے یونہی بار معلوم ہوتے ہیں۔ نائٹ کلب کی گرمی میں تو اور بھی کئی گرمیاں شامل رہتی ہیں۔ سنا ہے کہ لباس بے لباسی میں شہزادی صاحبہ کے رومان پرور بیجان انگیز اور جذبات میں حشر برپا کرنے والے رقص کے بعد تو سورج تک سوانیزے پر آ جاتا ہے۔

بلاے ہم نے نہ دیکھا پر لوگ دیکھتے ہیں
فردغ گلشنِ وصوت ہزار کا موسم

☆☆☆

لاہور میں ان شہزادی صاحبہ نے ایک پریس کانفرنس کی ہے۔ آج کل تو موچی جوتا گانٹھنے سے پہلے، دھوبی لاوی لادتے وقت اور کچڑا سبزی کا ٹھیلہ لگاتے ہوئے پریس کانفرنس کرتا ہے، یہ تو شہزادی امینہ ہے۔ اخبار نویس ان کے نام ہی پر کچے دھاگے میں بندھے چلے آتے ہیں۔ اس پریس کانفرنس کو اس لحاظ سے سوئمبر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں انہوں نے ضرورتِ رشتہ کا اعلان کیا ہے۔ امیدواروں سے نڈر طلب کے ہیں۔ ان کی شرطوں کے مطابق ان کا مرتاج ان سے زیادہ ذہین ہونا چاہیے۔ پھر اس کا دولت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ فرمایا ہے کہ ایسا گوہر یکدا نہ مجھے مل گیا تو میں فوراً اپنے ہاتھ پیلے کروں گی۔ ہرگز دیر نہ لگاؤں گی۔ اسے دم مارنے کی مہلت بھی نہ دوں گی تاکہ جلد از جلد اپنی زندگی کی ایک اہم اور دیرینہ خواہش پوری کر سکوں۔ وہ یہ کہ سیرے درہن بھر بچے ہوں۔ ایک ساتھ یا باری باری؟ اس کی انہوں نے وضاحت نہیں کی۔ خائبان کی مراد فردا فردا یعنی یکے بعد دیگرے سے ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نیک بی بی نے معاشرے میں عورتوں کے مقام پر بھی اپنے خیالات عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرمایا کہ عورتوں کو گھر میں رہنا چاہیے۔ یہی ان کی اصل جگہ ہے۔

☆☆☆

عزیزو۔ پرانے زمانے میں شادی کے لیے ایسی کڑی شرطیں کہاں ہوا کرتی تھیں۔ بھارت میں سوئمبر کی رسم تھی۔ راجپوت راجی نے نیچے پانی کے لگن میں عکس دیکھتے ہوئے اوپر گھومتی ہوئی مچھلی کی آنکھ میں نشانہ لگایا اور ستیا جی کو لے اڑے۔ ارجن نے بھی بس

ایک کڑی کمان کو توڑا اور گوہر مراد پالیا۔ حاتم طائی نے اپنے دوست منیر شامی کے لیے ذرا سا ہفتخو ان طے کیا۔ انڈے کے برابر موتی ڈھونڈا۔ حمام باد گرد میں ڈبکی لگائی، چنداڑھوں اور دیووں کو زیر کیا اور حسن بانو کی شادی کی شرطیں پوری ہو گئیں۔ فرہاد صائب بھی بس ایک پہاڑ کاٹ کر نہر لے آئے اور۔ لیکن یہ مثال کچھ غلط ہو گئی۔ مقصود یہ کہ پرانے زمانے میں یہ کوئی جستجو نہ کرتا تھا کہ لڑکا کتنا بڑھا لکھا ہے کیا کماتا ہے۔ پنجابی ہے یا یوپی کا ہے۔ حنفی المذہب ہے یا اثنا عشری ہے۔ قبول صورت ہے یا ہم ایسا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو اس کے صبح منھنے کی عادت کافی ہوتی تھی۔ جو شخص علی الصبح سب سے پہلے شہر میں داخل ہوتا تھا۔ آدھی سلطنت اور راجہ کاری کے ڈولے کا حقدار ہو جاتا تھا۔ اس کا یہ عذر تک کوئی نہ سنتا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ ہم ایسے دیر سے اٹھنے والوں کے لیے تو خیر اس زمانے میں بھی کوئی چانس نہ تھا۔ بس بے خوابی کے مریض پالا مار لے جاتے تھے۔ تاہم.....



اس کے مقابلے میں شہزادی امینہ کی شرطیں دیکھئے کہ ان کا ہونے والا منے کا لبا ان سے زیادہ ذہین بھی اور گرہ میں قارون کے خزانے کی کنجیاں بھی رکھتا ہو۔ ارے ہے کوئی گانٹھ کا پورا ذہین آدمی؟ ہو تو ہاتھ کھڑا کرے۔ ہمارے خیال میں تو ایسا آدمی چراغِ رخِ زیالے کے ڈھونڈتے رہیے۔ بونس واڈچر پر بھی مشکل ہی سے ملے گا۔ وہ فروا فروا چاہیں تو ایسے دو آدمی سپاہ کئے جاسکتے ہیں لیکن ایسا کہاں سے لائیں کہ سب اچھا کہیں بسے۔ آناں را کہ ایں وہند آں نہ دہند۔ اے بی بی کچھ کم کر۔ ہماری قوت خرید کا نیال کر۔ آخر بی دام بتا کیا لے گی۔ کم مایہ ہیں سوداگر اس دیس میں ارزاں ہو۔ خیر یہ اچھا ہے کہ شہزادی صاحبہ نے عمر یا تعلیم کی کوئی شرط نہیں رکھی۔ نہ خاندان۔ ولدیت اور سکونت وغیرہ کو اہمیت دی ہے۔ نہ پنجاب اور یوپی کا فرق کیا ہے۔ یہ ان کی

سیر چٹشی اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے۔ آخر شہزادی ہیں نا۔ یوں تو ہر نو عمر حسینہ ہمارے نزدیک شہزادی ہوتی ہے لیکن شہزادی امینہ آٹھو گانٹھ شہزادی ہیں۔ اپنا سلسلہ حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے جوڑتی ہیں۔ عمر کے باب میں انہوں نے فرمایا کہ نام خدا اٹھارہ برسوں کی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اٹھارہ برس سے تو ہم ان غنیفہ کو ناپتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مبالغہ ہے۔ شہزادی صاحبہ کی عمر اٹھارہ سال نہیں تو اٹھارہ سال کچھ مہینے ہوگی۔ ایک صاحبہ نے اپنی عمر اسی حساب سے بتائی تھی۔ جب کسی نے کریداکہ کتنے مہینے؟ تو اجمال کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ اٹھارہ سال ایک سو بارہ مہینے۔



عمر کے بارے میں شہزادی صاحبہ کے بیان کی تصدیق اس امر سے ہو سکتی ہے کہ وہ بقول خود شاہ فاروق کی حضوری میں بھی ناچ چکی ہیں، اگرچہ ان کے معیار پر پوری نہیں اتریں کیونکہ حضور جلالۃ الملک موٹی عورتوں کو پسند فرماتے تھے۔ شہزادی صاحبہ کی طرف سے ہمارا بنی ایک لحاظ سے خوش ہے وہ یہ کہ کلبوں میں کولھا ڈانس کرنے والی عمو مایہود نہیں اور فرنگین ہوتی تمیں جس کی وجہ سے ہمیں احساس کمتری ہوتا تھا۔ بارے اب ایک مسلمان خاتون میدان میں آئیں اور وہ بھی ایسے پاکیزہ خیال کی فرماتی ہیں عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہے (ہم نے تحقیق کر لی ہے۔ انہوں نے گھر ہی کہا ہے، ناچ گھر نہیں) ہم یہی بات کہتے تھے تو کوئی نہ مانتا تھا۔ ہمیں مٹا گردانتا تھا۔ دیکھو جادو کیسا سرچڑھ کے بولا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ دکن کے شاہی خاندان کی عظمت کو لوگ بھولے جا رہے تھے۔ بارے اسے پھر سر بلند کرنے والی ایک ہستی پیدا ہوئی۔ ”متارہی شکستہ، آفتاب ی سازند“۔ اللہ اس بی بی کے ارادوں میں برکت دے۔ ہم ان کی ہونے والی درہن بھرا دلاد کی درازی عمر کے لیے ابھی سے دعا گو ہیں۔

بارہ بچے پیدا کرنے کا عزم اور وہ بھی بالجزم۔ دیکھیں کون ہوتا ہے حریف مئے مرد
 آگن عشق، جس تو اتنے بڑے جھول کا خیال کر کے ہی بول آتا ہے اگلے اس ہم جنس کی
 جس پر شہزادی صاحبہ کی نظر انتخاب پڑے گی اور تو کیا مدد کر سکتے ہیں اسے یہی مفید اور
 مفت مشورہ دے سکتے ہیں کہ حکیم حبیب اشعر دہلوی سے رجوع کرے اور کرتار ہے
 درنہ ہم شانج کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے شہزادی صاحبہ ایک
 برطانوی لارڈ کے مہالہ نکاح میں رہ چکی ہیں۔ وہ ان کے رقص کے دوران میں ڈرم
 بجایا کرتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کو ہاؤس آف لارڈز میں بیٹھنا پڑا تو وہ
 ڈھول بجانے سے گئے اور علیحدگی ہو گئی۔ اصل وجہ یہ سنی جاتی ہے کہ ان کے ڈھول کا
 پول کھل گیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال ان کی شادی رہی بچہ صرف ایک پیدا ہوا۔ یہ رفتار
 چہاں تسلی بخش نہیں کہی جاسکتی۔ خصوصاً اس ایسی دور میں جبکہ ہر طرف سر بلع رفتاری
 کے ریکارڈ قائم ہو رہے ہیں۔ بہر حال امیدواروں کو ابھی سوچنے کی مہلت ہے۔
 شہزادی صاحبہ فی الحال جنوبی دیت نام جانے کا عزم رکھتی ہیں۔ وہاں امریکی فوجیوں
 کی دبستی کے لیے رقص پیش کریں گی۔ ان کا یہ فعل ہمیں کچھ مرے کو مارے شاہ مدار قسم
 کا نظر آتا ہے۔ وہ غریب تو پہلے ہی دیت کا نگ کے ہاتھوں دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔
 آپ پر مرنے یا آپ کے تیر نظر کا گھائل ہونے کے لیے کتنے باقی رہیں گے مگر۔ کہ
 زندہ کئی خلق را د باز کسی

اپنی شادی کی شرطوں میں شہزادی امینہ نے امیدوار کے دولت مند ہونے کا ذکر
 کر کے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ خالی ذہن لوگ تو ایک ڈھونڈ و ہزار ملتے
 ہیں جو تے چٹختے ہوئے۔ اس پر ہمیں وہ بزرگ یاد آئے ہیں کی نو نظریوں تو پانچ
 انگلیاں پانچوں چراغ تھی لیکن شکل صورت میں بس آدمی کا بچہ تھی جیسی ہماری

ادکارائیں میک اپ سے پہلے ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ ایک شخص ہمیں ساتھ کہ اس پر لٹو تھا لڑکی کے والد ماجد لکھ جتی تھے۔ ایک روز انہوں نے امید دار کو بلا کر اس کا انٹرویو لیا۔

”میاں صاحبزادے سنا ہے تمہیں ہماری صاحبزادی سے محبت وغیرہ ہے“

بولا۔ ”جی ہاں میں اس کے لیے آسمان کے تارے توڑ لا سکتا ہوں۔ چاند سورج اس

کے قدموں میں بچھا سکتا ہوں پہاڑ کاٹ سکتا ہوں۔ عذریاں.....“

ان بزرگ نے قطع کلام کر کے کہا۔ ”تمہیں شاید معلوم ہے کہ ہماری بیٹی کو چیزیں ۵

لاکھ روپے کی جائداد ملے گی۔“ امیدوار بولا۔ ”جی ہاں“

بزرگ نے کہا ”فرض کر داس کو یہ جائداد نہ ملتی وہ کسی غریب آدمی کی بیٹی ہوتی۔ کیا

تم پھر بھی اس سے شادی کر لیتے۔“

امیدوار نے کہا۔ ”جی ہاں۔ ضرور ضرور“

وہ بزرگ دفعۃً بھڑک اٹھے بولے۔ حد ہو گئی۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں ایسے

احسن سے اپنی بیٹی کی شادی کبھی نہیں کر سکتا۔“



بچ رہا ہے اور بے آواز ہے! فکرجو جرخاں کے اسپتال وغیرہ کا

اخبار کی خبر ہے کہ تحصیل گوجرخاں ضلع راولپنڈی میں ایک اسپتال ہے جسے ایک
 چوکیدار چلا رہا ہے۔ یہ انکشاف تب ہوا جب ڈپٹی کمشنر بہادر دورہ کرتے ہوئے رد رل
 ہیلتھ سینٹر موضع قاضیاں میں پہنچے۔ چوکیدار نے دیکھتے ہی انہیں زقائے کاسلیوٹ کیا
 اب آگے کی کارروائی کا آنکھوں نہ دیکھا حال سنئے۔

”دیل چوکیدار۔ اسپتال کیسا چل رہا ہے۔“

”حضور..... آپ کی عنایت سے اچھا چل رہا ہے۔ بہت اچھا چل رہا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں“

”حضور اس اسپتال میں کوئی ڈاکٹر نہیں“

”ڈاکٹر فی صاحبہ تو ہوں گی۔ انہی کو سلام بولو“

”جناب حالی! ڈاکٹر فی بھی کوئی نہیں۔ دس سال ہوئے اسامیاں تو منظور ہو گئی

تھیں۔ مقرر کوئی نہیں ہوا۔“

”باقی عملہ کہاں ہے۔ بلاؤ ان کو۔ ہم اس اسپتال کا معائنہ کریں گے۔“

”مائی باپ۔ میرا ہی معائنہ کر لیجئے کیونکہ ڈپنسٹر چھٹی پر ہے، ڈریسر چھٹی پر ہے۔
لیڈی ہیلتھ وزیٹر چھٹی پر ہے اور دوائی چھٹی پر ہے۔ سب کو ضروری کام ہیں۔ سب چھٹی
پر ہیں۔“

”مریض؟“

”جی وہ بھی چھٹی پر ہیں“

”بابا تم بھی چھٹی پر کیوں نہیں چلے جاتے“

”حضور۔ میں چلا جاؤں تو اسپتال کیسے چلے ڈپنسٹر اور ہیلتھ انسپکٹر اور دوائی وغیرہ کو ان
کی تنخواہیں گھر دل پر کون پہنچائے۔ سارا کام اکٹھا ہو جائے گا۔“

(۲)

بھگت کبیر ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ مدت ہوئی دم نے عمر کوٹ
کے اسپتال کا حال لکھا تھا جو بغیر دواؤں کے چل رہا تھا۔ اس جس ڈاکٹر البتہ تھے۔
سریض آتا تھا تو ٹوٹی لگا کر اس کا معائنہ کرتے تھے۔ اس کے بعد نسخہ لکھتے تھے۔ نسخے کو
تہ کر کے اس کا تعویذ بناتے تھے اور سریض کو ہدایت کرتے تھے کہ اسے بازو پر باندھ لو۔
یا پانی میں گھول کر پی جاؤ انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ایسے ہی ایک اور اسپتال کی خبر
اخبار میں آئی تھی جس میں تھرما میٹر ہی نہیں تھا۔ شروع میں ہوگا ضرور لیکن ٹوٹ گیا۔

اب سرکاری ڈپنسری میں اپنے پٹے سے تھرما میٹر لاکر کوئی رکھے۔ یہ تو بے ضابطگی
ہے۔ افران بالا جواب طلب کر لیں تو۔؟ جہاں تھرما میٹر نہ ہو وہاں بخار کا کیا کام؟ اگر کوئی
شخص زبانی آ کر کہے بھی کہ مجھے بخار ہے تو ڈاکٹر کہہ دیتے تھے کہ بھیا مہینہ بھر بعد
آئیو۔ تھرما میٹر کی خریداری کی اہوازت کے لیے فائل اوپر گئی ہوئی ہے۔ آجائے تو
خریدیں اور تمہارا بخار دیکھیں۔ بخار کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یونہی پنڈے پر یا نبض پر
ہاتھ رکھ کر بخار بتا دینا عطائیوں کا کام ہے، میڈیکل سائنس میں اس کی ممانعت ہے۔

(۳)

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جس اسپتال میں ڈاکٹر صاحب نہیں اس کے چوکیدار ہی نے مریض کے پرزور اصرار پر الماری کھول اے کوئی تنکیاں دے دیں یا انجکشن گھونپ دیا کہ شفا تو آخر شافی مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی مریض کو شفا کے مطلق بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ نہ مریض رہتا ہے نہ مرض۔ جہاں ڈاکٹر ہیں دوائیں نہیں۔ وہ تعویذ گنڈے کا کام باقاعدہ شروع کر دیتے ہیں۔ مریض کو دیکھا اور پھونک مار کر کہا۔ جا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حضرت عزرائیل کے نام کی نیاز دے دینا۔ جسے دنیا سے بھی جانا ہے وہ چار دن بعد گیا کہ پہلے گیا۔ بلکہ سنا ہے پہلے جانے والوں کو وہاں جگہ اچھی مل جاتی ہے،

(۴)

ہمارے شہر میں بعض ڈسپنسریاں اور زچہ خانے ایسے ہیں جن کے آگے پٹرول پمپ بنادیے گئے ہیں۔ حکمت یہ ہے کہ ڈاکٹر یا کمپونڈریا دوائی موجود نہ ہوں تب بھی ڈسپنری خالی نہ رہے۔ جاتے ہوئے پٹرول پمپ کے کارندے سے کہتے بائیں کہ بھیا دھیان رکھیں ہم ذرا چائے پی آئیں۔

مریض آیا تو پٹرول پمپ کا آدمی حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے مستعدی سے پوچھتا ہے۔ آئیے جناب، خدمت۔؟

”ڈاکٹر صاحب ہیں؟ کمپونڈر صاحب ہیں۔؟“

”اجی آپ کو ان سے کیا مطلب کام کیا ہے؟“

”بھئی دوائی لیتی تھی۔ جانے کیا مرض ہے۔ دن بدن گھلتا جا رہا ہوں۔“

”اجی دوا کی حاجت ہے۔ آئیے۔ ادھر آئیے۔ آپ میں ہوا بھرے دیتا ہوں۔“

”دیئے آپ سروس کرا لیجئے۔“

”بابا۔ ہوا نہیں چاہیے۔ کھانے کی دوا چاہیے۔“

”اچھا تو موہل آئیل دیتا ہوں۔ دو چمچے نہار منہ پی لیا کیجئے۔ اے آپ سر کے بالوں میں بھی لگا سکتے ہیں۔ دوں ایک ڈبا۔“

”موہل آئل؟ ارے میاں کیا کہہ رہے ہو؟“

”اچھا تو شیر مار کہ پٹرول ڈلوالیں اپنی ٹنکی میں۔ ہوا کی طرح تیرتے جائیے گا۔ کسی سے دھکا لگوانے کی ضرورت نہ رہے گی۔“

”ارے کیسی ٹنکی۔ کون سی ٹنکی۔“

”اب آپ سے بحث کون کرے بیٹھ جائیے۔ آتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب۔“

”تھوڑی دیر میں۔“

(۵)

ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ عشق کا ریت کہ بے آہ و فغان سر کنند۔ صرف اسپتال ہی اللہ توکل نہیں چل رہے۔ بہت سے دفاتروں کو بھی ہم نے خود کار پایا کہ زندگی کے ساز کی طرح بچ رہے ہیں اور بے آواز ہیں۔ یعنی بے آواز سہی لیکن بچ ضرور رہے ہیں اور یہی چاہیے

”یہ دفتر فافہ عامہ ہے؟“

”بنی ہاں۔ آپ نے ٹھیک فون کیا“

”بڑے صاحب ہیں؟“

”ابھی آئے نہیں۔“

”کب آئیں گے۔“

”پتا نہیں۔ آئیں آئیں۔ نہ آئیں نہ آئیں۔“

”چھوٹے صاحب تو ہوں گے۔“

”جی وہ آئے تھے چلے گئے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔

”ان کا اسٹنٹ ہوگا۔“

”حضور وہ چھٹی پر ہے۔ لمبی چھٹی پر ہے۔“

”اچھا کسی کلرک کو بلا دو۔“

”جی بابو لوگ تو چائے پینے گئے ہیں۔ کینٹین میں ہوں گے۔“

”کوئی اہل معاملہ آئے ہیں۔“

”جی بہت سے بیٹھے ہیں۔ بیچ بھرا ہوا ہے۔ آپ بھی آجائیے۔“

”میاں جب کوئی دفتر میں ہے نہیں تو آنے کا فائدہ۔“

”اجی فائدہ کیوں نہیں ٹھنڈا کمرہ ہے پکھا ملا ہے دوسرے اہل معاملہ سے بات

چیت کیجئے۔ واقفیت پیدا کیجئے، ڈیڑھ بجے دفتر بند ہوگا۔ آپ بھی چلے جائیے۔“

(۶)

اب تو خیر حکومت سختی کر رہی ہے ورنہ چلے اسکول کالج بھی ایسے تھے کہ چوکیداروں کے بل پر چلتے تھے جزوقتی استاد کسی اور درگاہ میں پڑھاتے ادھر سے بھی گزر جاتے تھے۔ آئے طلبہ کی حاضری لی، اور چلے گئے۔ آئے فیس وصول کی اور چلے گئے۔ آئے یہ بھی نہ کیا اور چلے گئے۔ وہ خوش اور طلبہ بھی خوش۔ کیوں نہ تعلیم کے سائنٹفک نظریہ کے مطابق طالب علم پر کتابی علم کا بوجھ زیادہ ڈال دیا جائے تو اس کی شخصیت دب کر رو جاتی ہے۔ بچ پوچھتے تو ہسپتال یا اسکول یا دفتر کی تخصیص نہیں۔ پوری دنیا چوکیدار کے بل پر چل رہی ہے۔ دنیا بھی اور عقیقی بھی۔ وہ جسے ہم ہر روز ڈھونڈا کرتے ہیں۔ اس جگہ کار کھولا ہی تو ہے، دوسرے الفاظ میں یہ پوری کائنات گوجرناں کا اسپتال ہے۔

☆☆☆

ذکر اُونٹوں کا اور بلیوں کا!

کسی نگر میں کوئی شخص تھا..... ہم جیسا آپ جیسا، اس کا کوئی کام بگڑا تو اس نے منت مانی کہ یا پیر جھنڈا۔ اگر یہ کام رو براہ ہو جائے تو اپنا یہ اونٹ خدا کی راہ میں کسی کو ایک ٹکے کے عوض دے دوں۔ کرنا خدا کا اس کی سزا پوری ہوئی۔ اب یہ حضرت چکنم میں اتنا بڑا اونٹ ایک ٹکے میں کیسے دے دوں، اُدھر جھنڈا پیر کی خفگی کا بھی ڈر۔ ایک مہربان سے مشورت کی۔ وہ وکالت پاس بھی تھے اور اتفاق سے انجمن تادیل خن کے لیڈر بھی، بولے، اے میاں غم نہ کر، ایسا قانون چھانسیں گے کہ تیرا نقصان بھی نہ ہوگا اور منت بھی پوری ہو جائے گی، با ایک بلی کہیں سے پکڑ کے لا۔ وہ ایک خویاتی ہوئی سریل بلی لے آیا، ان بزرگ نے فرمایا اسے اپنے اونٹ کے گلے میں باندھ، باندھ دی۔ فرمایا۔ اب ان پر قیمتوں کی چٹ لگا دے۔ اونٹ پر ایک ٹکے کی اور بلی پر پانچ سو روپے کی۔ پھر اعلان کر دے کہ لوگو! گھر لٹا دیا ہے، مال سستا لگا دیا ہے، شرط فقط یہ ہے کہ جو اونٹ کو خریدے گا، اُسے ملی بھی مول لینی ہوگی۔ دونوں جالوروں کا الگ الگ سودا منظور نہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا دستور نہیں۔



معلوم نہیں اس حقیقت کیش کا آلو سیدھا ہوا کہ نہیں یعنی اُس کی بلی بکی کہ نہیں۔ لیکن

اس کے بعد سے اونٹ کے گلے میں بلی باندھنے کا رواج اور محاورہ چل نکلا۔ اس کی ایک مثال تو فارن ایڈ یعنی غیر ملکی امداد ہی کو جاننے کے دینے والا اس طرح ایک ہاتھ سے دیتا ہے کہ دوسرے ہاتھ کو پوری پوری خبر رہتی ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ اے بھتیجے پسماندہ خان..... یہ لے تھیلی۔ غریب جان کر تیری مدد کئے دیتے ہیں کہ سخاوت اور خدا ترسی ہمیشہ سے ہمارے خمیر میں ہے۔ لیکن اس رقم کو خرچ کرنے کی ترکیب تجھے کیا معلوم ہوگی؟ ہم اپنا مشیر بھیجیں گے، اُس کی تنخواہ اسی تھیلی میں سے دیکھو۔ جو مال باہر سے منگائیں وہ ہمارے ملک سے اور ہمارے ملک کے جہازوں میں منگائیں۔ مہنگے سستے کی فکر مت کیجیو۔“ میاں پسماندہ خاں نے خوش خوش تھیلی لی اور ”تھینک یو یا سخی“ کا پھر پر الہرایا۔ چند روز میں من کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ تو موجی کا موچی ہے۔ ہاں سخی داتا نے ہر طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح اپنے پاؤں پھیلا لیے ہیں اور اپنا بندوبست دوائی رائج کر دیا ہے، اس کے بعد سے سمجھدار اسمیاں شرط کرنے لگیں کہ چچا میاں۔ تھیلی تو لیں گے لیکن اس کے ساتھ کوئی رسی ڈوری String وغیرہ نہیں چاہئے۔ سراد یہی کہ رسی ہوگی تو اس کے دوسرے سرے پر ضرور کچھ نہ کچھ بندھا ہوگا تلی۔ مشیر۔ فارن پالیسی۔ سی آئی اے، فوجی اڈہ وغیرہ۔



پچھلے دنوں پھر ہمیں یہ محاورہ یاد آیا۔ اسرائیل نابکار نے مسجد اقصیٰ کو آگ کیا دکھائی۔ سارے عالم اسلام میں آگ لگ گئی۔ دنیا بھر کی مسلمان آتش زیر پا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارے ہاں بھی جلوس نکلے اور جلے ہوئے۔ مسئلے کے تقدس کا تقاضا تھا کہ پوری توجہ اس پر مرکوز رہے لیکن سیاست اور موقع شناس لوگوں نے یہاں بھی، پنجابی محاورے کے مطابق اپنے اپنے لُچ تلنے، اور اردو محاورے میں اپنی اپنی بلیاں اس اونٹ کے گلے میں باندھنی شروع کیں، انباروں میں اعلان آنے لگے کہ آج کمپنی

باغ میں جلسہ ہوگا جس میں مسجد اقصیٰ اور فلاں مسئلے اور فلاں قضیے اور فلاں واردات پر احتجاج کیا جائے گا ہم نے کچھ اس قسم کی منادی ہر طرف سنی :-

۱۔ آج شام کراچی دھوبی پنچائت کے جلسے میں مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی اور کاسٹک سوڈے کی گرانی کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جائے گا، غیر دھوبی حضرات بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

۲۔ آج انجمن فلاح کورنگی کے جلسہ حام میں مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کا رپورٹیشن کے عملہ صفائی کی زیادتیوں اور بھینسوں کو شہر بدر کرنے کے خلاف احتجاجی قراردادیں منظور کی جائیں گی۔

۳۔ حضرت قبلہ فلاں نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی۔ لامحدود ذاتی ملکیت میں کسی قسم کی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ وغیرہ۔



اور لوگوں کی مثالیں تو چھوڑ دیجئے کہ محض برائے وزن بیت ہیں۔ سیاسی مقدمین کی یہ شتر گری اور یینگنیاں ڈال کر دو دھو بیٹا خانی از مصلحت نہیں۔ اگر معاملہ مسجد اقصیٰ تک ہی رہے تو لوگوں کی توجہ عربوں کے کاز پر مرکوز ہو جائے گی۔ لوگ مصر، شام، عراق، اردن اور الجزائر کے عربوں اور ان کی حکومتوں کی ہمدردی میں گرفتار ہو جائیں گے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اسرائیل کے خلاف زندگی موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ بعض تو الفتح کے فدائی بھی بن جائیں گے جو برملا دیت نامیوں وغیرہ کی تعریف اور تقلید کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے۔ اچھا لوگوں کو مسجد اقصیٰ کے نام پر جمع ہونے دو۔ ہم اس میں اندرون ملک کے قضے اور باہمی قضیے کھینچ لائیں گے حتیٰ کہ حقیقت خرافات میں گم ہو جائے۔ اصل مسئلہ ہی غمتر بود ہو جائے۔

سب جگہ تو نہیں لیکن بعض جگہ یہی ہوا۔ مسئلہ مسجد اقصیٰ کا ہے۔ خیال پارلیمنٹ کی ممبری میں اٹکا ہوا ہے۔ نام کعبہ کا ہے اور راہ ترکستان کی ہے۔ ستم موٹے دایان نے کیا ہے اور عرصہ مولانا عوام دوست پشاوری پر اتارا جا رہا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے ہمیں ایک جلسے کا احوال آ کر سنایا کہ مقرر خصوصی نے اپنی پاٹ دار آواز میں فرمایا۔

”اے لوگو۔ اے مسلمانو۔ مسجد اقصیٰ کا جلایا جانا بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن آج کل ظلم کہاں نہیں ہوتا۔ فلاں شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ ہماری ہی پارٹی کا ایک جلسہ تھا۔ کچھ لوگوں نے ہمارے ایک آدمی کے تھپڑ کھینچ مارا۔ بھائی لوگو۔ بالکل بے قصور۔ بیچارے کی نکسیر پھوٹ گئی۔ ارے تلی بندھ گئی خون کی۔ ساری قمیص لہو لہان ہو گئی۔ سارے پا جاے کا ستیاناس ہو گیا..... مجمع میں سے کسی نے آواز لگائی۔“ حضرت بات مسجد اقصیٰ کی ہو رہی ہے۔“

مقرر نے پینتر بدل کر کہا۔ ”ہاں ہاں بھائی۔ مسجد اقصیٰ ہمیں جان سے عزیز۔ ہم اس کے جلائے جانے کے ہر گز حق میں نہیں بلکہ سراسر خلاف۔“

برادران اسلام۔ مسجد اقصیٰ کا بڑا درجہ ہے اور ہم نے ریزولیشن پاس کر کے اور ہڑتال کے ذریعے اپنے چلتے کارخانے دفتر اور کاروبار بند کر کے اسرائیل پر جو ضرب کاری لگائی ہے، اس کے بعد وہ ایسی ناشائستہ حرکت نہ کرے گا۔ اب رہا ہمارے آدمی کی نکسیر پھوٹنے کا معاملہ۔ ارے ہمیں سمجھا کیا ہے، ہم کفن بدوش لکل آئیں گے، کشتوں کے پستے لگاویں گے۔ خون کی ندیاں بہاویں گے۔ اٹھو اگر نہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا!

یاد آیا مے کہ ہم ہٹلر کو ڈانٹ دیتے تھے

پچھلے دنوں اخبار پڑھتے میں ایک خبر پر ہماری نظر رک گئی۔ لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ حماقت نے فلاں ادیب مشہر کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی اور یونیورسٹیوں کی طرح وقتاً فوقتاً حماقتیں سرزود ہوتی رہی ہیں (ہمیں ڈگری دینا بھی انہی میں سمجھ لیجئے) اور جیسا کہ کاٹھیاواڑ یو پارمنڈل کے صدارتی خطبے میں سیٹھ کھلی بھائی بھولہ بھائی باروانہ والے نے فرمایا ہے۔ دستخط اور گنتی پہاڑے وغیرہ سیکھنے سے آگے پڑھنا ہے بھی بجائے خود حماقت۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک مستقل شعبہ حماقت قائم کر دیا ہے تاکہ جو لوگ اس مضمون میں خصوصیت حاصل کرنا چاہیں وہ اس میں باقاعدہ فارغ التحصیل ہوں۔ ڈگری لیں اور آگے طلبہ کو فیض پہنچائیں۔

سیرا پیغام حماقت ہے جہاں تک پہنچے

☆☆☆

پھر خیال آیا کہ کہیں یہ کتابت کی غلطی نہ ہو۔ کیونکہ حماقت کوئی قانون یا جغرافیہ تو

ہے نہیں کہ پڑھنے سے آجائے۔ یہ تو ایک خداداد بات ہے۔ اللہ چھپر بھاڑ کر دیتا ہے۔ اور اس وقت بھی اس فن شریف میں درک رکھنے والے اتنے لوگ موجود ہیں کہ بھارت میں مورکھ منڈال اور پاکستان میں انجمن امتیاء کی شاخیں جا بجا کھلی ہیں۔ بھارت کے مورکھ منڈال میں تو بعض وزیر بھی شامل ہیں۔ یا پھر یہ ہوگا کہ وزارت میں دو مورکھ منڈال کی نمائندگی کرتے ہوں لیکن ان میں سے کوئی حماقت کو بطور مضمون کے شاید ہی پڑھا ہوگا۔ ہونہ ہو یہ شعبہ حجامت ہے۔ ہمارے کرم فرما حضرت اسلام سلمانی بی۔ اے اور ان کی جماعت ایک مدت سے کوشاں تھی کہ اس فن کو فنون لطیفہ میں داخل کر کے یونیورسٹی میں اس کی تدریس کا انتظام کیا جائے۔ اب جا کر یہ کوشش بار آور ہوئی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ ایک کمرہ میں فلسفے کا استاد تقریر کر رہا ہے کہ دیکارت اور شوپنہار کے فلسفوں میں کیا فرق ہے۔ پاس کے کمرے میں پروفیسر خلیفہ امام دین طلبہ کو بتا رہے ہیں کہ واڑھی میں کتنا صابن لگانا چاہیے جس سے بال نرم ہو جائیں اور گاہک کی اٹلے استرے سے حجامت کرنے میں آسانی رہے۔

مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ نہ حماقت نہ حجامت۔ خبر کا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ کاتب صاحب نے صحافت کو حماقت کیوں لکھا؟ لیکن ہے انہیں وقت پر تنخواہ ملی ہو۔ لیکن اتنی سی بات پر گھر کے بھیدی کا پوری انکا ڈھا دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ صحافت سے وابستگی اگر حماقت ہے تو اس راز کو فری میسنوں کی طرح اپنے سینے میں رکھنا چاہیے۔ اپنی برادری سے باہر فاش نہیں کرنا چاہیے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔ اب تو یہ راز طشت از بام ہو چکا۔ اب ہم اس کی شرح لکھیں گے تو ہم پر کسی طرح کا الزام نہیں۔ یہ بات ہم بھی بیس برس سے جانتے تھے لیکن ایسے اوچھے نہیں تھے کہ ہر ایک سے کہتے پھرتے۔ یہی حال ہمارے دوسرے سینکڑوں صحافی بھائیوں کا ہے کہ ایک بات جو ان سے مرز و ہو گئی ہے اسے نبھائے جا رہے ہیں بلکہ بعض تو یہ تک ظاہر کرتے

ہیں جیسے بڑی عقل کی بات کر رہے ہوں۔



سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ حماقت ہے تو اس کا احساس کچھ دن بعد جا کر ہوتا ہے۔ ہمیں آج کل ہور ہا ہے کہ سیدھی سادی دل کی بات لکھتے ہیں وہ بھی خوش طبعی کے ساتھ جو کچھ ہے حجامن کے بالوں کی طرح آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس پر بھی ادھر کچھ چھپا اور کسی گروہ کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ ادھر لوگ دفد اور ڈنڈے لے کر پہنچ گئے کہ نکالو اس شخص کو باہر۔ کہیں سے اشارہ ہوا اور اطراف و جوانب سے ایک ہی طرح کے اہ را ایک ہی مضمون کے خطوں کی لین ڈوری بندھ گئی..... یہ تو خیر سیاسی جماعتوں کا حال ہے۔ لاہور میں ہمارے ایک دوست نے جو اخبار کا فلمی صفحہ مرتب کرتے تھے کہیں لکھ دیا کہ فلم ”چڑیا کی ڈگی“ کے مکالمے کمزور ہیں اور کہانی میں بھی جان نہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ فلم ایک مشہور پہلوان نے بنائی ہے۔ وہ اگلے ہی روز اپنے پٹھوں کے ساتھ اخبار کے دفتر پہنچ گئے، اس صحافی کو گریباں سے پکڑ لیا اور کہا۔ اگر مکالمے کمزور ہیں تو ہم تو کمزور نہیں اور اگر کہانی میں جان نہیں ہے تو تم میں کونسی جان ہے۔ ڈیڑھ پہلی کے آدمی ہو باہر نکل دو وہ ہاتھ ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے بڑی مشکل سے تھوٹھمو کیا۔ جاتے ہوئے دھمکی دے گئے کہ آئندہ میری کسی فلم کے متعلق کچھ ایسا دیا لکھا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ دھوبی پٹراؤں گا کہ عمر بھر بلدی چونا لگاتے رہو گے۔

اب تو خیر حالات بہت بہتر ہیں۔ صحافیوں کو تنخواہ بھی مل جاتی ہے اور پریس کلب میں بیٹھ کر تمبولہ بھی کھیل سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو بس یہی عشرت تھی کہ کمر بند کر کے قلم ہاتھ میں اٹھایا اور ساری دنیا ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہٹلر کو ڈانٹ دیا کہ خبردار اگر تو نے اور قدم آگے بڑھایا تو ایسا ایڈیٹور مل لکھوں گا کہ ناک رگڑنے کو

دوڑا دوڑا آئے گا۔ اور ہماری حکومت بھی سمجھ لے کہ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم آزادی تحریر کے لیے اپنا مکان بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیا ہے، کپڑے بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیے ہیں، گھڑی بیچ سکتے ہیں اور بیچ گج بیچ دی ہے لیکن اپنا قلم نہیں بیچ سکتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچ سکتے۔ یہودیوں کو پھنکار رہے ہیں کہ دیکھو بہت ظلم ہو لیا۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ اب کے مار کے دیکھو۔ ہمارے بزرگ مولانا اختر علی خاں مرحوم کا وہ قصہ تو بہت مشہور ہے کہ ولایت گئے اور وزیر اعظم اٹلی سے ملے اور کہا۔ دیکھئے جناب کشمیر کا مسئلہ فوراً حل کر دیجیے۔ ایک حسینی کی مہلت دیتا ہوں ورنہ“ اٹلی صاحب کی ٹی گم ہوگئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ منحنی آواز میں بولے۔ ”ورنہ کیا؟“

مولانا نے فرمایا۔ ”ورنہ میں آپ کے خلاف زمیندار میں ادارہ لکھوں گا۔“ یہی چسکہ تھا کہ لوگ گھانا کھا کر فقیر ہو جاتے تھے لیکن اخبار ضرور نکالتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کا ایک ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اسے خود ہی مرتب کرتے۔ چھپواتے دوکانوں پر دے کر آتے۔ اشتہار کے بل کے لیے سینڈ کوفون کرتے کہ ”جناب بہت دیر ہوگئی۔ پیسے دلوائیے۔ میں اپنے چرای کو بھیج رہا ہوں“ اس کے بعد خود ہی تھیلالے سائیکل پر بیٹھ سینڈ کے دفتر پہنچ جاتے کہ مجھے ایڈیٹر صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ بہت خفا ہیں۔ پیسے آج ہی دے دیجئے۔ ہاں اداریے اور کالموں میں ان کا طنز نہ دیکھنے کا ہوتا تھا۔ افسوس کہ اس چسکے کے دن بھی انگریزوں کے ساتھ گئے۔ کوئی دو سال ہوئے ہمارے ایک دوست کو ایک اخبار میں بڑی سفارشوں کے بعد کالم لکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے پہلے ہی کالم میں اعلائے کلمۃ الحق کرویا کہ ”میرا قلم مقدس ہے۔ میں اپنے ضمیر کے علاوہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گا۔ صدر ایوب کوئی غلط کام کریں گے تو ان کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں انکچاؤں گا۔“ دوسرے روز ہم ان کے کالم کے منتظر رہے۔

تیسرے دن بھی اور پھر منتظر ہی رہ گئے۔ ان کا کالم پھر نہ چھپا۔ معلوم ہوا لات مار کر نکال
 دیئے گئے۔ گھر میں بیٹھے چنے چاب رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔
 موبار ترا وامن باتھوں میں مرے آیا
 جب آنکھ کھلی دیکھا، اپنا ہی گریباں تھا



حساب کتاب روپوں کا، اور فائدے غربتی کے!

سبزی دفتر اعداد و شمار سے خرید ا کیجئے!

کسی دانائے کہا ہے اور اس قسم کی احمقانہ بات کوئی دانای ہی کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ کے تین مدارج ہیں۔ نچلے درجے کے جھوٹ کو جو ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سبھی حسب توفیق بولتے ہیں۔ فقط جھوٹ کہتے ہیں۔ اس سے اوپر سفید جھوٹ کا نمبر آتا ہے۔ اور جو اس سے بھی ارفع داعلی ہواے اعداد و شمار یعنی Statisties کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہنے کو تو ہم نے اس قول کو احمقانہ کہہ دیا ہے لیکن یہ ایسا نہیں۔ حد سے حد یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح انسان کو اخفا کے لیے نطق ملا ہے۔ اسی طرح حقیقت حال کو چھپانے کے لیے اعداد و شمار کی نعمت عطا ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی اس کا رواج کم ہے۔ امریکہ وغیرہ میں تو ہر بات اعداد و شمار کی روشنی میں کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ امریکہ میں ہر ۲۲/۳ آدمی کے پاس کار ہے۔ ہمارے ہاں کوئی سادہ لوح یہ بات سنے گا تو یہی سمجھے گا کہ امریکہ میں ۲/۳ قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یعنی سرخاب ہے دھڑ موجود ہے اور کار چلا رہے ہیں۔ اس گمان کو اس بات سے اور تقویت ملتی ہے کہ امریکہ سے ایسے بیانات اکثر آتے رہتے ہیں جن کے لیے سر یا اس کے اندر کے دماغ کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ نیچے کا ۳/۲ دھڑ زیادہ اہم اس لیے ہے کہ جیسے ہی اس میں ہوتی ہیں پیسے رکھنے کے لیے۔ عقل بڑی کہ بھینس، پیسہ بڑا کہ دماغ۔؟

☆☆☆

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ہمارے ہاں اعداد و شمار کا رواج کم ہے اور اس پر بھی لوگوں کو اعتبار کم ہے۔ اس لیے کہ دفتر اعداد و شمار کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ مصارف زندگی میں ایشاریہ ۵۰۰۰۰ فی صد کی ہو گئی ہے جو کاغذ پر بہت بڑی لگتی ہے۔ ادھر بازار میں دس آنے سیر دالی دال دور پے سیر ہو جاتی ہے۔ ریڈیو پاکستان سے ہر صبح سبزیوں، پھلوں اور انڈوں کے نرخ نشر ہوتے ہیں؟ بازار میں جائے اور دکاندار کو ان کا حوالہ دیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ حضرت اس بھاد سبزی چاہیے تو مرکزی دفتر اعداد و شمار سے لیجئے۔ ہمارے ہاں تو وہی بھاد ہے جو آپ کو بتا دیا ہے۔ سابق حکومت کے دور میں ٹھسے سے اعلان ہوتا رہا ہے کہ ہماری قومی آمدنی میں ہر سال آٹھ یا دس فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے۔ عام آدمی سے کہتے تو وہ اسے جھوٹ قرار دے گا۔ لیکن سیٹھ اور مل مالک سے پوچھئے تو کہے گا۔ جردر ہوئی ہے جناب۔ نکتہ یہ ہے کہ اس قسم کے اعلانات میں قوم کا مطلب سیٹھ سا ہو کار ہوتا ہے۔ اسی لیے تو وہ سالہ ترقی کے دور میں یہ ہوتا رہا کہ فتح برٹش کی ہوتی ہے، قدم جرمن کا بڑھتا ہے۔

☆☆☆

ان ہی کاموں میں ایک بار ہم نے ذکر کیا تھا کہ بارہ کروڑ عوام کے گاڑھے مہینے کی کمائی کا ۸۰ فیصد یعنی قومی دولت کا بیس ارب روپیہ پاکستان کے تیس برگزیدہ خانوادے اپنی تجویروں میں ڈال لیتے ہیں اور میاں عوام الدین مفلس کا مفلس رہتا ہے۔ چونیاں کے ایک دیکیل صاحب کے منشی جی نے اس کا حساب پھیلایا اور وکیل صاحب کو بتایا۔ وکیل صاحب نے ہمارے دوست عمقا صاحب تک پہنچایا اور عمقا

صاحب سے انشاء صاحب تک آیا ہے جس طرح پرانے زمانے میں سلطنت دست بدست آتی تھی۔ اسی طرح ہم اعداد شمار کے ان موتیوں کو اپنے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اسے وہ بطور عید کے قبول کریں۔

☆☆☆

منشی جی کے حساب کے مطابق ہر خاندان کا حصہ ۶۶/۶۶۶۶۶۶۶۶ آتا ہے یعنی چھیاٹھ کروڑ چھیاٹھ لاکھ، چھیاٹھ ہزار۔ الخ۔ منشی جی نے ازراہ فیاضی لاکھوں کا حساب چھوڑ دیا ہے۔ ہم تو کبھی نہ چھوڑتے۔ ہمارے لیے تو ۶۶ روپے اور ۶۶ پیسے بھی بہت ہیں۔ بہر حال انہوں نے فقط چھیاٹھ کروڑ لیے اور حساب لگایا کہ اگر کوئی سیٹھ صاحب ۶۶ کروڑ روپے کا چیک ایک ایک روپے کے کرنسی نوٹوں کی شکل میں کیش کرائیں تو ان نوٹوں کو بحساب سو نوٹ فی سنٹ کی رفتار سے گننے کے لیے کیشیئر صاحب کو ۱۳ سال اور چند مہینے کا عرصہ چاہیے۔ ہاں اگر یہ رقم سب سے بڑے یعنی پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی شکل میں کی جائے تو آٹھ نوڈن میں گنی جاسکتی ہے۔ اگر سیٹھ صاحب نوٹوں کی بجائے گول گول روپے لینا چاہیں تو ایک روپے کا نوڈن ایک تولہ کے حساب سے ۶۶/ کروڑ روپے کا نوڈن ۳۶۶ ٹن بنے گا۔ اب اگر اس رقم کو انہیں لاہور بھیجنا ہے تو ریلوے کے بیس ٹن اٹھانے والے ۳۶۸ وگن درکار ہوں گے۔ ہر مال گاڑی میں عموماً پچاس وگن ہوتے ہیں۔ اگر سیٹھ صاحب کی رعایت سے ہر مال گاڑی میں ۵۲ وگن لگائے جائیں تو اس مال کو سات مال گاڑیاں لاہور لائیں گی۔

☆☆☆

یہ تو ہوا ایک سیٹھ صاحب کا حساب۔ اگر ان تیسویں سیٹھوں کی بیس ارب روپے کی دولت سکوں کی شکل میں لاہور لائی جائے تو گویا ہزار پانچ سو اسی وگن یعنی ۲۳۲ مال

گاڑیاں درکار ہوں گی۔ پاکستان میں اتنی گاڑیاں ہیں ہی نہیں۔ اگر خیر میل ان تمام گاڑیوں کے بعد روانہ ہو اور یہ سب مال گاڑیاں دس دس منٹ کے وقفہ سے چلیں تو خیر میل کی باری تین دن بعد آئے گی اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب لاہور پہنچے گی۔

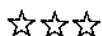


یہ حساب کیا کم تھا کہ عنقا صاحب نے ریزگاری کا موال اٹھا دیا اور کہا کہ میں ارب روپے کے میں کھرب پیسے بنتے ہیں۔ اگر ایک آدمی روزانہ دس ہزار پیسے گنے تو ایک ہی دن میں پوری گنتی کے لیے میں کروڑ آدمی درکار ہوں گے۔ اور ہماری آبادی ہے فقط ۱۲ کروڑ.....



عنقا صاحب نے بھی یہ فرض کر لیا ہے کہ بارہ کروڑ آدمی بلا کچھ کھائے چے پیسے گننے بیٹھ جائیں گے اور اس بارہ کروڑ نوے سالہ ضعیف۔ ہسپتالوں کے بیمار۔ جیلوں کے قیدی اور ہم ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہیں میں سے آگے گنتی نہیں آتی۔ ہم تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اتنی دولت نہیں رکھتے۔ جو بے اسے خود دس منٹ میں کیا، آدھے منٹ میں گن سکتے ہیں، ہمارے پاس یہ روپے کے انبار ہوتے تو ریلوے دالوں کی خوشامد کرنی پڑتی۔

ہاتھ جوڑتے پھرتے کہ بھیا ذرا ہمارا یہ روپیہ تو لاہور عنقا صاحب کے دفتر تک پہنچا دو..... اور یہ لو چائے پانی کے پیسے..... ارے دس روپے بہت ہیں امتداد۔ ہم غریب آدمی ہیں، اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ وغیرہ۔ گویا غریبی کا ایک فائدہ تو ہوا اور بھی کئی ایسے فائدے ضرور ہوں گے۔



ہماری تقریر یوم غنغب گھڑیا لوی پر!

اور مسٹر ہیگ روٹرڈم کا خطبہ اقبال کے بارے میں

”جی فرمائیے“

”حضور میں ہوں گجراتی ادبی منڈل کا سکریٹری تار محمد دکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور

ادیب حضرت غنغب گھڑیا لوی کی بری منار ہے ہیں۔ آپ صدارت فرمائیے گا“

”دکھیا صاحب۔ ہم انکار کر کے آپ کو مزید دکھیا تو بنانا نہیں چاہتے۔ لیکن گجراتی

”ہم نہیں جانتے اور غنغب صاحب کا نام بھی آج ہی سنا ہے۔“

”جی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں جو

موضوع یا مددح کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں۔“

”عجیب بات ہے۔ مثالیں دے کے واضح کیجئے تار محمد صاحب۔“

”آپ نے سنا ہوگا پچھلے دنوں برڈھی صامب نے اقبال کی شاعری پر ایک نہایت

پر مغز تقریر کی بعد ازاں فرمایا صاحبو۔ میں نہ اردو جانتا ہوں نہ فارسی۔“

”ہاں یاد آ گیا۔ اردو نہ جاننے کے متعلق تو انہوں نے معقول دلیل بھی دی تھی کہ

میری اپنی زبان اس سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر ہے۔ فارسی زبان کے بارے میں

معلوم نہیں کیا کہا تھا۔ لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اس پر نہایت جامع مانع اور مدلل تقریر کرے۔“

”لیکن جی بیگم وقار النساء نون نے تو یوم اقبال اور نذر الاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دلپسند تقریر کی۔“

”بھئی ہم انہیں جانتے نہیں۔ کیا پتہ وہ اردو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں۔“

”جی انہوں نے وضاحت کر دی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پس اے حاضرین جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ السلام علیکم۔“

”بھئی ہماری مصروفیات ہیں۔ ہمیں معاف کرو۔“

”جی آپ گھبراتے ہیں انشاء صاحب۔ گھبراہٹ نہیں یوں تو آپ کو معلوم ہے ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ کہیں آپ رکیں تو یہ بند و لقمہ دینے کو تیار ہے۔ یا تو میں آپ کے کان میں بتا دیا کروں گا۔ آپ پانی پینے کے بہانے سن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھا دیا کروں گا۔“

ہم نے کہا اچھا بھئی۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور۔ ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ.....



جناب تار محمد ڈکھیا نے ہمارے گلے میں گولے کا چمکیلا ہار ڈالا۔ جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا۔ اور اس کے علاوہ مختلف مگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارے علم و فضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشاء صاحب گجراتی زبان نہیں جانتے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے

کہ غیب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔ تاہم وہ غیب مرحوم کے افکار اور زندگی پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لا کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ اب میں انشا صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔

ہم نے پانی مانگا، مکریٹری صاحب نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا پورا جگ چاہیے۔ وہ بھی آگیا۔ ہم نے سکریٹری صاحب کو ان کا فرنیس یاد دلایا اور پانی پی پی کریوں رطب اللسان ہوئے۔

”صاحبو۔ حضرت غیب گھڑیا لوی کو کون ہے جو نہیں جانتا۔ پاکستان کے لیے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ (سکریٹری نے پرچی دی، ان کا انتقال تو ۱۹۱۳ء میں ہو گیا تھا) حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے ۱۹۱۳ء کی لڑائی میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے تھے۔ (سرگوشی: ان کا انتقال ملیر یا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ ۱۹۱۳ء کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جاں آفریں کو سپرد کی۔ نشان مرو مؤسن باتو گویم۔ چومرگ آید تبسم بر لب ادست۔ ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی: شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ناولوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی: انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا۔ چوہے دان) بسن میں سے صرف ایک چھپا باقی کم عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آئے تو چوہوں نے کھا لیے، تو ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ان کے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول چوہے دان پر ڈالنی کافی ہے۔ (پرچی: ”چوہے دان نہیں چمنستان“)

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا ہم جانے کیوں چوہے دان پڑھ گئے تھے۔ بہر

حال اب ہم نے پانی پی کر ان کے حالات زندگی کی طرف گریز کیا۔

”گھڑیالہ جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوئی کہلائے ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ (پھر پرچی آئی: گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں، غنجب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔) یہ بات ایک مشہور نقاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں۔ اصل میں غنجب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ یہ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے۔ جوائنٹ سنٹ چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اردو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑا کوئی کے بارے میں بھی ڈاکٹر غمزہ ردوای نے لکھ دیا تھا کہ وہ چوہے پکڑا کرتے تھے۔ حالانکہ چوہڑا کا نہ ایک قصبہ ہے جہاں کا اچار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں جو مفت مراعات النظر میں ہیں۔ زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبر آبادی بھی خوب شاعر تھے (پرچی: یہ یوم غنجب صاحب کا ہے نظیر اکبر آبادی کا نہیں) لیکن افسوس یہ یوم نظیر اکبر آبادی کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم، بخارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے، بلکہ بیڈھب انبالوی کا ہے (سرگوشی۔ صحیح نام غنجب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غنجب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدائی پود کے ادیبوں کو ان کی شاعری یا ناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی تقلید کی توفیق دے تاکہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کریں جس طرح غنجب صاحب کرتے تھے۔ اقبال صاحب بھی کہہ گئے ہیں۔

کھول آنکھ فلک دیکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ

(سکریری صاحب نے پرچی دی۔ ”غنجب صاحب تو نابینا تھے“) لیکن یہ بعد از

وقت آئی تھی اس لیے اسے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر

تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔



آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان میں متعین کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنے علم دوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لیے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ وان مسٹریگ روٹروم سے ملا دیا اور وہ صدارت پر راضی بھی ہو گئے۔ ہم نے کہا۔ آپ کو کچھ اقبال کے متعلق بتاویں! بولے ”واہ اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا۔ اس نے فلسفہ خودی ایجاد کیا تھا۔ بس یہ بتا دیجیے کہ رہنے والے کہاں کے تھے۔“ ہم نے کہا ”سیالکوٹ کے جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے۔“ فرمایا ”مر گئے یا ابھی مرنا ہے“ ہم نے کہا ”آپ کی اور ہماری خوش قسمتی سے مر گئے ہیں۔“

بولے ”کیوں مر گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملت کو ابتلا میں چھوڑ کر کیوں مرے۔“

فرمایا۔ ”میرا مطلب ہے کیسے مرے۔“

”بس حکیموں ڈاکٹروں کی دوائیں کھا کر مرے لیکن آپ کو اس سے کیا مطلب؟“

آپ ان کی شاعری اور شخصیت پر بولے۔“

”اچھا۔ نام ذرا پھر سے بتا دیجیے۔ اکیو بلال تھا شاید۔“

ہم نے کہا ”اکیو بلال نہیں بابا۔ اقبال۔ ٹھیک سے یاد کر لو۔“



سٹریٹ روٹروم نے اپنی پرمغز تقریر کا آغاز ہی سیالکوٹ سے کیا۔ اس کی وجہ

شہرت بیان کی اور فرمایا۔ اقبال بھی کھیل ہی کھیل میں بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آج کل تو فلسفہ خودی کی بہتات ہے بلکہ اسے دس اور بھیج کر زرمبادلہ بھی کمایا جاسکتا ہے لیکن ایجاد یہ اس شاعر نامی گرامی کی تھی۔ یہ قاری اور اردو میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ اے کاش ڈچ زبان کی شیرینی پر ان کی نظر گئی ہوتی وہ اس میں لکھتے اور ہم ان کا مطالعہ کر سکتے۔ اب ہم سب کو پتا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں اور ان کا اجالا زمانے میں پھیلائیں جس طرح فلیپس کمپنی کے بلب پھیلاتے ہیں جس کی پاکستان میں فائینڈگی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔ یہ کمپنی صرف بلب ہی نہیں ریڈیو ٹرانزسٹر۔ ٹیلیوژن۔ ٹیوب لائٹ ہر طرح کا مال عمدہ بناتی ہے اور بکفایت فراہم کرتی ہے (ہم نے ایک اور ٹھوکا دیا کہ موضوع پر آئیں) اور ہاں ایکو بلال (ہم نے انہیں ایک اور ٹھوکا دیا) یعنی اقبال صاحب بہت بڑے اور مایہ ناز شاعر تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیوں مر گئے اور قوم کی نیا بھنور میں چھوڑ گئے (تالیاں) سنا ہے۔ ڈاکٹر دوں اور حکیموں کی دوائیں کھا کھا کر سر گئے۔ ابھی طبی سائنس کو اور ترقی کرنی ہے۔ فلیپس کمپنی نے اس پر بھی ریسرچ کا شعبہ کھولا ہے۔ ہماری تحقیقات کا میاب ہو گئیں تو آئندہ اچھے اچھے شاعر سر انہیں کریں گے بلکہ صدیوں ایڑیاں رگڑا کریں گے۔ ان کی جان نہیں نکلا کرے گی (تالیاں) میں شکریہ ادا کرتا ہوں (ہمارا نام بھول کر) اپنے ان محترم دوست کا جنہوں نے مجھے پچھدان کو اس عزت سے نوازا اور کرسی صدارت پر بٹھایا۔ بے شک اقبال سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں اور بھی تقریر کرتا لیکن افسوس ہال میں روشنی بہت کم ہے۔ اگر آپ لوگ فلیپس کی ٹیوب لائٹیں استعمال کرتے..... ان کی تقریر کا آخری حصہ تالیوں کے شور میں ڈوب گیا ٹھیک سے سنانہ جاسکا۔



پاکستان ناول مینوفیکچرنگ کمپنی!

پاکستان ناول مینوفیکچر کمپنی لمیٹڈ ہونہار مصنفین اور پبلک تاز ناشرین کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کا مسرت سے اعلان کرتی ہے۔ کارخانہ ہذا میں ناول جدید ترین آٹومیٹک مشینوں پر تیار کئے جاتے ہیں اور تیاری کے دوران انہیں ہاتھ سے نہیں جھوا جاتا۔ ناول اسلامی ہونا یا جاسوسی۔ تاریخی یا رومانی۔ مال عمدہ اور نالکس لگایا جاتا ہے اس لیے یہ ناول مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ بھی یہ کئی کام آتے ہیں۔ بچہ رورہا ہو۔ ضد کر رہا ہو۔ دوسروں میں براہ راست پر آ جائے گا۔ بلی نے دودھ میں یا کتے نے نعمت خانہ میں منہ ڈال دیا ہو۔ دُور ہی سے تاک کے ماریے۔ پھر ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کی چوکی اور گھرے کی گھڑونچی کی طور پر استعمال ہونے کے علاوہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے مقابلے میں ڈھال کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے مطالعے سے دل میں شجاعت کے جذبات خواہ مخواہ موجزن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی ضخامت اور نتھنے کی نوکیلی جلد کے باعث۔ خواتین کے لیے ہمارے ہاں واش اینڈ ویئر (WASH AND WEAR) ناول بھی موجود ہیں تاکہ ہیر ورن کا نام بدل کر پلاٹ کو بار بار استعمال کیا جاسکے۔ ایک ہی پلاٹ برسوں چلتا ہے۔ پندرہ بیس ناولوں کے لیے کافی رہتا ہے۔

داش اینڈ دیز کو الٹی ہمارے اسلامی تاریخی نادلوں میں بھی دستیاب ہے۔ آرڈر کے ساتھ اس امر سے مطلع کرنا ضروری ہے کہ کوئی قسم مطلوب ہے۔ %65 رومان اور %36 تاریخ والی یا %65 تاریخ اور %35 رومان دلی اجزائے ترکیبی عام طور پر حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ ہیر دُن۔ کافر دِ شیرہ۔ تیر تَنگ۔ بنوٹ پٹے اور بھیس بدلنے کی ماہر۔ دل ایمان کی روشنی سے منور۔ چھپ چھپ کر نماز پڑھنے والی۔

۲۔ کافر بادشاہ۔ ہماری ہیر دُن کا باپ لیکن مہایت شقی القلب۔ انجام اس کا بُرا ہوگا۔

۳۔ لشکرِ کفار جس کے سارے جرنیل نجیم شمیم اور بُز دل۔

۴۔ اہل اسلام کا لشکر۔ جس کا ہر سپاہی سوالا کھ پر بھارمی۔ نیکی اور خدا پرستی کا پتلا۔

پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ قبولِ صورت بلکہ چند سے آفتاب چند سے ماہتاب۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے ددڑانے والا۔

۵۔ ہیرو۔ لشکرِ متذکرہ بالا کا سردار۔ اُس حُسن کی کیا تعریف کریں، کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔

۶۔ سبز پوش خواجہ خضر۔ جہاں پلاٹ رُک جائے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ وہاں مشکل کشائی کرنے والا۔

۷۔ ہیر کا جاں نثار ساتھی۔ نوجوان اور کنوارا تاکہ اسکی شادی بعد ازاں ہیر دُن کی دفا دار اور محرم راز خادمہ یا سہیلی سے ہو سکے۔

۸۔ کافر بادشاہ کا ایک چشمِ حفتی دزیر جو شہزادی سے اپنے بیٹے کی بلکہ ممکن ہو تو اپنی شادی رچانے پر اُوہار کھائے بیٹھا ہے۔ چونکہ اُدھار محبت کی قینچی ہوتا ہے لہذا

ہیروئن کے التفات سے محروم رہتا ہے۔



پلاٹ تو ہمارے ہاں کئی طرح کے ہیں لیکن ایک اسٹنڈ رڈ ماڈل جو عام طور پر مقبول ہے یہ ہے کہ ایک قبیلے کا نوجوان دوسرے قبیلے کی ددشیزہ پر فدا ہوتا ہے اور فدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ ددشیزہ لامحالہ طور پر دوسرے قبیلے کے سردار کی چیمپی بیٹی ہوتی ہے۔ پانچ انگلیاں پانچوں چراغ۔ خوبصورت۔ سلیقہ مند۔ عالم بے بدل۔ لاکھوں اشعار زبانی یاد۔ ابھی اُس تک اس محبت کی خبر نہیں پہنچی ہوتی کہ دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ ہمارا ہیرو محبت کو فریض پر قربان کر کے شمشیر اٹھا لیتا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا کشتوں کے پٹے لگاتا دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے۔ محافظوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر طالب مطلوب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشعار اور مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہیروئن بھی پہلے ایک جان سے پھر ہزار جان سے اُس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راستے میں ظالم سامع کئی بار آتا ہے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے۔ دانت پیتارہ جاتا ہے۔ آخر میں ناول حق کی فتح، محبت کی جیت، نعرہ تکبیر، شرعی نکاح۔ دونوں قبیلوں کے ملاپ اور مصنف کی طرف سے دعائے خیر کے ساتھ آئندہ ناول کی خوشخبری پر ختم ہوتا ہے۔

آرڈر دینے وقت مصنف یا ناشر کو بتانا ہوگا کہ ناول پانچ سو صفحے کا چاہیے، ہزار صفحے کا یا پندرہ سو کا۔ وزن کا حساب بھی ہے۔ دو سیرمی نادل۔ پانچ سیرمی نادل۔ سات سیرمی نادل۔ پندرہ بیس سیرمی بھی خامس آرڈر پر مل سکتے ہیں۔ گاہک کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ اسی پلاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کس ملک کا رکھا جائے۔ عراق کا۔ عرب کا۔ ایران کا افغانستان کا؟ ہیرو اور ہیروئن کے نام بھی گاہک کی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ ایک پلاٹ پر تین یا اس سے زیادہ ناول لینے پر 33% رعایت۔

☆☆☆

خواتین کے لیے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، گھریلو اور غیر گھریلو ہر طرح کے ناول بکفایت ہمارے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ ان میں بھی محبت اور خانہ داری کا تناسب بالعموم 66% اور 36% کا ہوتا ہے۔ فرمائش پر گھٹایا یا بڑھایا بھی جاسکتا ہے، خانہ داری سے مطلب ہے ناول کے کرداروں کے کپڑوں کا ذکر۔ خاندانی حویلی کا نقشہ۔ بیاوشادی کی رسموں کا احوال۔ زیورات کی تفصیلات وغیرہ۔ ہیرو اور ہیروئن کے چچا زاد بھائی بہنیں۔ سہیلیاں اور رقیب وغیرہ بھی مطلوبہ تعداد میں ناول میں ڈالے جاتے ہیں۔ ہمارے کارخانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواتین کے ناول مرد تہہ پاکستانی فلموں کو دیکھ کر لکھے جاتے ہیں تاکہ بعد ازاں فلم ساز حضرات ان پر اور فلمیں بنا سکیں۔ معمولی سی مزیداجرت پر ان ناولوں میں گانے اور دو گانے وغیرہ بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔ اس سے مصنف اور فلم ساز کا کام اور آسان ہو جاتا ہے۔ گاہک کو فقط ہیروئن کا نام تجویز کرو دینا چاہیے اور وہ ریڈیو پاکستان کے فرمائشی پروگرام کو سن کر کیا جاسکتا ہے۔ باقی سارا کام ہمارے ذمے۔ مال کی گھر پر ڈیوری کا بھی انتظام ہے۔

☆☆☆

بازار کے ناول بالعموم ایسے گنجان لکھے اور چھپے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ صفحے میں کم سے کم لفظ رہیں۔ مکالمے اور مکالمہ بولنے والے۔ دونوں کے لیے الگ الگ سطر استعمال کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

شہزادی سبز پری نے کہا:-
”بیارے گاغام“

☆☆☆

ایک چھوٹی سی سیر درویش کی!

چکر لگانا پنڈی اور اسلام آباد کے مدار میں

عین اس وقت کہ امریکی خلا باز چاند کے سفر کے لیے کمر کس رہے تھے، ہم اسلام آباد کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ ہم درویشوں کا رخت سفر ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک لپچی کپڑوں کی، چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط، وہ بھی بیرنگ، دل راحت طلب چلا تو شاد ماں ہو کر تھا۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسمان ہو کر بلکہ آسمان تو مفت میں بدنام ہے۔ ہمارے خلا باز وہاں ہو آئے ہیں اور درجہ بدرجہ ہر طرح کی خیریت بتاتے ہیں۔ پنڈی جا کر یہ احساس ہوا کہ راکٹ اور قمری گاڑی میں بیٹھ کر آتے تو اچھا تھا۔ یہ نہیں تو کم از کم خلا بازوں والا سوٹ زیب تن کرنا چاہیے تھا تا کہ اس بلدہ خوش نہاد اسلام آباد کی تمازت اور تابکاری کے اثرات سے محفوظ رہتے۔ سچ مچ قیامت کا سالم تھا۔ گرمی ایسی کہ چیل انڈا چھوڑتی تھی کیونکہ اُبلتا ہوا انڈا اُس کے کس کام کا؟

اسلام آباد میں اب کے آب و ہوا کا حال پتلا ہی تھا۔ ہمارا قافلہ سخت جان جس مراے میں اُترا وہ الف لیلیٰ کی بی بی شہر زاد کے نام سے موسوم ہے۔ دل کو کئی کہانیاں یاد آ کر رہ گئیں اس مراے میں ہوا کا انتظام تو خیر معقول تھا۔ پورا ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ

ہے لیکن آب کے معاملے میں یہ بھی شرمندگی سے آب آب ہوا جا رہا تھا۔ علی الصبح میاں جمیل الدین عالی منہ دھونے کو اٹھے تو پانی حائب۔ بولے پانی؟ ہم نے کہا میاں منہ دھو رکھو کیسا پانی۔ کون سا پانی۔ اپنے کوڈرائی کلین کراؤ۔ ہم محض اتفاق سے ذرا سویرے اٹھ گئے تھے۔ اس وقت پانی آ رہا تھا۔ معلوم ہوا اس کے اوقات ساڑھے چھ سے آٹھ بجے تک ہیں۔ پھر دو پہر اور شام کو تھوڑی دیر تک کھلتا ہے۔ ہاں بیرے اتنا کرتے تھے کہ پُر زور فرمائش پر پانی کی بالٹی لا دیتے تھے۔ شروع میں تو تکلیف ہوئی دو دن کے بعد سب ہی اپنی اوقات چھوڑ کر پانی کے اوقات کا خیال کرنے لگے جو حال اندرون ہوٹل پانی کا تھا۔ وہی بیرون ہوٹل ہوا کا تھا۔ محکمہ سوسیات والے بس شام کو تھوڑی دیر کو ذرا سی ہوا چھوڑتے تھے تاکہ لوگ آکسیجن کے بغیر مرنے جائیں۔ ہم اسیران کبند ہوا۔ دل تنگ ہو کر کریم کا ورد کرتے رو جاتے تھے کیونکہ فارسی سمجھنے والا وہاں کون تھا۔ سوائے قدوة السالکین پیر حسام الدین راشدی کے اور فخر صومنائے دوران غلام مصطفیٰ تبسم کے۔



تو صاحبو وہاں پیر بھی تھے۔ صوفی بھی تھے۔ رند بھی تھے۔ جو اپنے نام کا اعلان شاید پسند نہ کریں گے۔ علامہ بھی تھے۔ فہامہ بھی تھے۔ فیض ایسے شاعر بھی تھے اور ہم ایسے شاعر بھی تھے۔ آساں تاں کرنے والے بھی تھے۔ بوشو بوشو کرنے والے بھی۔ مینڈے سائیں بھی اور تڑے موٹے بھی۔ یہ سارا مجمع ایک علمی مجلس کے لیے تھا۔ کچھ لوگوں کا علم ان کے اندر تھا کچھ کا ان کی ذات کے باہر یعنی چلتے تھے تو کتابوں کا انبار بغل میں ہوتا تھا۔ دھرتی پر قدم رکھتے تھے تو وہ علم کے بوجھ سے کانپ اٹھتی تھی۔ ان صاحبان علم میں سے ایک کو ہمارے عالی صاحب کو تو پیر صاحب نے منع کر دیا کہ خبردار کتابیں اٹھا کے چلے تو..... ہاں ہمارے میجر آفتاب حسن صاحب کو ٹوکنے کی

کسی میں جرات نہ تھی۔ ہماری حیثیت اس سارے جہوم میں مشمت خاک کی تھی کہ بس آندھی کے ساتھ تھے۔ بحث یہ تھا کہ مادام انگلش کو جلد از جلد اس کے میکے واپس بھیجا جائے۔ اور میاں قوم الدین اردو خانم اور بنگلہ نیگم کو مبالغہ نکاح میں لائیں۔ بحث ہوئی اور ایسی گرما گرم کہ ایئر کنڈیشنر بے کار ہو گئے۔ پھر سفارشیں سرتب ہوئیں۔ لوگ جو ذہنوں میں طرح طرح کے شبہات لے کر گئے تھے قائل ہو کر واپس آئے کہ ہاں یہ حکومت قوی زبانوں کو ان کا حق دلانا چاہتی ہے۔ اس کی کمیٹیوں اور کمیشنوں کو مزید کھٹائی میں ڈالنا نہیں چاہتی۔



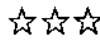
لاہور آئے تو معلوم ہوا کہ اسلام آباد تو اس کے مقابلے میں واقعی پُر فضا مقام تھا یہاں۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رگ گل سے میر

بلبل پکاری دیکھ کے صامب پرے پرے

لاہور میں لوگ روٹیوں کی طرح تور میں لگے تھے اور بھٹے میں پکتی اینٹوں کی طرح سلگتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے ہمارا یہ رشتہ ہے کہ لاہور کی کوئی شکایت کرتی ہو تو ہم ان سے کرتے ہیں۔ کراچی کے شکوے شکایت کے لیے وہ ہمیں مخاطب بناتے ہیں۔ ہم گرمی کھا کر محضر لے کر ان کی تلاش میں نکلے تو دو گھنٹے ان کے دفتر کی کھوج میں صرف ہو گئے۔ ڈھونڈتے پھرے۔ یہ دفتر انارکلی کے ایک چوہارے میں ہے اور اس کے لیے نیچے بازار سے سیڑھیاں بھی جاتی ہیں لیکن قاسمی صاحب نے اس خوبی سے انہیں کیونٹالاج کر رکھا ہے کہ صرف خالص خالص آدی اس کا پتہ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خضر راہ نے کہا۔ یہ رہا رامتہ ہم نے کہا۔ یہ تو موزے بنیان کی دوکان ہے۔ بولے بس بس انہی موزے بنیان کے ڈبوں کے درمیان سے پھوٹ پھوٹ کر قدم رکھتے

چلے جاؤ۔ آگے ایک پلمبر کی دوکان ملے گی۔ یہی مونے پتلے ہر طرح کے پائپوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ کچھ لینے ہیں۔ کچھ کھڑے ہیں۔ کچھ الجھے ہیں۔ کچھ سلجھے ہیں۔ کچھ دیوار سے چمٹے ہیں۔ کچھ چھت سے لٹک رہے ہیں۔ بسن میں چڑیوں اور چنگا دڑوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ ان سے بچتے بچاتے شکستہ درختہ میٹرھیاں اندھیرے میں پار کر کے کہ یہاں انسان کی بصیرت یا چراغ رخ زیبائے علاوہ روشنی کا اور کوئی سلسلہ نہیں۔ اوپر پہنچ جاؤ۔ وہاں سات دروازے ملیں گے۔ ان میں سے ایک کسی گودام میں کھلتا ہے۔ ایک کسی غسل خانے میں۔ ایک اوپر کی میٹرھیوں کا دروازہ ہے۔ ایک کسی اور کوکلی کا ہے۔ فقط ایک ہے جو قاسمی صاحب کے دفتر کی کارڈور کی ڈیوڑھی کو جاتا ہے۔ یعنی ایک نئے ہفتواں کی کلید ہے۔ لوگوں کی ذہنی آزمائش اور صبر کے سالانہ امتحان کے لیے کسی دروازے پر کوئی بورڈ نہیں لگایا گیا۔ جب ایک سے ہیں۔ ہم بعد خرابی بصرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ قاسمی صاحب نہیں ہیں۔ آج آئے ہی نہیں۔ بیہات۔



قاسمی صاحب کو کام بہت رہتا ہے۔ تصنیف و تالیف کا، پرچے کی ایڈیٹری کا، کالم کا اور نہ جانے کیا کیا یہ سارے کیو غلاج کے اہتمامات۔ انہوں نے ہم ایسے ہرزہ گرد ادیبوں اور شاعروں کو خود سے دور رکھنے کے لیے کیے ہیں جو انارکلی میں صابن تیل خریدتے ہوئے اوپر چڑھ آتے ہیں اور غزل عرض کرنے لگتے ہیں۔ بے شک ان کے دفتر میں آنا مشکل ہے لیکن آکر جانا اور مشکل ہے۔ آنے والا یہ موج کر کہ اب کون ان پائپوں اور موزے بنیان کے ڈبوں کے بحر ظلمات میں سے گھوڑے دوڑاتا ہوا واپس جائے۔ دفتر بند ہونے تک وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ پورا دیوان گوش گزار کے اٹھتا ہے۔ اس سے پہلے قاسمی صاحب نے انارکلی ہی میں ایک اور دفتر لیا تھا جس کا زینہ زمین سے ۹۰ درجے کا زاویہ بنانا ہوا اور پر جاتا تھا۔ نوے درجے تو خیر مبالغہ ہے ۸۹ یا ۸۸

ضرور ہوگا اس پر چڑھنا کسی کوہ پیاہی کے بس کی بات تھی۔ لیکن اتفاق سے ایک بالکنی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ لوگ کندھا لٹے تھے اور چشم زدن میں اوپر... ”قاسمی صاحب۔ ایک غزل کہی ہے۔ نیا مضمون باندھا ہے۔ عرض کرتا ہوں.....“



یہ ماننا پڑے گا کہ جو دلچسپی اور محبت مظاہر قدرت سے لاہور والوں کو ہے کراچی والوں کو نہیں کیونکہ آخر صنعتی شہر ہے۔ لوگ اونچی اونچی بلڈنگیں بنا کر ان میں بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھتے رہتے ہیں۔ بھینسوں کو کراچی میں شہر بدر کر دیا گیا۔ حالانکہ خوبصورت جانور ہے۔ قد کاٹھ میں عقل سے بڑا اور ذوق میں موسیقی نواز۔ مین بجاتے جاپے۔ داد دیتا جائے گا۔ اہل لاہور نے اس کے مقابلے میں گائیوں کو جس طرح سینے لگا رکھا ہے اس کے لیے نسبت روڈ کا ایک چکر کرنا کافی ہے۔ پوری سڑک گیسو شالابی ہے۔ جہاں جہاں ان کے حوائج ضرور یہ وغیر ضرور یہ کے ڈھیر لگے ہیں۔ تالاب بنے ہیں۔ راہ گیر دس قدم بھی پوتر ہوئے بغیر نہیں چل سکتا۔ بے اختیار ہمیں اپنا ہی قول یاد آیا کہ لاہور پاکستان کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ گڑھے ہیں، کھڈ ہیں، خار ہیں۔ جا بجا خوانچوں والے بیٹھے مکھیاں بیچ رہے ہیں۔ کم از کم ہم یہی سمجھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی حفظان صحت کی ایک ترکیب ہے۔ مکھیاں پہر جمائے بیٹھی ہوں تو اصل چیز یعنی خوردنی مال پر جو خوانچے کی تہ میں ہوتا ہے گرد نہیں پڑتی۔ محفوظ رہتا ہے۔

(واللہ اعلم)



جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا کچھ نسخے دراز لی عمر اور خوبیء صحت کے

ہمارے مخدوم ملّا واحدی اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔ اس صدی کے شروع کی باتیں ہمیں سناتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن خان بہادر تقی محمد خاں خورجوی ان سے آگے نکل گئے۔ رسالہ عصمت میں ان کا تازہ ترین مضمون پان خوری پر شائع ہوا ہے۔ جس میں کچھ واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ باتیں آج سے نوے برس پہلے کی ہیں اور سیری چشم دید ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ پان کھانا تو چھوڑ دیا ہے لیکن سگریٹ پی لیتا ہوں کہ نوے سال سے پیتا آیا ہوں۔ اب اس بات کی کسر رہ گئی ہے کہ اس قسم کے مضامین سامنے آئیں۔

جب میں ۱۸۵۷ء میں اپنی پنشن وصول کرنے دلی گیا۔

جب میں نے سیر تقی سیر کے کان میں اذان دی۔

جب طوفان نوح کا پانی ہمارے صحن میں داخل ہوا وغیرہ۔



جن بزرگوں کی خدمت میں ہمیں نیاز حاصل رہا ہے ان میں بابائے اردو مولوی عبد

الحق نے سب سے لمبی عمر پائی۔ کوئی ترانوے سال۔ بایں پیرانہ سالی ان کا ذہن بیدار فعال اور صحت مند تھا۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں ہم ان کی لائبریری میں ان کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب نے آکر سلام علیکم کی۔ مولوی صاحب نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا۔ پھر اٹھ کر گرجوٹی سے بغلیں ہوئے۔ ان صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب آپ نے مجھے پہچانا بھی؟ بولے کیوں نہیں۔ تم فلاح شخص ہونا؟ ان صاحب کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ علی گڑھ میں ۱۸۹۴ء میں ان کے ہم جماعت رہے تھے اور ملاقات پورے ۶۶ برس کے بعد ہو رہی تھی۔ خان جہاد صاحب کو بھی ہم ذہنی طور پر اسی طرح چاق و چوبند پاتے ہیں اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس چکی کا پا کھاتے ہیں۔



خوبی صحت اور دراز عمر کا راز جس سے پوچھو، الگ ہی بتاتا ہے۔ کوئی صبح دم بینک لگانے کی تلقین کرتا ہے۔ کوئی خالص گھی کو آب حیات بتاتا ہے۔ کسی کا کہنا ہے۔ ڈٹ کے کھاؤ۔ جب ایک داڑھ چلے ستر بلاٹلے، کوئی کچھے بھوکے پیٹ رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ٹیلی وژن ریڈیو اور اخبارات کے اشتہارات کو دیکھتے تو ان کے دعوے بھی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔

ہمارا تو تھ پیسٹ استعمال کرنے والا عمر بھر زندہ رہتا ہے۔

ہمارا بنا پستی گھی کھائیے اور قیامت کے بورے سمیٹے۔

ہمارا صابن استعمال کرنے والا کبھی نہیں مرتا۔

چورن لکڑ ہضم استعمال کیجیے۔ حضرت نوح ہمیشہ یہی استعمال کیا کرتے تھے۔

وغیرہ۔

پچھلے دنوں ہمارے عزیز دوست ریڈیو پاکستان کے گور و گھنٹال دادا کلیل احمد ٹیلی ویژن پر آئے تو اپنی پہلوان نما صحت کا راز یہ بتا گئے کہ میں صبح صبح سر کے بل کھڑا ہوتا

ہوں اور چنے چباتا ہوں۔ آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا۔ اپنی صحت کے ثبوت میں انہوں نے ٹیلی ویژن کے ناظرین کو گلدھر بھی ہلانے کے بلکہ گھما کے دکھائے۔



لیکن ہمارے دوسرے دوست مگنی صاحب تو ملک کے مایہ ناز کارٹونسٹ ہیں بلکہ ان کی بنائی ہوئی EFU کی کارٹون فلم اب کے بہترین بھی ٹھہرائی گئی ہے۔ وادائیکیل سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ سر کے بل کھڑے ہونا ٹھیک نہیں۔ پنڈت نہرو۔ یہی کیا کرتے تھے۔ ان کو دنیا کا ہر مسئلہ الناظر آتا تھا سہتی کہ وفات پا گئے۔ جنوں کے بارے میں بھی انہوں نے کہا کہ ہاں ان میں طاقت ہے اور ان سے صحت قائم رہتی ہے لیکن گھوڑوں کی اُخان کو یہ قبض کرتے ہیں۔ وہ گلدھر ہلانے کے حق میں بھی نہیں کہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پاؤں پر چوٹ آنے کا خطرہ ہے۔ نہ ہمارے پیدل پاؤں چلنے کو وہ کچھ مفید جانتے ہیں۔ انہوں نے کوئی دس برس سے گھر سے باہر گلی میں قدم نہیں رکھا۔ ہم نے کہا۔ آپ کی صحت کا راز؟ بولے چلی کباب۔ ہم نے کہا اور.....؟ بولے اور بھی۔ چلی کباب۔



خان بہادر نقی محمد خاں اب سو کے پیٹے میں تو ہوں گے۔ انہوں نے ساری عمر سگریٹ پیا۔ حقے کا شوق تو مولوی عبدالحق بھی رکھتے تھے۔ برنارڈ شاالبتہ نہ سگریٹ چیتے تھے نہ شراب لیکن سچ پوچھئے تو کلیہ کوئی بھی نہیں۔ ایک صاحب کا قصہ مشہور ہے کہ سو سال کی عمر کو پہنچ رہے تھے اور چونچال تھے۔ ایک رپورٹران کا انٹرویو لینے ان کے گھر گیا اور پوچھا کہ آپ کی درازی عمر کا راز۔ انہوں نے کہا۔ سب سے بڑا راز تو یہ ہے کہ میں نے شراب کبھی نہیں پی۔ یک لخت پچھلے کمرے سے کچھ شور کی اور چیزوں کے گرنے کی آواز آئی۔ رپورٹر نے کہا یہ کیا ہے؟ ان صاحب نے کہا۔ کچھ نہیں۔ ہمارے

ابا جان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آج کچھ زیادہ پی آئے ہیں۔ ایسے ہی ایک اور بڑے میاں تھے جو یہ فخر کیا کرتے تھے کہ میں نے کبھی نہ شراب کو چھوا نہ سگریٹ کو نہ عورت کو جب تک کہ میری عمر گیارہ سال کی نہیں ہوگئی۔



بابائے اردو ہاپوڑ کے رہنے والے تھے جہاں کے پاپڑ مشہور ہیں۔ خاں بہادر نقی محمد خاں کے وطن خورجہ کا اچار مشہور ہے۔ یہ تو ہوئے لمبی عمروں والے۔ صحت کے باب میں دادا ثکلیل احمد صاحب کے چنے اور تجمی صاحب کا چلی کباب یاد رکھنے کی چیزیں ہیں۔ قارئین کرام کی آسانی کے لیے ہم نے ان سب چیزوں کا انتظام یک جا کر دیا ہے۔ عمر دراز ریسٹوران میں تشریف لائیے اور پاپڑوں کے ساتھ قسما قسم کا اچار نوش فرمائیے چنوں کا بھی انتظام ہے۔ آپ کے لیے بھی آپ کے گھوڑے کے لیے بھی... چلی کباب بھی نہایت عمدہ اور خالص تھی کے ملیں گے۔ ان کے ساتھ قبوہ اور سوار کی چنگی مفت۔ جو صاحب گدر ہلانا چاہیں اپنے گدر ہمراہ لائیں۔ ہمارے ریسٹوران میں آپ سر کے بل بھی کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ چل بھی سکتے ہیں کیونکہ ہمارا یہ ریسٹوران کوچہ رقیب میں واقع ہے۔ اس حالم میں آپ اپنے محبوب کی موٹر یا رکشا کے نیچے بھی آجائیں تو مضائقے کی بات نہیں۔ عمر دراز ریسٹوران معقول معاوضے پر آپ کی تجمیز و تکفین کا بھی ذمہ لیتا ہے۔



دیش مکھ جی کیسے دیش کو مکھ دکھائیں گے!

جن سنگھ کا ہر جگہ یہی حال ہوگا

بھارت کے صدارتی الیکشن میں گری صاحب جیتے اور ریڈی صاحب ہارے۔
ریڈی صاحب تیار تو بہت تھے بلکہ مستعدی میں انہیں ایور ریڈی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن
گر گئے اور گری صاحب مین کے نام میں افتادگی شامل تھی۔ آج کبوتر بام صدارت
بنے اونچی اڑائیں کر رہے ہیں۔ شاعر نے کچ کہا ہے۔

خاکسارانِ جہاں راکھارت مگر
گاہ باشد کہ دریں گردوارے باشد

☆☆☆

اب رہے دیش مکھ صاحب۔ ان کا ہمیں افسوس ہے۔ اب یہ کیسے دیش کو اپنا مکھ
دکھائیں گے۔ کس منہ سے لوگوں کے سامنے جائیں گے۔ یہ حضرت جن سنگھ اور سونتر
پارٹی یعنی ایک طرف ہندو جاتی کے اور دوسری طرف سیٹھ ساہوکاروں کے نمائندے
تھے۔ دونوں کی گنتی ہوئی تو جہاں ہزاروں ووٹ گری صاحب اور ریڈی صاحب کو
ملے۔ سو سو پچاس پچاس ان کے حصے میں بھی آئے۔ بعض صوبوں نے البتہ و خدادی۔

ان کے معاملے میں بے مروتی کی حد کردی!

ناگالینڈ صفر

مغربی بنگال صفر

کیرالا صفر

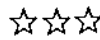
تینوں صفروں کو حساب کے قاعدے سے جمع کیجئے تو صفر اپنے قاعدے سے دیکھے تو تین انڈے ہیں۔ مگر قبول افتدز ہے عزد شرف۔ انڈا آج کل مہنگا ہو رہا ہے۔ پانچ آنے کا ہے۔ تین پندرہ آنے کے ہو گئے۔ بشرطیکہ گندے نہ نکلیں۔ ہم نے پیسوں میں حساب اس لئے کیا کہ یہ وزیر خزانہ رہے ہیں اور چونکہ بیوی کی آنکھ کا تارا میں اس لئے ہمیں وہ قصہ یاد آ گیا تھا کہ کسی نے ایک پیسے سے پوچھا۔ ”تم سو رگ (جنت) میں جانا پسند کرو گے یا نرک (جہنم) میں۔ اس نے ترنت جواب دیا۔ ”بابا جہاں دو پیسے کا منا پھہ ہوگا وہاں جائیں گے۔“



خبریں صرف تین امیدواروں کی آئی ہیں۔ باقی کہاں گئے؟ جس روز پہلے پہل امیدواروں کے ناموں کا اعلان ہوا فہرست اتنی لمبی تھی کہ ہم سمجھے میٹرک کا نتیجہ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد لگتا ہے کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ ان میں سے کچھ اپنے میاں بشیر قسم کے تھے۔ کچھ کمال صاحب جیسے باکمال۔ جنہوں نے اب کے بھی اعلان کیا تھا کہ اگر پاکستانی قوم ان کو ملک کا صدر بنانا چاہے تو انہیں اعتراض نہ ہوگا بلکہ وہ اس کے لئے گلے گلے تیار ہیں حالانکہ اس میں ان کے قیمتی وقت کا بہت حرج ہوگا۔ کچھ بھی ہو یہ میاں بشیر سے زیادہ ظرف کے آدمی نکلے۔ انہوں نے تو ناراض اور بے مزہ ہو کر ملک ہی چھوڑ دیا۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ جو ملک انہیں اپنی کرسی صدارت تک پیش کرنے کو تیار نہ ہو اس میں رہنے کا فائدہ؟



ویش کھ صاحب کو تین صوبوں میں جو صفر صفر ملا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اپنا ووٹ ان صوبوں میں نہ تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے ایک الیکشن میں یہ بھی ہو چکا ہے کہ ایک صاحب اپنے حلقے سے امیدوار تھے اور ہم نے ان کی مقبولیت اور دوڑ دھوپ کو دیکھتے ہوئے وثوق سے پیش گوئی کی تھی کہ ان کو ایک ووٹ ضرور ملے گا کیونکہ اس حلقے میں ان کا اپنا ووٹ بھی تھا۔ لیکن بیلٹ بکس کھولے گئے تو ان کا بکس کنجوس کے دل کی طرح یکسر خالی۔ خیر ہم بہت شرمندہ ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پولنگ افسر نے دیکھے بغیر کہ یہ امیدوار ہیں ان سے کہہ دیا تھا کہ صاحب ووٹ اس امیدوار کو دیجئے گا جو آپ کی نظر میں نہایت ایماندار اور مخلص اور ممبری کا واقعی اہل ہو۔ اس کی باتوں میں آگئے اور اپنے ایک حریف کو ووٹ دے آئے۔



صفر ووٹ والا نتیجہ کسی امیدوار کے ووٹروں و وستوں، رفیقوں اور جانثاروں کے لئے بالخصوص شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ ایک دو ووٹ بھی ہوں تو..... ان بھلے مانسوں کی عزت رہ جاتی ہے۔ ایک بار راسٹر گلڈ کی مرکزی کمیٹی کے الیکشن میں ایک مشہور اویب کے دو ووٹ آئے۔ ایک ووٹ تو خیر ان کا اپنا تھا لیکن دوسرے کے کوئی چھتیس و عویدار تھے۔ ہر کوئی پولنگ بوتھ سے نکل کر ان کے پاس آتا تھا کہ ”حضرت میں اپنے فرض سے اوا ہوا۔ اپنا نا چیز ووٹ آپ کو دے آیا۔ نہیں نہیں شکر ہے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔“ فردا فردا یہ چھتیس حضرات نتیجہ نکلنے کے بعد بھی اپنے اس قول پر قائم رہے بلکہ دوسرے پینتیس و عویداروں کو پرلے درجے کا جھوٹا اور لپٹا بیٹا رہے۔ امیدوار صاحب کا اپنا بیان تھا کہ بھی مجھے تو کوئی عہدے کی ہوس نہ تھی اور میرے پاس اتنا وقت بھی کہاں ہے؟ یہ تو بلیک کے پر زور اصرار پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بھلا راسٹر گلڈ بھی

کوئی ایسی جماعت ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کی کمیٹی کا رکن بنے۔ امی لاحول ولا
قوة۔



آپ برانہ مانیں تو دلشکھ صاحب سے ہمدردی کرتے کرتے ہم ایک نتیجہ بھی
نکالتے جائیں کہ اللہ نے آنکھوں والوں کے لئے ہر بات میں عبرت کی نشانیاں رکھی
ہیں۔ وہ یہ کہ بس سنگھ اور سوتنڑ پارٹی قسم کی جماعتیں ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ ہاں نام
مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی پشت پر ملکی اور غیر ملکی سینٹھوں کا روپیہ بھی وافر ہوتا ہے۔
جاگیرداروں کی کمک بھی، اور نعرے بھی ہوتے ہیں۔ غریب امیر کے فرق کو قدرت کا
عطیہ سمجھتے ہیں۔ ایک نہ ایک ڈنڈا پارٹی یا سینوک سنگھ بھی ان کے قبضے میں ہوتا ہے اور
پراپیگنڈے سے طاغوتی کو ملکوتی بنانے کا فن بھی جانتے ہیں لیکن جہاں عوام کے بیدار
معاشرے سے ان کا مقابلہ ہوتا ہے وہاں حاصل جمع پندرہ آنے سے نہیں بڑھتی۔ امی
بھی دلشکھ صاحب کے تین انڈوں کی طرف اشارہ ہے۔



غلط محاورہ سنا اور غریق رحمت ہو گئے!

کتنے طوطے تھے؟ کس رنگ کے تھے؟

ہم لوگوں کے دلوں میں تو خیر بھانت بھانت کی بولیاں سنتے سنتے بڑی سہمی آ گئی ہے اور میرے کو تیرے کو ہم کہتا ہے چھوٹا والا بڑا والا..... سب سن لیتے ہیں..... لیکن بعض بزرگ اس معاملے میں اب بھی تانا شاو ہیں۔ حضرت میر تقی میر کی طرح آدھا بھاڑا دے کر تانگے میں کسی بھلے مانس کے شریک سفر ہو گئے تھے۔ اس نے راستے میں خلوص بگھارنے کے لئے علیک سلیک اور بات چیت کا ڈول ڈالنا چاہا۔ یہ بے مزہ ہو کر بولے کہ ”حضرت۔ سپ بٹھو۔ شریک سفر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم سے بات چیت بھی کریں۔ ہماری زبان خراب ہوتی ہے“..... ایسے لوگ آج کل کم ہیں پھر بھی ایک بزرگ کے متعلق سنا ہے کہ ان کے سامنے کسی کی زبان سے چھاتی پر ماش دلنا یا چنے دلنا نکل گیا جبکہ محاورے میں چھاتی پر صرف مونگ یا کوووں دلنے کا حکم ہے۔ ان بزرگ نے افسوس میں ایک سانس اتنی لمبی کھینچی کہ دم نہ لوٹا۔ بیٹھے بیٹھے غریق رحمت ہو گئے۔ ہاتھ نے کھڑے کھڑے تاریخ کہی..... یا غریق رحمت“۔ ہم نے عدد گنے پورے ۱۹۶۹ء اس میں سے ”شہید محاورہ“ کے عدد نکالے تو ہجری تاریخ ہو جاتی ہے۔ مرنا ہو تو ایسا

ہمارے ایک دوست کہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں ہم سے اکثر آ کر شکایت کرتے ہیں کہ جناب ہم تو گھر میں با محاورہ گفتگو کو ترس گئے ہیں۔ ہماری بیگم ہیں تو اہل زبان مگر تعلیم ان کی سینٹ جوزف اسکول میں ہوئی ہے۔ ایک روز کسی نے دوران گفتگو ان کے سامنے کہہ دیا کہ ”میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔“ یہ اس کو پکڑ کر بیٹھ گئیں کہ کیسے اڑ گئے۔ کتنے طوطے تھے؟ کس رنگ کے تھے؟ پھر مل گئے کہ نہیں؟..... اب ان سوالوں کا جواب خضر کیسے بتائے؟ کیا بتائے؟ ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ ہماری ای بازار سے آئیں اور گرانی کی شکایت کرنے لگیں کہ بازار میں جس چیز کو دیکھو آگ لگ رہی ہے۔ ہماری بیگم کے کانوں میں بھنک پڑی تو چونکیں اور اٹھ کر فارہ ریگید والوں کو فون کر دیا کہ دوڑو..... بازار میں آگ لگ رہی ہے..... پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

بے شک یہ زمانہ زبان و ادب کے معاملے میں کم سوادی کا ہے۔ ہمارے ایک دوست کے پاس میٹرک کے اردو کے پرچے آتے ہیں۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ انہیں جانچتے جاتے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ فلاں فلاں محاوروں کو فقروں میں باندھو۔ مثلاً ”آلو سیدھا کرنا“ لائق طالب علم نے لکھا ”ایک لڑکے کے پاس ایک لاجواب آلو تھا جس کی گردن ٹیڑھی تھی۔ وہ ایک پہلوان کے پاس گیا اور کہا۔ بھاجی میرا آلو سیدھا کر دو۔ اس نے جو زور لگایا تو گردن ٹوٹ گئی اور آلو مر گیا۔“ ایک مہاروہ تھا۔ ”دھوپنی کا کتنا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔“ اسے یوں سلک مضمون میں پرو دیا گیا کہ۔ ”ہمارے دھوپنی کے پاس ایک کتا ہے جو گھر کا نہ گھاٹ کا۔“ ایک اور محاورہ ہے۔ ”کچی گولیاں کھیلنا۔“ اسے ایک عزیز نے ادب کے میدان میں یوں لڑھکایا کہ۔ ”آج صبح صں نے بھائی سے کہا۔ ”آؤ کچی گولیاں کھیلیں“ اس نے کہا جاؤ جاؤ میں کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ بارش ہو گئی تو سب کا ناس ہو جائے گا۔“



ہم مضمون نگاروں کے نام قارئین کی طرف سے روز ہی قیامت کے نامے آیا کرتے ہیں۔ پتہ نشان والے بھی گناہ بھی۔ ان میں کچھ ابے تھے کے ہوتے ہیں، نادک و شنام سے دریدہ۔ بعض محبت سے بھرے چالیں چالیں صفحے کے اور پسندیدہ۔ بلکہ محبت کا شہد بیرنگ لفافے کو پھاڑ کر باہر چلیدو۔ تیسری قسم میں نصیحت نامے۔ ملامت نامے۔ ہدایت نامے آتے ہیں۔ از بزرگان عمر رسیدہ و یا گرگان باران ویدو۔ جب ہم اپنے کالم میں ٹوک دو گر برا کرے کوئی، پر عمل کرتے ہیں تو کسی دوسرے کے ٹوکے کا برا کیوں مانیں۔ ہمارے ایک گناہ مہربان نے ہمیں لکھا ہے کہ آپ بات بات پر دوسروں کی زبان پکڑتے ہیں اور خود غلط محاورے لکھتے ہیں۔ یہ کیا محاورہ ہوا ”جب تک جیوڑا چلے ستر بلاٹے۔“ اصل محاورہ ہے۔ ”ایک داڑھ چلے ستر بلاٹے۔“ ان صاحب نے ہمیں صحیح ٹوکا۔ ہمارا کالم فلم برداشتہ گھسیٹ ہوتی ہے۔ اتنا کسے دماغ کہ لکھ کر پڑھے۔ اُس روز کالم چھپ کر آیا تو ہم بھی حیران ہوئے کہ ”جیوڑا“ کیا؟ غلطی کا تب کی نہ تھی۔ ہمارا ذہن اور قلم ہی رہ پٹ گیا تھا۔ شاید تحت الشعور میں دلی کے جیوڑے تھے جن کا یہ قول شریف ہے۔ بہر حال ہم نے غلط لکھا اور شرمندہ ہیں۔ ”آپ کس چکی کا پسا کھاتے ہیں۔“ بیشک یہ محاورہ کسی کے تن و توش پر چپکایا جاتا ہے ہم نے خاں محمد نقی محمد خاں خورجی کے باب میں (جو دھان پان ہیں) لکھا تو مراد معنی تازہ مدعاست کی تقریب ہے۔ ہم ان کی بابرکت لمبی عمر کی گنہ دریافت کر رہے تھے۔ یہ لغزش نہ تھی، اجتہاد تھا۔

اتنے نادان بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
واعظو پند گرو راہ گزرتو دیکھو

